

ریاستِ سوات

(1915ء تا 1969ء)

ڈاکٹر سلطانِ روم

ترجمہ

پروفیسر احمد فواد



ریاستِ سوات

(1915ءتا1969ء)

ڈاکٹر سلطانِ روم

ترجمہ

پروفیسر احمد فواد

شعیب سنز
پبلشرز اینڈ بک سیلرز
جی ٹی روڈ مینگورہ، سوات

کتاب	ریاستِ سوات (1915ء تا 1969ء)
مصنف	ڈاکٹر سلطانِ روم
مترجم	پروفیسر احمد فواد
ناشر	فضل ربی راہی
ٹائٹل	عبدالرحمٰن نوید
کمپوزنگ	اظہار عالم
پہلی اشاعت	2013ء
مطبع	ندیم یونس پرنٹرز لاہور
قیمت	-/450روپے

SHOAIB SONS PUBLISHERS & BOOKSELLERS
G. T. Road Mingora, Swat (Pakistan) Ph: 0946-729448, 722517
Email: shoaibsons@yahoo.com

اپنے والدین کے نام

فہرستِ مضامین

Click on any of Chapter's Title*

عرضِ مترجم

ڈاکٹر سلطانِ روم کا نام اڑتے اڑتے میرے کانوں تک بھی آ پہنچا۔ ایک خاص فاصلہ تک ایک ہی سمت کے راہی ہونے کے ناطے پبلک ٹرانسپورٹ میں آمنے سامنے یا ساتھ ساتھ بیٹھ کر سفر کرنے کے مواقع بھی شاید ملتے رہے ہوں لیکن اجنبیت کی دیوار نے ایک سرسری سی علیک سلیک سے بات آگے بڑھانے کی ضرورت کا احساس کبھی نہ ہونے دیا۔ درس و تدریس کے ایک ہی پیشہ سے منسلک ہونے کی وجہ سے ایک قسم کی اُنسیت کا پیدا ہونا بھی یقیناً اَمر محال نہ تھا لیکن یہ جان کر تب مجھے ایک قلبی مسرت ملی کہ ہم دونوں مختلف اوقات میں ایک ہی مادرِ علمی (جامعہ کراچی) کے سایۂ عاطفت میں پروان چڑھے ہیں بلکہ ایک ہی شعبہ اور یکساں اساتذہ کی رہنمائی سے مستفیض ہوتے رہے ہیں لیکن ان باتوں کا بھی علم ان کی کتاب ''ریاست سوات'' ہاتھوں میں آنے کے بعد ہوا۔

جامعۂ کراچی کے شعبۂ تاریخ کا تیس پینتیس سال پرانا نقشہ ذہن میں گھوم گیا۔ ڈاکٹر ریاض الاسلام، پروفیسر عبدالرحمٰن، ڈاکٹر طاہرہ آفتاب کے چہرے یادوں کے اُفق پر مہرِ تاباں بن کر جگ مگائے۔ سونا مائی رستم جی جو اردو پڑھنا نہیں جانتی تھیں، اس لئے مجھ سے میرے ہم جماعتوں کے پیپر پڑھوا کر انھیں نمبر دیتی تھیں۔ ان سایہ دار پیڑوں کی مہربان چھاؤں نے شب و روز کی جھلستی پیشانی پر اپنی ٹھنڈی انگلیاں رکھ دیں۔ ذہن اُن ایام کی بھول بھلیوں میں گم ہو گیا۔ تاریخ کی کتابیں پڑھنے کا شوق تو لڑکپن سے تھا لیکن مجھے اصل عشق تو شعر و ادب سے تھا اس لئے وسطِ سفر میں پٹڑی بدل کر انگریزی ادبیات میں ماسٹر کیا۔ پر شعبۂ تاریخ سے اپنائیت کا رشتہ برقرار رہا۔ پروفیسر عبدالرحمٰن کی یہ بات ''بھئی تم یونی ورسٹی میں کہیں نظر آجاؤ تو میں تمہاری حاضری لگا دیتا ہوں'' آج بھی نہیں بھولی۔

یادوں کی کتاب کی ورق گردانی دراصل عمرِ عزیز کے کھوئے ہوئے خزینے کو واپس پانے کی خواہش کے سوا کچھ نہیں۔ ناممکن کو ممکن بنانے کی یہ کوشش کسی نہ کسی حد تک سرور انگیز تو ضرور ہوتی ہے۔ کچھ دیر کے لئے کامرانی کا احساس رگ و پے میں دوڑ کر سرشار کر دیتا ہے۔ لگتا ہے کھوئے ہوئے رات دن لوٹ آئے ہیں۔ میں بھی کچھ دنوں تک اُس دور کی بے فکری و بے اختیاری کے اختیار میں رہا۔ اس رو میں اس کتاب کو پڑھتا چلا گیا۔ شاید اس دوران

پہلی بار یہ خیال آیا ہو کہ اس کتاب کے دروازے اُس وسیع اردو دان طبقہ کے لئے بھی کھول دینے چاہئیں جو شوق و ذوق رکھنے کے باوجود انگریزی میں استعداد کی کمی کی وجہ سے اس کتاب کی پُر لطف مصاحبت سے ابھی تک محروم ہے۔ پھر اپنے بہت سے شستہ ذوق رکھنے والے دوستوں کو اس بات پر رنجیدہ دیکھ کر اُن کی مشکل کو آسان کرنے کی ٹھان ہی لی۔

یہ وادیٔ سوات جس کے حُسن کا چرچا زبان زدِ خاص و عام رہا ہے، نہ جانے کب سے اور کہاں کہاں سے مشتاقانِ دید و تشنگانِ جمال یہاں دیدہ و دل کی سیرابی کی غرض سے آتے رہے ہیں۔ آج جس کا حال پاکستان کا مستقبل بچانے کے لئے خونم خون ہے اور ایک مجرمانہ ابہام میں ملفوف ہے لیکن اس کے ماضی کے بارے میں انتہائی عرق ریزی اور دقتِ نظر سے کام لے کر بنائی گئی اس سچی تصویر تک آسان رسائی یقیناً اس وادی کے دل زدہ باشندوں کے ساتھ ساتھ سب اہلِ وطن کا حق ہے۔ اور باتوں کے علاوہ شاید اس بات نے بھی مجھے ترجمہ کی اس وادیٔ پُر خار میں قدم رکھنے پر آمادہ کیا۔ معلوم تھا کہ یہ جان جوکھوں کا کام ہے۔ اس بھاری پتھر کو جب اٹھایا تو کئی بار چوم کر واپس اُسی جگہ رکھنے کی صدا نہاں خانۂ دل سے اٹھی لیکن دوست واحباب کے مسلسل استفسار سے 'کہاں پہنچے'، 'کتنا کام رہ گیا' اور 'کتنا انتظار کرنا ہوگا' نے حوصلہ ٹوٹنے نہ دیا۔ حالاں کہ اس دوران ہماری دربدری کا عذاب جاری تھا، اور امن و سکون کی منزل بھی کوسوں دور تھی، جو ایسے کام سرانجام دینے کے لئے لازم ہے۔ جب ترجمہ مکمل ہوا، تو کمپوزنگ کا ایک طویل صبر آزما مرحلہ شروع ہوا۔ جس سے پسینے چھوٹ گئے۔ خدا خدا کر کے یہ منزل بھی آ ہی گئی۔

حُسنِ اتفاق سے سلطانِ روم کا تبادلہ بھی اُسی کالج میں ہوگیا تھا جہاں میں پڑھاتا ہوں۔ جس سے باہمی مشاورت کا عمل آسان ہوگیا۔ انہوں نے تحقیق و تصنیف کی اپنی دیگر مصروفیات کو معطّل کر کے پُروف پڑھنے میں مدد کے علاوہ نامانوس ناموں کی صحیح ادائیگی اور مبہم مقامات کی وضاحت و صراحت کے لئے وقت نکالا۔ جس کے لئے میں اُن کا مشکور ہوں۔

ترجمہ کے اس لمبے سفر میں حقِ رفاقت اگر کسی شخص نے صحیح معنوں میں ادا کیا تو وہ جناب شان الحق حقّی مرحوم ہیں، جن کی اوکسفرڈ انگریزی اُردو ڈکشنری نے پیشانی پر بل ڈالے بغیر ہر سوال کا بروقت جواب دے کر اس مشکل راستہ کے سفر کو آسان بنادیا۔

اس کتاب کے حُسن و قبح پر رائے زنی میرے لئے تضیعِ وقت کے زمرے میں آئے گی۔ پشتو زبان کی ایک مشہور کہاوت ہے "چہ خُم اِ غمے دے نو سہ م کے دے"، یعنی ہیرے جیسی صورت کے ہوتے مجھے کس بات کی کمی؟ البتہ اس کتاب کو اردو ترجمہ میں پڑھنے والوں کو میں یہ بتانا ضروری گردانتا ہوں کہ اس کتاب کی تکمیل، تحقیق و جستجو انتہائی دقیق مشکل راہوں سے گذر کر ہوئی ہے۔ مصنف نے حقائق جاننے کے لئے کئی برسوں تک مسلسل تگ و دو کی ہے۔

کوئی بات بغیر کسی مستند حوالہ کے نہیں کی ہے۔ ریسرچ کے کسی وقیع کام کے لئے متعین حدود و قیود کا پوری طرح سے خیال رکھا ہے۔ اس لئے فصل در فصل کتابیات وحوالہ جات کی تفصیل دی گئی ہے۔ میں نے ان کی اجازت سے عام قاری کی سہولت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہر باب کے بعد دی گئی اُس تفصیل کو نظر انداز کر کے صرف اُن اندراجات کے ترجمہ تک خود کو محدود رکھا ہے، جن میں کوئی نئی بات یا کسی بات کی مزید صراحت کی گئی ہو۔ تحقیق کی راہ پر گامزن قاری اصل انگریزی کتاب میں اُس پوری تفصیل کو پڑھ سکتے ہیں۔ جو ہر باب کے آخر میں حوالہ جات کی صورت میں موجود ہے۔ بعض صورت میں یہ سینکڑوں اندراجات پر مشتمل ہے۔ اصل کتاب کے آخر میں مأخذ کی جو تفصیل درج ہے، اُسے البتہ اس اردو ترجمہ میں بھی برقرار رکھا گیا ہے۔

پروفیسر احمد فواد

اعتراف

اس کتاب کی بنیاد میرا پی ایچ ڈی کا مقالہ بہ عنوان 'سوات سٹیٹ انڈر دی والیز (69-1917ء)' ہے جسے یونی ورسٹی آف پشاور کے شعبۂ تاریخ میں پیش کیا گیا تھا۔ حالاں کہ مجھے تاریخ سے کوئی زیادہ رغبت نہیں تھی لیکن جامعۂ کراچی میں جنرل ہسٹری ڈیپارٹمنٹ کے میرے اساتذہ کرام، خصوصاً پروفیسر سید عبدالرحمٰن، ڈاکٹر طاہرہ آفتاب اور ڈاکٹر خواجہ غلام اصغر نے اس سے دل چسپی پیدا کرنے میں میری مدد کی۔ ان کی توجہ اور حوصلہ افزائی نے تحقیقی کام کے لئے میری صلاحیت اور محبت کو جلا بخشی۔ سید عبدالرحمٰن نے تحقیق سے میری دل چسپی کا رُخ سوات اور ریاست سوات کی تاریخ اور وہاں کے لوگوں اور اُس علاقہ کے حالات کے بارے میں پوچھ پوچھ کر اس کی جانب موڑ دیا۔ 1987ء میں انہوں نے جامعۂ کراچی کے جنرل ہسٹری ڈیپارٹمنٹ کے میگزین 'پاسٹ اینڈ پریزنٹ' کے لئے ریاستِ سوات کے بارے میں مضمون لکھنے کے لیے کہا۔ میگزین تو اُس سال شائع نہ ہوسکا لیکن اُس کے لئے لکھا گیا مضمون میرے پی ایچ ڈی کے مقالے کا پیش رو ثابت ہوا۔ اُسی وقت سے میں نے اس موضوع پر اپنی تحقیق کو جاری رکھا اور اس پر کئی تحقیقی مضامین شائع کئے۔ موجودہ کتاب 1987ء کے بعد سے اس ضمن میں میری مسلسل تحقیق کا نتیجہ ہے اور یہ دراصل اُسی غیر مطبوعہ مضمون کی مکمل اور مفصل شکل ہے۔ تحقیق ہمیشہ سے ہی ایک دقّت طلب کام ہے اور خصوصاً اگر موضوع کا تعلق اپنے علاقہ اور ماضی قریب کے واقعات سے ہو۔ اس میں اگر چہ محقق اس لحاظ سے فائدہ میں رہتا ہے کہ موضوع سے متعلق اُس کا علم اور فہم نسبتاً بہت بہتر ہوتا ہے لیکن اس لحاظ سے اس کی مشکلات بڑھ جاتی ہیں کہ موضوع سے متعلق بعض کردار ابھی موجود ہوتے ہیں جن کی رائے اور نقطۂ نظر اُس سے مختلف ہوسکتا ہے۔

میں نے ممکنہ حد تک دیانت داری اور غیر جانب داری سے کام لیا ہے اور اس تحقیق کی سچائی پر کسی کو اثر انداز ہونے سے روکنے کے لئے خود کو ہمہ وقت چوکس رکھا ہے۔

میں جانتا ہوں کہ سابقہ حکمرانوں اور ریاست کے حامیوں اور مخالفین میں سے بعض لوگ اس تحقیقی مطالعہ سے بالعموم خوش نہیں ہوں گے، لیکن میں نے کسی خاص فرد، گروہ یا نقطۂ نظر کی ترجمانی وحمایت کی جگہ خود کو ایک محقق

کے لئے مقرر اصول وضوابط پر سختی سے کاربند رہنے کوترجیح دی ہے۔اس کتاب کا مقصد کسی کو ہیرو بنا کر اور کسی کو پرلے درجہ کا بدمعاش بنا کر پیش کرنا ہرگز نہیں ہے۔شکر ہے کہ خوف اور لالچ اس مشکل کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے درکار ایمان داری اور دیانت کو گزند پہنچانے میں کامیاب نہیں ہوئے اور میری برسوں کی کاوشوں نے بالآخر اس کتاب کا روپ دھارلیا ہے۔

اکبرعلی (انچارج، ڈسٹرکٹ ریکارڈ روم، گل کدہ ،سوات)، سیف الرحمٰن (لائبریرین، ڈیپارٹمنٹ آف ہسٹری، یونی ورسٹی آف پشاور)، ناہید جہاں (لائبریرین،لیاقت میموریل لائبریری،کراچی)،تنویرسجاد (لائبریرین، ڈیپارٹمنٹ آف آرکیالوجی، گورنمنٹ آف پاکستان،کراچی)، مقرب خان اور اکرم خان مروت (ڈائریکٹریٹ آف آرکائیوز اینڈ لائبریریز، پشاور)، رستم علی قزلباش اورعرفان اللہ خان (ریسرچ افیسرز،ٹرائبل افیئرز ریسرچ سیل، پشاور)،عبدالحمید (لائبریرین،اسلامیہ کالج، پشاور)، شاہ مراد خان (چیف لائبریرین، ڈائریکٹریٹ آف آرکائیوز اینڈ لائبریریز، پشاور)، نصراللہ خان (لائبریرین، پاکستان سٹڈی سنٹر، یونی ورسٹی آف پشاور)، محمد سیال (لائبریرین، ڈیپارٹمنٹ آف آرکیالوجی، یونی ورسٹی آف پشاور)، سرفراز خان مروت (لائبریرین، پشتو اکیڈمی، یونی ورسٹی آف پشاور)، تاجونو (انچارج، ڈسٹرکٹ مال خانہ،سیدوشریف،سوات)اوران مقامات پر موجود دیگر عملہ، اسی طرح نیشنل ڈکومینٹیشن سینٹر اسلام آباد کے عملہ، سنٹرل لائبریری (یونی ورسٹی آف پشاور)، لائبریری آف دی ڈیپارٹمنٹ آف سوشیالوجی (یونی ورسٹی آف پشاور)، نیشنل میوزیم لائبریری (کراچی)، ڈاکٹرمحمود حسین لائبریری (یونی ورسٹی آف کراچی)اور لائبریری سروسز اکیڈمی (پشاور) کے اسٹاف نے میرے اس تحقیقی کام کے دوران مجھ سے بھرپور تعاون کیا۔

بہت سے لوگوں نے اس کام میں دل چسپی لی اور اس مطالعہ کے سلسلہ میں اپنی مدد فراہم کی۔ان میں جنرل ہسٹری ڈیپارٹمنٹ، کراچی یونی ورسٹی کے میرے اساتذہ کرام پروفیسر سید عبدالرحمٰن، پروفیسر ڈاکٹر طاہرہ آفتاب، پروفیسر ڈاکٹر غلام اصغر، خانہ فرہنگ ایران پشاور کے میرے استاد سید غیور حسین، پروفیسر سیف اللہ خان (مینگورہ، سوات)، شمشاد خان، حیات خان اور محمد نواز خان (شعبہ تاریخ، پشاور یونی ورسٹی)، پروفیسر لیاقت الرحمٰن (ایبٹ آباد)، بہروز خان (بلوخان ، بونیر)، پروفیسر میاں نورنواب (کانجو،سوات)، پروفیسر بخت جہان (چار باغ، سوات)، پروفیسر ڈاکٹر فخر الاسلام (پشاور)، سیف اللہ خان (اوڈی گرام،سوات)، نجیب الرحمٰن (منہ ،سوات)، پروفیسر سلطان عالم (ڈیڈہ ور،سوات)، منظور احمد (سمبٹ چم،سوات)، پروفیسر شہاب الدین (اشاڑے،سوات)، پروفیسر ایلین ویارو (جنیوا)، پروفیسر فضل معبود (اسلام پور،سوات)، یاسر خان (علی گرامہ،سوات)، محمد سلیم (اسلام پور،سوات)، سیف اللہ (اسلام پور،سوات)، اختر ایوب ایڈووکیٹ (کالج کالونی،سیدوشریف،سوات) پروفیسر

ڈاکٹر اے زیڈ ہلالی (پشاور)، ڈاکٹر راج ولی شاہ خٹک (پشاور)، بہادر خان المعروف بہادر (ہزارہ، سوات)، دلاور جان المعروف واڑہ خان (ہزارہ، سوات)، محمد جاوید المعروف جاوید (ہزارہ، سوات)، فرمان علی المعروف فرمان (ہزارہ، سوات)، آفتاب علی (ہزارہ، سوات)، نوشیروان خان ایڈووکیٹ (کوٹہ، سوات)، بہادر خان (فتح پور، سوات) اور فضل معبود المعروف بابو (سیدو شریف، سوات) شامل ہیں۔

میری اس تحقیق کے لئے مقرر نگران کمیٹی کے ارکان پروفیسر ڈاکٹر غلام تقی بنگش، پروفیسر ڈاکٹر فضل الرحیم مروت اور پروفیسر ڈاکٹر سید منہاج الحسن اور اسی طرح پروفیسر ڈاکٹر لعل بہا (پشاور)، پروفیسر ڈاکٹر انصار زاہد خان (کراچی) اور پروفیسر ڈاکٹر محمد فاروق سواتی (پشاور) نے بہت تعاون کیا اور کئی نکات پر اپنی معلومات سے مستفیض ہونے کا موقع دیا۔

عبدالحلیم ایڈووکیٹ (غالیگے، سوات)، شاہ سلم خان ایڈووکیٹ (گل کدہ، سوات)، سرجن محمد عثمان ایف آر سی ایس (سیدو شریف، سوات)، پروفیسر انور علی شاہ (دمغار، سوات) اور پروفیسر خورشید (ہزارہ، سوات) نے اس کام میں دل چسپی لی اور معاونت کی۔ مسودہ کے سلسلہ میں ان کی مفصل گفت گو اور تنقیدی جانچ پرکھ اور ان کے بیش بہا مشورے بے حد کار آمد رہے۔ اس نے یقیناً اس منزل دشوار کی راہ ہم وار کی۔

پروفیسر عبدالوہاب خان (رونڑیال، سوات) اور ماہر تعمیرات شوکت علی شرار (سپل بانڈئی، سوات) کا میں بہ طور خاص ذکر کرنا چاہوں گا اس لئے کہ انہوں نے صرف اس کام میں دل چسپی ہی نہیں لی بلکہ اس ضمن میں متعلقہ لوگوں سے بالمشافہ گفت گو کے انتظامات کئے، نفس مضمون پر سیر حاصل بات کی اور اس مسودہ کی جانچ پرکھ میں بھر پور حصہ لیا بلکہ اگر یہ کہوں کہ یہ دونوں میرے لئے اس راہ کی مشکلات سے نبرد آزمائی کے لئے درکار قوت اور حوصلہ پانے کا ایک نہ ختم ہونے والا ذریعہ ثابت ہوئے تو غلط نہیں ہوگا۔ اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں یقیناً ان کی مدد نے بہت آسانی پیدا کی۔

میرے بڑے بھائیوں عالم زیب باچا اور سلطان محمود کی مسلسل اعانت کے بغیر میری اس کاوش کو شاید دن کی روشنی دیکھنی نصیب نہ ہوتی۔ دورانِ تعلیم اور میری تحقیقی مصروفیات کے دوران ان کا دستِ تعاون مجھے حاصل رہا اور ان کی حوصلہ افزائی میرے لئے مہمیز کا کام کرتی رہی۔ ان کے بیٹوں انعام اللہ، احسان اللہ، رفیع اللہ، سمیع اللہ، عرفان اللہ، عبیداللہ اور عبداللہ نے بھی اس مطالعہ کے دوران میری بڑی مدد کی۔ میری بہنوں نے بھی میرے اس کام میں دل چسپی لی اور والہانہ انداز سے اس کی تکمیل کی خواہش مند رہیں۔ اپنی اہلیہ کے لئے اپنی ممنونیت کا میں بہ طورِ خاص ذکر کروں گا جس نے میری اس تحقیقی مصروفیات کی وجہ سے میری بہت سی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھائے رکھا۔ اسی طرح میرے بچے بھی میرے شکریہ کے مستحق ہیں۔ یقیناً یہ سب اس تحقیق کے لئے میری غیر موجودگی کی وجہ سے متأثر

ہوئے۔

اُن تمام افراد کے لئے بھی میرا دل احسان مندی کے جذبات سے پُر ہے جنہوں نے اس کام میں دل چسپی لی اور کسی بھی قسم کی مدد فراہم کی لیکن غیر ارادی طور پر میں نے یہاں اُن کا ذکر نہیں کیا ہے۔ اسی طرح اُن تمام افراد کا بھی میں شکر گزار ہوں جنہوں نے بالمشافہ گفت گو کا موقع فراہم کر کے اپنی گراں قدر معلومات، بصیرت اور آراء سے اس تحقیقی کام کو معروضی اور وقیع بنانے میں حصہ لیا۔ اس کام کا سارا مالی بوجھ میں نے خود ہی اٹھایا ہے۔

اس مطالعہ کے کچھ حصے مندرجہ ذیل رسائل و جرائد میں مصنف کے چھپنے والے مضامین میں شائع ہو چکے ہیں:

جرنل آف دی پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، کراچی، ہمدرد اسلامیکس، کراچی، جرنل آف دی ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان، لاہور، ورکنگ پیپر بعنوان فارسٹری ان دی پرنسلی اسٹیٹ آف سوات اینڈ کالام (نارتھ۔ویسٹ پاکستان) اے ہسٹاریکل پرسپیکٹو آن نارمز اینڈ پریکٹسیز (زیورخ: سوِس نیشنل سینٹر آف کمپیٹنس ان ریسرچ (NCCR) نارتھ ساؤتھ، 2005)۔

تعارف

مشہور زمانہ وادئ سوات جسے اپنی خوب صورتی کی وجہ سے ایشیاء کا سوئٹزر لینڈ کہا جاتا ہے، جغرافیائی لحاظ سے اُس علاقہ کا ایک کلیدی اور اہم حصہ ہے جہاں برّاعظم ایشیا کے تین اہم خطے جنوبی ایشیاء، وسطی ایشیاء اور چین ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ تاریخی طور پر اس کی امتیازی حیثیت ہمیشہ سے برقرار رہی ہے۔ تہذیب و تمدن کا گہوارہ ہونے کے ساتھ ساتھ مختلف اوقات میں یہ کئی خوفناک افواج کی مہم جوئی کا نشانہ بنتا رہا ہے۔

ہر طرف موجود تاریخی اور ثقافتی آثار اس بات پر گواہ ہیں کہ کم از کم گزشتہ پانچ ہزار سال سے یہاں بھرپور انسانی موجودگی رہی ہے جس کی وجہ سے محققین اور مؤرخین کو اس کی تاریخ، آثارِ قدیمہ، فنون، فنِ تعمیر، سماجی نظام، طرز حکومت غرض زندگی کی ہر جہت کا مطالعہ کرنے کی شہہ ملتی رہی ہے۔ حالیہ برسوں میں تحریک نفاذِ شریعت محمدیؐ کے جھنڈے تلے شروع ہونے والی مسلّح جدوجہد بھی اس بات کی غماز ہے کہ یہ علاقہ اور یہاں کے لوگ اپنے اردگرد سے خاصے مختلف ہیں۔

جب پاکستان اگست 1947ء میں معرض وجود میں آیا تو برصغیر کے مسلم اکثریت والے علاقے اس میں شامل کئے گئے۔ چونکہ ان مختلف علاقوں میں آباد لوگوں کا معاشرتی ارتقاء اپنی اپنی مقامی ثقافت، زبان، سماجی رویہ، لوک ورثہ اور تاریخی پس منظر کی حدود میں رہ کر ہوا، اس لئے تقسیم سے پہلے اور بعد کے دونوں ادوار میں سیاسی شعور و سیاسی مسائل کے بارے میں ردِّعمل، تعلیم اور معاشرتی ترقی کے لحاظ سے یہ سب ایک دوسرے سے مختلف رہے ہیں۔ یہ ساری علاقائی اکائیاں مل کے مختلف النوع سماجی ساخت والے اس ملک کے معاشرہ کی تعمیر کرتی ہیں۔ در حقیقت پاکستان کی تاریخ اور سیاست کو اُس وقت تک کوئی نہیں سمجھ سکتا جب تک ان مختلف علاقوں کے تاریخی ارتقاء کو نہ سمجھ لے۔ اس لحاظ سے بھی اگر دیکھیں تو محلِ وقوع کی تزویری اہمیت اور سیاسی ارتقاء کے علاوہ شاہراہِ ترقی پر اس کے مسلسل سفر اور اپنی بےنظیر خارجی اور داخلی پالیسیوں کی وجہ سے ریاستِ سوات کی بہت اہم اور مایہ ناز حیثیت ہے۔

سولہویں صدی کے پہلے نصف میں افغان یوسف زئی قبائل کے قبضہ کے بعد سوات کبھی بھی غیر ملکی تسلط میں نہیں رہا لیکن یہ لوگ اپنے قبائلی طرز بود و باش کی وجہ سے یہاں کوئی ریاست یا مستحکم حکومت قائم کرنے میں ناکام رہے۔ پھر بھی پشاور اور سوات کے آس پاس کے میدانی علاقوں پر انگریزوں کے قبضہ اور 1849ء میں پنجاب کے انگریز سلطنت میں الحاق نے سوات کے باشندوں کو بھی خوف میں مبتلا کر دیا۔ اپنی آزادی کی ہر صورت حفاظت کے لئے انہوں نے ستھانہ کے سید اکبر شاہ کو یہاں کی بادشاہی سونپ دی۔ اپنی وفات تک (11 مئی 1857ء) وہ سوات کے حکمران رہے۔ اتفاق سے ان کے وفات کے دن ہی انگریز کے خلاف بپا ہونے والی جنگ آزادی کی خبر پشاور پہنچی جسے انگریز غدر کہتے ہیں۔ اُن کے بعد اُن کا بیٹا مبارک شاہ خواہش و کوشش کے باوجود اُس وقت کی ایک انتہائی اہم مذہبی حیثیت والی شخصیت اخوند عبدالغفور المعروف بہ سیدو بابا کی وجہ سے طاقت کے حصول میں ناکام رہا۔ اگر چہ اس دُنیوی منصب کا حصول اخوند صاحب کے لئے ذاتی طور پر ممکن نہیں تھا لیکن انہوں نے اپنے بڑے بیٹے میاں گل عبدالحنان کے لئے 1871ء اور 1875ء میں دو بار کوشش کی کہ یہ منصب اُسے مل جائے لیکن ناکام رہے۔ میاں گل عبدالحنان ایک جاہ پرست آدمی تھے۔ وہ زندگی بھر سوات کی حکمرانی کے حصول کے لئے کوشاں رہے۔ باپ کی موت کے بعد بھی یہ خواب، خواب ہی رہا۔ وہ اور ان کے بھائی میاں گل عبدالخالق بالترتیب 1887ء اور 1892ء میں وفات پا گئے۔ دونوں کے دو دو بیٹے تھے۔

1877ء کے بعد وادئ سوات میں سازشوں اور گروہی تنازعات کا ایک بازار گرم رہا۔ خان آف دیر، میاں گل عبدالحنان، شیر دل خان آف الہ ڈنڈ، عمرا خان آف جندول اپنے اپنے مفادات کے لئے باہم دست و گریباں رہے۔ 1879ء میں خان آف دیر نے دریائے سوات کے دائیں کنارے کے کچھ علاقہ پر قبضہ کرلیا اور 1881ء کے اختتام تک وہ پورا علاقہ اُس کے زیر تسلط آ گیا۔ اپنا ہی بیٹا اور خان آف جندول اگر اُس کے لئے مشکلات پیدا نہ کرتے تو وہ یقیناً مزید علاقوں پر قابض ہونے کی یہ مہم جاری رکھتا۔ اُدھر امیر افغانستان کا سوات پر حکمرانی کا اپنا دعویٰ تھا اور 1888ء میں برطانیہ بھی اپنے مفادات کی حفاظت کے لئے اس علاقہ پر ایک قسم کی گرفت رکھنے کی جدوجہد میں شامل ہو گیا۔ قسمت نے مختلف اوقات میں مختلف دعویداروں کا ساتھ دیا۔ انگریزوں نے 1893ء میں ڈیورنڈ لائن معاہدہ کر کے اس علاقہ میں اپنی پوزیشن مستحکم کر لی۔ 1895ء میں عمرا خان آف جندول کے زوال کے بعد انگریزوں نے شریف خان کو خان آف دیر کی حیثیت پر بحال کیا۔ دریائے سوات کے دائیں کنارے پر اُس کے قبضہ کو تسلیم کیا اور بالآخر 1897ء میں اُسے نواب آف دیر مان لیا۔

اس سال سیدو بابا کے چاروں پوتے بھی اقتدار کی اس جنگ میں شامل ہو گئے۔ چونکہ ان میں سے ہر ایک اپنی ذاتی طاقت اور حیثیت کو مستحکم کرنے کے لائحہ عمل پر عمل پیرا تھا جس کی وجہ سے یہ خاندان اندرونی سازشوں کا شکار

ہو گیا۔ نتیجتاً عبدالحنان کے دونوں بیٹے عبدالرزاق اور عبدالواحد اپنے چچا زاد بھائی میاں گل عبدالودود کے ہاتھوں بالترتیب 1903ء اور 1907ء میں مار ڈالے گئے۔ عبدالودود نے ایک طرف اپنے سگے بھائی شیرین جان کے مقابلہ میں اپنی پوزیشن مضبوط کرنے کی کوششیں جاری رکھیں۔

دوسری طرف ابتداء سے ہی انگریزوں سے بھی ان کی طرح طرح کی خدمات بجالا کر دوستانہ تعلقات قائم کر لئے۔ تاجِ برطانیہ کی سرپرستی میں نواب دیر کی حیثیت اور اقتدار اپنے علاقہ میں محفوظ تھا لیکن دریائے سوات کے دائیں کنارے کے باشندوں کے ساتھ اُس کی ان بن جاری رہی۔ یہاں اُس کے قبضہ کو مسلسل خطرات کا سامنا تھا کہ تنازعات اور ڈلہ (دھڑا) نظام نے، جس پر یہاں کی سماجی تنظیم کی بنیاد قائم رہی ہے، ایک قسم کی بے چینی کو جنم دیا۔ نواب دیر کی مسلسل دراندازیوں اور گروہی جھگڑوں سے تنگ آ کر سوات بالا کے باشندوں نے بھی برطانوی حکومت سے استدعا کی کہ وہ سوات زیریں کی طرح ان کے علاقہ کو بھی اپنی حفاظت میں لے لے، جسے 1895ء میں چترال مہم کے بعد یہ حیثیت دے دی گئی تھی۔ وہ مختلف افراد سے بھی یہ حکومت سنبھالنے کی ناکام درخواستیں کرتے رہے۔

دیر کے محصول حکام کی زیادتیوں اور نواب کے ظالمانہ و جابرانہ انداز نے لوگوں کو اتنا ناراض کر دیا کہ 1907ء میں انہوں نے عشر کی ادائیگی روک دی اور مزید اطاعت کرنے سے بھی انکار کر دیا۔ اس کی فوری وجہ سوات میں بااثر ڈلوں (دھڑوں) کی قوتِ اقتدار میں تبدیلی بھی تھی۔ نواب نے یہ جاننے کے بعد کہ حکومت برطانیہ مداخلت نہیں کرے گی، 11-1910ء میں انتہائی دلیرانہ انداز میں سوات بالا پر حملہ کر کے وہاں اپنی کھوئی ہوئی طاقت بحال کر دی۔

لیکن اس حکومت کو عوامی پذیرائی حاصل نہیں تھی۔ اس لئے 1914ء میں دوبارہ یہاں کے لوگوں نے ایک حکمران نامزد کر کے اپنی الگ ریاست قائم کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے ستھانہ کے عبدالجبار شاہ کے پاس ایک جرگہ بھیج کر اُسے حکمرانی کی دعوت دی۔ وہ اس نے قبول کر لی اور سوات کی طرف روانہ ہوا لیکن برطانوی حکام نے اُسے راستہ میں روک کر سوات کی علیحدہ ریاست کے قیام کی کوششیں ناکام بنا دیں۔

فروری 1915ء میں شامیزی، سیبوجنی، اور نیکپی خیل اقوام نے سنڈاکئی بابا کی قیادت میں نواب کے قبضہ کے خلاف بغاوت کر دی۔ نواب کی فوج کو مختلف مقابلوں میں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اس طرح ان علاقوں پر اس کے تسلط کا خاتمہ ہو گیا۔

نواب دیر کی از سرنو ان علاقوں پر قبضہ کی کوششوں کا سدِ باب کرنے کے لئے اور اپنی ایک مرکزی حکومت کے قیام کی خاطر ان لوگوں نے اس بار میاں گل عبدالودود اور اُس کے بھائی شیرین جان کو ایک روحانی خاندان سے تعلق رکھنے کی وجہ سے حکمرانی کی دعوت دی۔ وہ اس پیشکش کو قبول کرنے سے ہچکچا رہے تھے۔ ایک منظم حکومت کو موثر انداز

میں لانے کے لیے درکار علم وتجربہ کی عدم موجودگی کا احساس اُن کے آڑے آ رہا تھا۔ جرگہ نے ایک بار پھر عبدالجبار شاہ کو دعوت دی جو اس بار برطانوی حکام کی رضامندی سے اُس نے قبول کر لی۔ اس طرح اُسے سوات کا بادشاہ بنا دیا گیا۔ اُس نے ایک حکومت کی تشکیل کی اور بنیادی انتظامی مشینری قائم کر کے اُس نے ریاست کے معاملات چلانے شروع کر دیئے۔

عبدالجبار شاہ کو اس طرح کامیابی سے حکومت کرتا دیکھ کر عبدالودود نے فوراً بھانپ لیا کہ اُس کے سارے خدشات بے بنیاد تھے۔ حکومت کرنا اتنا مشکل ہرگز نہیں کہ آدمی ایسی پیشکش کو رد کر دے۔ اس لئے اس کے بعد اُس نے عبدالجبار شاہ کی حکومت ختم کر کے اُس کی جگہ اپنی حکومت قائم کرنے کے جتن شروع کر دیئے۔ کچھ دیگر عوامل کی وجہ سے بھی عبدالجبار شاہ کی پوزیشن کو جو پہلے ہی خاصی کمزور تھی مزید نقصان ہوا۔ ان میں اہم ترین بات سنڈاکئی بابا کے ہاتھوں میں اصل اختیارات کا ہونا تھا جو اَب کھل کر انگریزوں کی مخالفت کر رہے تھے۔ انگریز اس وقت اس بات کے خواہش مند تھے کہ سنڈاکئی بابا کی جگہ اختیارات ایسے شخص کے ہاتھ میں ہوں جو اُن سے عداوت نہ رکھتا ہو۔ اس لئے کہ اس وقت جنگ عظیم اوّل کا آغاز ہو چکا تھا اور سوات، افغانستان اور روس کی سرحدوں سے قربت کی وجہ سے جنگی حکمت عملی کے نقطۂ نظر سے بے حد اہمیت کی حامل جگہ تھی۔ بہت سے ہندوستانی انقلابی رہنماؤں نے انگریز مخالف سرگرمیوں کے لئے افغانستان میں پناہ لے رکھی تھی۔

— سوات پر حکمرانی کے ایک متوقع امیدوار کی حیثیت سے عبدالودود کو کچھ بااثر سیاسی قائدین نیز سنڈاکئی بابا کی حمایت اور چیف کمشنر این ڈبلیو ایف پی کی خفیہ رضامندی حاصل تھی۔ بالآخر ستمبر 1917ء میں سنڈاکئی بابا اور جرگہ نے عبدالجبار شاہ کو تخت سے دستبردار ہو کر سوات سے نکل جانے کا مطالبہ کر دیا۔ ایک بار پھر عبدالودود کو تخت نشین ہونے کے لئے کہا گیا اور نیکپی خیل کے مقام کبل میں ایک بڑے مقامی جرگہ نے اُس کے سر پہ شاہی دستار باندھنے کی باقاعدہ رسم ادا کی۔

عبدالودود بہت ہی باصلاحیت شخص ثابت ہوا۔ اُس کی تاج پوشی ریاست سوات میں توسیع، استحکام اور ترقی کا نقطۂ آغاز ثابت ہوئی۔ بیرونی دشمن پسپا ہو گئے اور اندرونی دشمن یا تو قابو کر لئے گئے یا منظر سے ہٹا دیئے گئے۔ وادئ سوات کے اندر اور باہر ریاست کی سرحدوں میں توسیع کا عمل شروع ہوا جسے کہیں کہیں انگریزوں کی مخالفت کی وجہ سے روکنا پڑا۔ بیرونی اور اندرونی مسائل کے باوجود وہ ریاست پر کامیابی سے حکمرانی کرتے رہے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ایک اَن پڑھ قبائلی معاشرہ میں کامیاب حکومتی نظم ونسق ایک اَن پڑھ لیکن روشن خیال شخص کے ذریعہ قائم ہوا۔

میاں گل جہان زیب نے والئی سوات کی حیثیت سے 12 دسمبر 1949ء کو اُس وقت ریاست کی باگ ڈور سنبھالی جب باپ نے خود ہی دستبردار ہو کر تاج وتخت بیٹے کے حوالے کر دیئے۔ اس سے اس کا مغربی طرز زندگی اور

وہاں کی ترقی کا دلدادہ ہونے کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ ریاست اور معاشرہ کو جدید خطوط پر ڈھالنے کا عمل تیز ہوا بلکہ انہوں نے ریاست کو ارادتاً سیکولر اور مغربی رنگ میں رنگنے کی کوشش کی۔ البتہ پہلے سے موجود روایتی سرکردہ قیادت اور مراعات یافتہ طبقہ کے اثر ورسوخ اور طاقت کو نہیں چھیڑا گیا۔ صرف انداز بدل گیا۔ نئے اقدامات کر کے اور نئی حکمتِ عملی اختیار کر کے صدیوں پرانی سماجی تنظیم کو تبدیل کر دیا گیا۔

انتظام وانصرام کا نظام یقیناً بے نظیر تھا اور ایک نو تشکیل شدہ ڈھانچہ کی نمائندگی کرتا تھا۔ لیکن اس میں ایک فردِ واحد کی حکمرانی کی ساری برائیاں پہلے دن سے ہی موجود تھیں۔ حالاں کہ ''سوات اس بات کی ایک اچھی مثال بن گیا کہ ایک فردِ واحد کی حکمرانی کتنی رفاہی ہو سکتی ہے۔'' عبدالودود اور جہان زیب دونوں مطلق العنان حکمران تھے۔ جہان زیب کے عہد میں پالیسی اور قوانین میں کچھ تبدیلی لائی گئی اور باپ کے مقرّبین اور حمایتیوں کی جگہ نئے لوگ سامنے لائے گئے جس سے پرانے وفاداروں میں ناراضگی پیدا ہوگئی جب کہ نئے حمایتی نہ تو اپنی اہلیت ثابت کر سکے اور نہ ہی کچھ زیادہ وفادار نکلے، جب کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ فردِ واحد کی حکمرانی سے خوش نہیں تھا۔ اس لئے وہ مسلسل اصلاحات، شہری حقوق اور آزادی کے لئے دباؤ ڈالتا رہا۔

ہندوستان کی ریاستوں میں سب سے کم عمر ہونے کے باوجود ریاست سوات کو اپنی تزویری اہمیت کے محلِ وقوع کی وجہ سے منفرد مقام حاصل رہا۔ اُس وقت کی عالمی طاقت برطانوی سلطنت سے اس کے دوستانہ تعلقات رہے۔ بعد میں پاکستان کے ساتھ بھی معاملات دوستانہ ہی رہے۔

یہ تحقیقی مطالعہ اس بات کا تعین کرتا ہے کہ یوسف زئی قبائل کے قبضہ کے بعد ریاست سوات کی دوسری بار تشکیل دراصل اُس پانچ رکنی کونسل کے قیام سے شروع ہوئی جس میں اصل اختیارات سنڈاکئی بابا کے ہاتھ میں تھے جو کہ نواب دیر کا شامیزئی، سیبوجنی اور نیکپی خیل علاقہ پر قبضہ ختم کرانے کے بعد یہاں کے اہم معاملات نمٹانے کے لئے تشکیل ہوئی تھی، اور یہ کہ دراصل باقاعدہ حکومت کا آغاز 1915ء میں عبدالجبار شاہ (1915ء تا 1917ء) کو ایک جرگہ کے ذریعہ سوات کا بادشاہ مقرر ہونے کے ساتھ ہو گیا تھا نہ کہ 1917ء میں جب عبدالودود کو بادشاہ مقرر کیا گیا جیسا کہ غلطی سے عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔

یہ تحقیقی مطالعہ بتاتا ہے کہ

☆ میاں گل عبدالودود نے ریاست کو مستحکم کرنے کے لئے سواتی معاشرہ میں موجود خصوصیات 'دریا دلی اور حسد' سے مکمل اور آزادانہ طور پر فائدہ اٹھایا۔

☆ ریاست کے استحکام کے لئے جو نت نئے طریقے اور انداز اختیار کئے گئے اُن سے میاں گل عبدالودود کی انتہائی ذہانت اور بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔

☆ متعلقہ علاقوں کی سیاسی صورتحال سے مدد لیتے ہوئے ریاست سوات کی توسیع کا کام جاری رکھا گیا۔ اس مقصد کے لئے سفارتی اور فوجی دونوں قسم کے ذرائع استعمال کئے گئے۔

☆ ریاست کا منفرد انتظامی نظام ہر دائرہ کار میں مؤثر تھا۔ مزید برآں اگر نئے قواعد وضوابط کی تشکیل کے لحاظ سے اس کو پرکھا جائے تو میاں گل عبدالودود کے عہد میں یہ خاصا مرکز گریز پالیسی کا غماز لگتا ہے لیکن اگر ان قواعد وضوابط پر عملدرآمد کے نقطۂ نظر سے اس کو دیکھا جائے تو پھر باچا صاحب اور والی صاحب دونوں ادوار میں مرکزیت پسندی کا غلبہ نظر آتا ہے۔

☆ عبدالودود اور جہان زیب کی اختیار کردہ پالیسی اور کوششوں سے یہاں کے لوگوں کے طور اطوار اور نقطۂ نظر میں مرحلہ وار تبدیلی آگئی اور معاشرہ کا قبائلی رنگ بھی دھیما پڑ گیا۔

☆ بالعموم یہ تبدیلیاں پرامن طریقہ سے لائی گئیں۔ اس کے لئے صرف روایتی طریقے استعمال نہیں کئے گئے بلکہ قابل قبول نئے طریقے بھی آزمائے گئے۔

☆ اس دوران جو طرزِ حکومت ظہور پذیر ہوا وہ روایتی، اسلامی اور جدید اقدار اور قوانین، وضوابط کا ایک امتزاج تھا۔

☆ ادغام کی بڑی وجہ مطلق العنان طرزِ حکمرانی تھی۔

☆ ادغام کی اصل ذمہ داری بھی میاں گل جہان زیب پر عائد ہوتی ہے۔ وہ حالات کے مطابق اپنی طرزِ حکمرانی میں تبدیلی لانے میں ناکام رہے۔

☆ ادغام سے اس علاقہ اور یہاں کے باشندوں پر مثبت اور منفی دونوں قسم کے اثرات مرتب ہوئے۔

مأخذ کا تجزیہ

سوات اور ریاست سوات کے بارے میں اچھا خاصا تحریری مواد موجود ہے۔ اگرچہ اس مطالعہ کی اصل بنیاد تو دستاویزات اور محفوظ یادداشتیں ہیں لیکن اس میں بہت سی کتب سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ مختلف جرائد میں چھپنے والی تحریروں اور صوبہ، نیز پاکستان یا برِّصغیر کے بارے میں مطبوعہ مواد، رپورٹوں اور حوالہ جات کے علاوہ سوات اور ریاست پر خصوصی طور پر بہت ساری کتابیں، پمفلٹ اور کتابچے لکھے گئے ہیں۔ ان میں شاہی سرپرستی میں لکھی گئی کتابیں، حکمرانوں کی خودنوشت، حکمرانوں کی درپردہ سرپرستی میں لکھی گئی اور آزاد مصنفین کی تحریریں شامل ہیں۔

سوات اور ریاست سوات کے بارے میں لکھی گئی کتب میں سے سب سے پہلے دربار سے منسلک لوگوں کی اور حکمرانوں کی خودنوشت کتابوں کو لیتے ہیں۔ان میں عبدالغفور قاسمی کی *تاریخ ریاست سوات* جسے *ہسٹری آف سوات* (1940ء) کے نام سے انگریزی میں چھاپا گیا۔ تاج محمد خان زیب سر کی *عروج افغان* دو جلدوں میں (جلد اوّل 1360 ھجری، جلد دوم 1361 ھجری) یہ کتاب شعر میں ہے۔ محمد آصف خان کی *تاریخ ریاست سوات و سوانح حیات بانئی ریاست سوات حضرت میاں گل گل شہزادہ عبدالودود خان بادشاہ صاحب* (1958ء)۔ یہ کتاب اسی نام سے اردو میں بھی چھپی اور اس کا انگریزی ترجمہ *دی سٹوری آف سوات: ایز ٹولڈ بائی دی فاؤنڈر میاں گل عبدالودود بادشاہ صاحب ٹو محمد آصف خان* (1962/1963ء) ہے۔ یہ ترجمہ اشرف الطاف حسین نے کیا۔ اسی طرح *دی لاسٹ والی آف سوات: این آٹو بیاگرافی ایز ٹولڈ ٹو فریڈرک بارتھ* (1985/1995ء) ہے۔ درباری تواریخ اور حکمرانوں کی اپنی رُوداد ہونے کے ناطے یہ کتابیں بطور مأخذ بے حد مفید ہیں لیکن ان کو معروضی تنقیدی انداز سے پرکھنے کی بہرحال ضرورت ہے۔اس لئے کہ ان میں بنیادی طور پر حکمرانوں کا ہی نقطۂ نظر اور کارنامے بیان کئے گئے ہیں۔

کچھ کتابیں ایسی ہیں جن کی خفیہ انداز میں شاہی دربار سے سرپرستی کی گئی۔ان میں سے کچھ یہ ہیں نصر اللہ خان نصر کی *سوات* (1963ء) اور *اخوند صاحب سوات* (1950/1964ء)، عنایت اللہ کی *ذریاست سوات تاریخی او ترقیاتی جائزہ* (تاریخ ندارد)، محمد اسماعیل ذبیح کی *مناظر سوات* (1954ء) جس کا *گلمپسس آف سوات* کے نام سے انگریزی ترجمہ کیا گیا۔ اور میاں گل فروش کی *ریاست سوات کا قیام و جناب ہز ہائی نس والی صاحب سوات کا مختصر خاکۂ زندگی* (تاریخ ندارد) ہے۔اس کا بھی انگریزی میں ترجمہ *دی والی آف سوات میاں گل شہزادہ محمد عبدالحق جہانزیب* (تاریخ ندارد) کے نام سے کیا گیا ہے۔ بالعموم یہ کتابچے سوات کے حکمرانوں کی تعریف و توصیف اور ان کے کارناموں کے ذکر سے اتنے بھرے ہوئے ہیں اور ان میں اِتنی مبالغہ آمیزی سے کام لیا گیا ہے کہ یہ سچی تصویروں کی جگہ ہاتھوں سے بنائے ہوئے خاکے لگتے ہیں۔ بعد از ادغام سرکاری طور پر *رواج نامہ سوات* (تاریخ ندارد) کے نام سے غلام حبیب خان نے ایک کتاب مرتب کی جو کہ والئی سوات کے فرامین، دفتری احکامات، فیصلوں، مختلف علاقوں کے لئے بنائے گئے ضوابط کار وغیرہ پر مشتمل ہے۔اسے ریاست سوات کے مرکزی اور تحصیل کی سطح پر موجود غیر مطبوعہ ریکارڈ اور کچھ مطبوعہ دفتری احکام اور فیصلوں میں سے منتخب کیا گیا ہے تاکہ انتظامیہ، عدلیہ اور دوسرے متعلقہ اہلکاروں اور عام لوگوں کی رہنمائی کے لئے اسے استعمال کیا جا سکے اور اس کے ساتھ ساتھ اسے بطور حوالہ بھی کام میں لایا جا سکے۔

غیر سرکاری مأخذ میں سب سے پہلے سراج الدین سواتی کی تصانیف *قبائلی علاقہ اور ریاستیں* (1966ء)،

قائم کی گئی ہے جس کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں۔ مخدوم تصدق کی کتاب سواتی معاشرہ کی سماجی تنظیم کے بارے میں ایک اچھا مطالعہ ہے، بالخصوص ریاست اور قبل از ریاست ادوار کے تقابل کے حوالہ سے۔ اُس نے اُن عناصر میں سے بعض کا بہت عمدہ جائزہ لیا ہے جن کی وجہ سے معاشرہ میں ریاستی دور میں تبدیلی آئی۔ بہر صورت کچھ غلطیاں اس میں بھی آگئی ہیں۔ اسی طرح سلطان روم (مصنف) کی تحریر اس موضوع کا کوئی تفصیلی مطالعہ نہیں۔ علاوہ ازیں اس میں بھی کچھ غلطیاں موجود ہیں جن کا ازالہ اس وجہ سے نہیں ہوسکا کہ ایک تو مصنف اور ایڈیٹرز کے درمیان ابلاغ کا مسئلہ تھا اور دوسری وجہ علاقہ کی تاریخ کے بارے میں ایڈیٹرز کا علم مطلوبہ معیار کا نہیں تھا۔ بہر حال اب اس کتاب میں اُن نقائص کا ازالہ کرلیا گیا ہے۔

اس موضوع سے متعلق غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ جات جن تک مصنف کی رسائی رہی ہے یہ ہیں۔ عبدالواحد خان کی *ایڈمنسٹریٹو سسٹم آف سوات سٹیٹ* (1959ء)، بونیر خان کی *گروتھ آف ماڈرن ایجوکیشن ان سوات سٹیٹ* (1963ء)، شہاب الدین کی *میاں گل عبدالودود (بادشاہ صاحب) دی فاونڈر آف سوات اسٹیٹ* (تاریخ ندارد)، فخر الاسلام کی *سوات انڈر جہان زیب* (تاریخ ندارد)، نورحسن کی *دیر سوات ریلیشنز* (1991ء)، آفتاب احمد کی *گورنمنٹ جہان زیب کالج: ہسٹری اینڈ ڈیویلپمنٹ* (تاریخ ندارد)، محمد سلیم ناز کی *ایجوکیشن ان ایکس سٹیٹ آف سوات* (1996ء) اور ناہید حسین کی *سوات اسٹیٹ تھرو دی ایجز* (تاریخ ندارد)۔ ان میں سے عبدالواحد خان، بونیر خان اور ناہید حسین کا کام قیمتی معلومات رکھتا ہے اور ان سے اپنے موضوع پر ان کی اچھی دسترس رکھنے کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان میں سے پہلے دو مقالے تو موضوع بحث سے متعلق مسائل کو ٹھیک کرنے کے لئے تجاویز بھی پیش کرتے ہیں۔ بقیہ مقالہ جات تو محض پہلے سے موجود کتابوں کی نقل ہے یا لکھنے والوں نے جیسا سنا ہے اُسے بغیر کسی تجزیہ کے پیش کردیا ہے۔

اس کتاب کے ماخذ مطبوعہ اور غیر مطبوعہ شکل میں ضلعی محافظ خانہ، گل کدہ (سوات)، ضلعی مال خانہ ،سیدوشریف (سوات)، ڈائریکٹریٹ آف آرکائیوز اینڈ لائبریریز (پشاور)، ٹرائبل افیئرز ریسرچ سیل (پشاور) نیشنل ڈاکومینٹیشن سینٹر (اسلام آباد) اور ملک کی دیگر کئی لائبریریوں میں موجود ہیں جن سے بھرپور استفادہ کیا گیا ہے۔ اسی طرح انگریزی، اردو، پشتو، اور فارسی ماخذ سے آزادانہ رجوع کیا گیا ہے۔ مصنف نے کچھ غیر مطبوعہ ذاتی مواد (ہزارہ ،سوات) اور اسی طرح عبدالوہاب خان (روڑیال، سوات)، بہادر خان (فتح پور، سوات)، فضل معبود المعروف بابو (سیدوشریف، سوات) اور ضیاء اللہ خان (گلکدہ ،سوات) کے ہاں موجود غیر مطبوعہ مواد سے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔

وہ دستاویزی مواد جو برطانوی دورِ حکومت کی فائلوں اور رپورٹوں میں موجود ہے، کے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ

اُس میں معروضیت کی کمی ہے لیکن، ان کی خوبی یہ ہے کہ یہ ایسی ابتدائی معلومات کا خزانہ ہیں جن کا حصول مقامی اور دیگر ذرائع سے ممکن نہیں ہے۔ مزید برآں یہ مقامی طور پر وقوع پذیر ہونے والے حالات وواقعات کا کسی حد تک غیر جانبدارانہ معروضی قسم کا تذکرہ اور تجزیہ بھی ہے اس لئے کہ انگریز حکومت ان میں کچھ تھوڑی دلچسپی رکھنے کے باوجود براہِ راست ملوث نہیں تھی۔ میں نے اپنے اس تاریخی کام کے لئے اس ماخذ کو معروضیت کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ اس سارے دستاویزاتی ریکارڈ نے جو کہ زیادہ تر صوبائی ہفتہ وار سیاسی ڈائریوں پر مشتمل ہے، اور جو ڈپٹی کمشنر پشاور کے آفس کی فائلوں میں ہے اس تاریخی وتحقیقی مطالعہ کو موجودہ شکل دینے میں بے حد مدد فراہم کی۔

ریاست سوات کے کچھ عہدیدار اور عُمّال جو کہ اُس وقت بہت اہم عہدوں پر متمکن تھے، ادغام کے بعد صوبائی حکومت میں بھی مختلف عہدوں پر کام کرتے رہے۔ وہ اور ان کے علاوہ بہت سے ایسے لوگ جو والئی سوات کے مخالف تھے اور کچھ دوسری اہم شخصیات جب اس کتاب پر کام شروع کیا گیا تو وہ بقیدِ حیات تھے۔ مصنف نے گفتگو کے ذریعہ حاصل کردہ معلومات کو بھی اس ضمن میں جمع کیا، مذکورہ بالا اشخاص اور کچھ دیگر لوگوں سے ملاقاتیں کیں اور اُن سے انٹرویوز لئے جنہیں بالعموم باقاعدہ ٹیپ ریکارڈر پر محفوظ کیا گیا۔ یہ اَمر دلچسپی سے خالی نہیں کہ ان میں سے دو افراد نے انٹرویوز کو ٹیپ ریکارڈر پر محفوظ کرنے کی اجازت نہیں دی۔ ان میں سے ایک سابقہ ریاستی ملازم تھا جو بعد میں صوبائی ملازم بھی رہا اور دوسرا وہ جس نے میاں گل عبدالودود کی سوانح عمری لکھی ہے۔ بقیہ حضرات میں سے نے صرف چند مواقع پر ٹیپ ریکارڈر بند کرنے کے لئے کہا جب وہ آف دی ریکارڈ کچھ کہنا چاہتے تھے۔ مختلف لوگوں کے یہ انٹرویوز بہت احتیاط اور معروضیت کے ساتھ استعمال کئے گئے ہیں۔ ان کا تنقیدی تجزیہ کیا گیا ہے اور دیگر ذرائع اور انٹرویوز سے حاصل کردہ معلومات اور اپنی ذاتی معلومات سے ان کی صحت پر پوری طرح شرح صدر حاصل ہونے کے بعد ان کو استعمال میں لایا گیا ہے۔ ان انٹرویوز سے صرف یہ نہیں کہ بعض بہت ہی نادر قسم کی معلومات حاصل ہوئی ہیں بلکہ بعض ایسے اہم معاملات وواقعات کی تفصیل اور اُن کا اچھا ادراک حاصل کرنے میں مدد ملی جو کہ تحریری ماٰخذ میں دستیاب نہیں۔ الغرض یہ ذریعہ ایک خزینہ ثابت ہوا۔ اس سے نہ صرف بعض متضاد معلومات ونقطہ ہائے نظر کی جانچ پڑتال میں مدد ملی بلکہ معاشرہ اور معاملات کے کئی ملفوف پہلو بھی اجاگر ہوئے اور سماجی، سیاسی، اور معاشی ترقی اور اس تبدیلی کی راہ کے نشیب وفراز بھی معلوم ہوئے۔

سوات سے اپنے تعلق اور وہاں مستقل رہائش کے سبب مصنف کی اس علاقہ کے بارے میں معلومات نیز عام وخاص لوگوں سے ریاست اور اُس کے حکمرانوں کے بارے میں عام وخاص محافل میں گفتگو سے بھی ریاست اور ریاست کے قیام سے پہلے اور اس کے ادغام کے بعد کے حالات کو ہر پہلو سے سمجھنے میں بے پناہ مدد ملی اور متنازعہ فیہ معاملات اور مختلف نقطہ ہائے نظر کو ٹھیک ٹھیک پرکھنے میں آسانی ہوئی۔

قائم کی گئی ہے جس کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں۔ مخدوم تصدق کی کتاب سواتی معاشرہ کی ساجی تنظیم کے بارے میں ایک اچھا مطالعہ ہے، بالخصوص ریاست اور قبل از ریاست ادوار کے تقابل کے حوالہ سے۔ اُس نے اُن عناصر میں سے بعض کا بہت عمدہ جائزہ لیا ہے جن کی وجہ سے معاشرہ میں ریاستی دور میں تبدیلی آئی۔ بہرصورت کچھ غلطیاں اس میں بھی آگئی ہیں۔ اسی طرح سلطان روم (مصنف) کی تحریر اس موضوع کا کوئی تفصیلی مطالعہ نہیں۔ علاوہ ازیں اس میں بھی کچھ غلطیاں موجود ہیں جن کا ازالہ اس وجہ سے نہیں ہوسکا کہ ایک تو مصنف اور ایڈیٹرز کے درمیان ابلاغ کا مسئلہ تھا اور دوسری وجہ علاقہ کی تاریخ کے بارے میں ایڈیٹرز کا علم مطلوبہ معیار کا نہیں تھا۔ بہرحال اب اس کتاب میں اُن نقائص کا ازالہ کرلیا گیا ہے۔

اس موضوع سے متعلق غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ جات جن تک مصنف کی رسائی رہی ہے یہ ہیں۔ عبدالواحد خان کی *ایڈمنسٹریٹو سسٹم آف سوات سٹیٹ* (1959ء)، بونیر خان کی *گروتھ آف ماڈرن ایجوکیشن ان سوات سٹیٹ* (1963ء)، شہاب الدین کی *میاں گل عبدالودود (بادشاہ صاحب) دی فاونڈر آف سوات اسٹیٹ* (تاریخ ندارد)، فخر الاسلام کی *سوات انڈر جہان زیب* (تاریخ ندارد)، نورحسن کی *وریسوات ریلیشنز* (1991ء)، آفتاب احمد کی *گورنمنٹ جہان زیب کالج: ہسٹری اینڈ اچیومنٹ* (تاریخ ندارد)، محمد سلیم ناز کی *ایجوکیشن ان ایکس سٹیٹ آف سوات* (1996ء) اور ناہید حسین کی *سوات اسٹیٹ تھرو دی ایجز* (تاریخ ندارد)۔ ان میں سے عبدالواحد خان، بونیر خان اور ناہید حسین کا کام قیمتی معلومات رکھتا ہے اور ان سے اپنے موضوع پر ان کی اچھی دسترس رکھنے کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان میں سے پہلے دو مقالے تو موضوع بحث سے متعلق مسائل کو ٹھیک کرنے کے لئے تجاویز بھی پیش کرتے ہیں۔ بقیہ مقالہ جات تو محض پہلے سے موجود کتابوں کی نقل ہے یا لکھنے والوں نے جیسا سنا ہے اُسے بغیر کسی تجزیہ کے پیش کردیا ہے۔

اس کتاب کے ماخذ مطبوعہ اور غیر مطبوعہ شکل میں ضلعی محافظ خانہ، گل کدہ (سوات)، ضلعی مال خانہ، سیدوشریف (سوات)، ڈائریکٹریٹ آف آرکائیوز اینڈ لائبریریز (پشاور)، ٹرائبل افیئر ز ریسرچ سیل (پشاور) نیشنل ڈاکومینٹیشن سینٹر (اسلام آباد) اور ملک کی دیگر کئی لائبریریوں میں موجود ہیں جن سے بھرپور استفادہ کیا گیا ہے۔ اسی طرح انگریزی، اردو، پشتو، اور فارسی ماخذ سے آزادانہ رجوع کیا گیا ہے۔ مصنف نے کچھ غیر مطبوعہ ذاتی مواد (ہزارہ، سوات) اور اسی طرح عبدالوہاب خان (رونزیال، سوات)، بہادر خان (فتح پور، سوات)، فضل معبود المعروف بابو (سیدوشریف، سوات) اور ضیاء اللہ خان (گلکدہ، سوات) کے ہاں موجود غیر مطبوعہ مواد سے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔

وہ دستاویزی مواد جو برطانوی دورِ حکومت کی فائلوں اور رپورٹوں میں موجود ہے، کے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ

اُس میں معروضیت کی کمی ہے لیکن ان کی خوبی یہ ہے کہ یہ ایسی ابتدائی معلومات کا خزانہ ہیں جن کا حصول مقامی اور دیگر ذرائع سے ممکن نہیں ہے۔ مزید برآں یہ مقامی طور پر وقوع پذیر ہونے والے حالات وواقعات کا کسی حد تک غیر جانبدارانہ معروضی قسم کا تذکرہ اور تجزیہ بھی ہے اس لئے کہ انگریز حکومت ان میں کچھ تھوڑی دلچسپی رکھنے کے باوجو براہِ راست ملوث نہیں تھی۔ میں نے اپنے اس تاریخی کام کے لئے اس ماخذ کو معروضیت کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ اس سارے دستاویزاتی ریکارڈ نے جو کہ زیادہ تر صوبائی ہفتہ وار سیاسی ڈائریوں پر مشتمل ہے اور جو ڈپٹی کمشنر پشاور کے آفس کی فائلوں میں ہے اس تاریخی وتحقیقی مطالعہ کو موجودہ شکل دینے میں بے حد مدد فراہم کی۔

ریاست سوات کے کچھ عہدیدار اور عُمّال جو کہ اُس وقت بہت اہم عہدوں پر متمکن تھے، ادغام کے بعد صوبائی حکومت میں بھی مختلف عہدوں پر کام کرتے رہے۔ وہ اور ان کے علاوہ بہت سے ایسے لوگ جو والئی سوات کے مخالف تھے اور کچھ دوسری اہم شخصیات جب اس کتاب پر کام شروع کیا گیا تو وہ بقید حیات تھے۔ مصنف نے گفتگو کے ذریعہ حاصل کردہ معلومات کو بھی اس ضمن میں جمع کیا، مذکورہ بالا اشخاص اور کچھ دیگر لوگوں سے ملاقاتیں کیں اور اُن سے انٹرویوز لئے جنہیں بالعموم باقاعدہ ٹیپ ریکارڈر پر محفوظ کیا گیا۔ یہ اَمر دلچسپی سے خالی نہیں کہ ان میں سے دو افراد نے انٹرویوز کو ٹیپ ریکارڈر پر محفوظ کرنے کی اجازت نہیں دی۔ ان میں سے ایک سابقہ ریاستی ملازم تھا جو بعد میں صوبائی ملازم بھی رہا اور دوسرا وہ جس نے میاں گل عبدالودود کی سوانح عمری لکھی ہے۔ بقیہ حضرات میں سے چند نے صرف چند مواقع پر ٹیپ ریکارڈر بند کرنے کے لئے کہا جب وہ آف دی ریکارڈ کچھ کہنا چاہتے تھے۔ مختلف النوع لوگوں کے یہ انٹرویوز بہت احتیاط اور معروضیت کے ساتھ استعمال کئے گئے ہیں۔ ان کا تنقیدی تجزیہ کیا گیا ہے اور دیگر ذرائع اور انٹرویوز سے حاصل کردہ معلومات اور اپنی ذاتی معلومات سے ان کی صحت پر پوری طرح شرح صدر حاصل ہونے کے بعد ان کو استعمال میں لایا گیا ہے۔ ان انٹرویوز سے صرف یہ نہیں کہ بعض بہت ہی نادر قسم کی معلومات حاصل ہوئی ہیں بلکہ بعض ایسے اہم معاملات وواقعات کی تفصیل اور اُن کا اچھا ادراک حاصل کرنے میں مدد ملی جو کہ تحریری ماٴخذ میں دستیاب نہیں۔ الغرض یہ ذریعہ ایک خزینہ ثابت ہوا۔ اس سے نہ صرف بعض متضاد معلومات ونقطہ ہائے نظر کی جانچ پڑتال میں مدد ملی بلکہ معاشرہ اور معاملات کے کئی ملفوف پہلو بھی اجاگر ہوئے اور سماجی، سیاسی، اور معاشی ترقی اور اس تبدیلی کی راہ کے نشیب وفراز بھی معلوم ہوئے۔

سوات سے اپنے تعلق اور وہاں مستقل رہائش کے سبب مصنف کی اس علاقہ کے بارے میں معلومات نیز عام وخاص لوگوں سے ریاست اور اُس کے حکمرانوں کے بارے میں عام وخاص محافل میں گفتگو سے بھی ریاست اور ریاست کے قیام سے پہلے اور اس کے ادغام کے بعد کے حالات کو ہر پہلو سے سمجھنے میں بے پناہ مدد ملی اور متنازعہ فیہ معاملات اور مختلف نقطہ ہائے نظر کو ٹھیک ٹھیک پرکھنے میں آسانی ہوئی۔

قابل افسوس اُمر یہ ہے کہ ادغام کے بعد ریاستِ سوات کے سیاسی ریکارڈ یعنی سرکاری خط و کتابت اور ریاستی مشاورتی کونسل کی کارروائی کی روداد کی فائلوں کی حفاظت اس طرح نہیں کی جاسکی جیسی ہونی چاہئے تھی۔ اس لئے یا تو وہ ضائع کیا گیا ہے یا اُسے مفاد پرستوں نے چرالیا ہے۔ دورانِ مطالعہ پشاور کے دستاویزات خانہ (ارکائیوز) میں سے کچھ فائلیں غائب پائی گئیں۔

مذکورہ بالا کتب اور ایم اے لیول کے لئے لکھے گئے مقالوں کا نہ صرف یہ کہ احاطہ کار محدود رہا ہے بلکہ بحیثیت مجموعی یہ معاملات کے تنقیدی تجزیوں سے خالی ہیں اور ان میں بہت سی باتیں خلاف حقیقت بھی ہیں۔ حالانکہ مذکورہ بالا عالمانہ تحقیقی مطالعے کسی حد تک اس مطالعہ سے متعلق تو ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جس نے اس پورے عہد اور اُس کے ہر پہلو کا اس طرح سے جائزہ لیا ہو جیسا کہ اس مطالعہ میں لیا گیا ہے۔

دوسرا باب

جغرافیائی اور تاریخی تناظر

جغرافیائی تناظر

وجہ تسمیہ

اس سلسلہ میں مختلف نظریئے پیش کئے گئے ہیں۔ ایک نظریہ یہ ہے کہ یہ نام سواستو یا سواستوس سے ماخوذ ہے۔ یہ دونوں نام اس وادی میں سے گزرنے والے دریا کے لئے قدیم سنسکرت اور یونانی زبانوں میں بالترتیب استعمال ہوئے ہیں۔ ایک اور دعویٰ یہ ہے کہ اس نام کا ماخذ لفظ 'سویتا' ہے جو سفید کو کہتے ہیں۔ جس سے مراد دریائے سوات کا صاف وشفاف پانی ہے۔ ایک اور دعویٰ یہ کیا گیا ہے کہ پانی کی بہتات کی وجہ سے اس وادی کا بیشتر میدانی علاقہ دلدلی ہونے کی وجہ سے چمک دار اور سفید نظر آتا تھا اس لئے اُسے 'سُوَ اَدَت' کہا جاتا تھا جو ہوتے ہوتے سوات بن گیا۔

کچھ کا یہ خیال ہے کہ یہاں کی سیہ رنگ زرخیز مٹی پر بہ کثرت اُگے ہوئے جنگلات سے یہ وادی سیاہ نظر آتی تھی جس کی وجہ سے مسلمان حملہ آوروں نے اسے 'اسوذ' کہا جو کہ عربی میں سیاہ کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ مرور زمانہ کے ساتھ یہ لفظ سواد بن گیا۔ بابر اور مغل دور کے مؤرخ اسے 'سواذ' کہتے ہیں جو بعد میں سوات بن گیا۔ مغلیہ دور کے مقامی لکھنے والے جیسے خوشحال خان خٹک اسے سواد کی جگہ سوات کہتے ہیں۔

ایک اور خیال یہ ہے کہ یہ لفظ عربی لفظ 'صوت' سے مشتق ہے جس کے معنی آواز اور گونج کے ہیں۔ چونکہ یہاں گردوپیش کے اونچے پہاڑوں سے ٹکرا کے آوازیں گونج کی شکل میں لوٹتی ہیں اس لئے اسے یہ نام دیا گیا ہے۔[1] اس خیال کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ اُن دیہاتوں میں جو دریا کے کنارے واقع ہیں دریا کے پانی کی آواز رات کو مسلسل سنائی دیتی ہے، بالخصوص موسم بہار اور گرما میں جب پانی چڑھتا ہے۔ چاہے اس کی بنیاد کچھ بھی ہو

ریاست کے وجود میں آنے سے پہلے اور بعد کی مقامی تحریروں میں اس کا نام صوات ہی لکھا جاتا رہا ہے۔
بہر حال حقیقت یہ ہے کہ سوات پر حملہ کرنے والے مسلمان عرب نہیں تھے اور نہ ہی اُن کی زبان عربی تھی۔ ان کا تعلق افغانستان سے تھا اور ان کی اپنی اپنی زبانیں تھیں اس لئے اس بات کا امکان نہیں کہ انہوں نے اپنی مفتوحہ سرزمین کو ایک عربی نام دے دیا ہو جب کہ نہ تو انہیں عربی زبان پر کوئی عبور حاصل تھا اور نہ ہی وہ اُسے اپنی روزمرہ زندگی میں استعمال کرتے تھے۔ اس نام کا عربی الفاظ 'صوت' اور 'اسود' سے اشتقاق کا خیال بہت بعد میں پیش کیا گیا۔
ان کے علاوہ ایک اور نظریہ کا ذکر عبدالحلیم اثر نے کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ یہ لفظ دو اجزاء کا مرکب ہے۔ یعنی سُو جس کا مطلب ہے 'سورج' قدیم سُریانی زبان کی طرز ادائیگی کے ساتھ اور اَت، مطلب 'زمین'۔ اس طرح لفظ سُواَت کا مطلب سورج سے منسوب سرزمین ہوا۔ سورج سے منسوب سرزمین کے اس نظریہ کی بنیاد یا تو یہ ہے کہ زمانہ قدیم میں یہاں سورج کی پرستش ہوتی تھی یا یہ کہ یہ وادی کھلی ہونے کی وجہ سے ہر وقت دھوپ سے روشن رہتی ہے۔
زمانہ قدیم کے ماخذ میں اس جگہ کے نام املا کے کچھ فرق کے ساتھ 'ادھیانہ' اور 'سواستو' ملتے ہیں۔ پہلے میں اس وادی کے قدرتی حسن کی طرف اشارہ ہے جبکہ دوسرے میں یہاں بہنے والے دریا کا حوالہ ہے۔ مزید برآں ویدوں اور پانینی نے جہاں 'سواستو' کا ذکر کیا ہے تو وہاں اُس سے مراد رہنے کی اچھی جگہیں ہیں۔ ہیون سانگ نے دریائے سوات کو سو۔ پو۔ فا۔ سو۔ تو، جو کہ دراصل سبھاواستو ہے۔ یعنی آج کا دریائے سوات جسے اریان نے سوستوس کا نام دیا۔ سیموئل بیل نے اس کی توجیہ یہ کی ہے کہ اسے ایک باغ کی شکل رکھنے کی وجہ سے یہ نام دیا گیا ہے۔
ڈاکٹر عبدالرحمٰن نے البتہ اپنی ایک تازہ تحقیق میں یہ نقطہ نظر اپنایا ہے کہ

> ''اوڈیز گندھارا میں ایک حکمران قبیلہ کا نام ہے۔ ان کا عہد چار سو قبل مسیح ہے جب کہ سکندر اعظم کے مورخین نے 'اورا' کے نام سے ان کا پہلی بار ذکر کیا ہے۔ سٹائن نے اُس کی سوات کے اوڈیگرام کے ساتھ بالکل ٹھیک شناخت کی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ اوڈیز اتنے طاقتور تھے کہ اس پورے علاقہ کو اُن کے نام پر 'ادھیانہ' کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔''

ڈاکٹر عبدالرحمان نے بیل کی اس توجیہ کو رد کیا ہے کہ ایک باغ سی شکل ہونے کی وجہ سے اُسے یہ نام دیا گیا ہے، تاہم وہ کہتے ہیں کہ بیل کی تشریح کے وقت اوڈیز کے بارے میں ابھی معلومات حاصل نہیں ہوئی تھیں۔ 2

طبعی اور سیاسی جغرافیہ

جغرافیائی سیاق وسباق کے بغیر کسی بھی قسم کی تاریخ کو سمجھنا آسان نہیں، اس لئے کسی منظم سائنسی تجزیہ کے لئے علاقہ اور وہاں کے عمومی ماحول کا علم انتہائی ضروری ہے۔

موجودہ خیبر پختونخوا میں سرسبز و شاداب وادیٔ سوات 40'-34° سے 35° شمالاً اور 72° سے 6'. 74° شرقاً واقع ہے۔ دریائے سوات اور پنج کوڑہ کا سنگم جو کہ اس کا نقطۂ آغاز ہے سطح سمندر سے دو ہزار فٹ بلند ہے۔ یہ بلندی شمال میں واقع چوٹیوں تک پہنچتے پہنچتے پندرہ ہزار سے لے کر بائیس ہزار فٹ تک ہو جاتی ہے۔

سوات ایک دوسرے سے مختلف دو علاقوں میں تقسیم تھا۔ سوات کوہستان، جو کہ تمام تر پہاڑی علاقہ ہے اور جو دریائے سوات اور اُس کے معاونین کے بالائی تسلسل کے ساتھ ساتھ جنوب میں آئین تک ہے اور دوسرا ہے سوات خاص۔ سوات خاص بھی بڑ اور کوز یعنی بالا اور زیریں میں تقسیم ہے۔ برسوات آئین سے لنڈاکے تک ہے اور کوزسوات لنڈاکے سے کلنگئی تک جو کہ دریائے سوات اور پنج کوڑہ کے سنگم سے چند میل اوپر کی طرف واقع ہے۔ اے ایچ میک میھن اور اے ڈی جی رمزے نے برطانوی عہد میں ان دو حصوں کا تذکرہ کیا ہے۔

تاہم ایچ ڈبلیو بیلیو نے وادیٔ سوات کی ایک اور طرح تقسیم بتائی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وادیٔ سوات کو تین مقامی اضلاع میں تقسیم کیا گیا تھا۔ رانیزئی، کوزسوات اور برسوات۔ رانیزئی کے مشرق میں الہ ڈھنڈ سے چار باغ تک کوز سوات تھا اور وہاں سے وادی کے اختتام تک شرقاً جہاں یہ غوربند کے کوہستان سے ملتا ہے برسوات تھا۔ اس سمت میں کوہستان کے دامن میں آخری گاؤں چُرڑئی واقع ہے جسے اب مدین کہا جاتا ہے۔ تاہم کوہستانی، جنکی خیل سے آگے آئین تک علاقہ کو کوہستان کا حصہ گردانتے ہیں۔ کچھ برطانوی رپورٹوں میں بھی اسے کوہستان کا حصہ دکھایا گیا ہے۔ خدکزئی، ابازئی، وادیٔ تالاش، اور ادین زئی علاقہ بھی سوات خاص کا حصہ تھا۔ البتہ سوات خاص کے مغربی حصہ کو یعنی کلنگئی سے لنڈاکے تک جو دریا کے بائیں جانب واقع ہے، سوات اور دیر ایجنسی کے زیرِ حفاظت علاقہ میں شامل کرلیا گیا۔ جس میں بعد میں 1897ء میں چترال کو بھی شامل کرلیا گیا۔ جسے عرفِ عام میں ملاکنڈ ایجنسی کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس کا انتظام برطانوی حکومت کا یہاں پر تعینات پولیٹیکل ایجنٹ کرتا تھا۔

ریاست سوات کے وجود میں آنے کے بعد مذکورہ بالا زیرِ حفاظت علاقہ کو اس میں شامل نہیں کیا گیا اس لئے کہ یہاں پہلے سے ہی برطانوی حکومت کا ایک ڈھیلا ڈھالا سا نظام موجود تھا۔ خدکزئی، ابازئی، وادیٔ تالاش اور ادین زئی، جو کہ وادیٔ سوات ہی کا ایک حصہ تھا اور جو اس دریا کے دائیں جانب شموزئی سے آگے غرباً واقع ہے، اسے 1922ء میں ادین زئی معاہدہ کے تحت نواب دیر کے حوالہ کیا گیا۔ یہ معاہدہ برطانوی حکومت نے لاگو کیا تھا۔ نتیجتاً دریا کے بائیں جانب وہ وادی جو لنڈاکے سے شمال مشرق میں ہے اور دائیں جانب جو علاقہ ادین زئی اور شموزئی کی سرحد تک ہے سوات کہلایا۔ اس کی مزید ذیلی تقسیم یوں ہوئی کہ لنڈاکے سے شمال مشرق میں واقع گاؤں چار باغ اور ننگولئی تک بالترتیب دریا کے بائیں اور دائیں دونوں جانب کے علاقہ کو کوزسوات کہا جانے لگا۔ اس کے شمال شمال مشرق کی طرف وادی کے اختتام تک کا سارا علاقہ برسوات کہلایا۔ بعد میں جب ریاست کی سرحدوں میں توسیع کا عمل

شروع ہوا تو اس وادی سے باہر کے علاقے جیسے خدوخیل، کانڑا اور غوربند کی وادیاں اور اباسین کوہستان کا کچھ حصہ بھی اس میں ملا لیا گیا اور ریاست سے باہر کے لوگ ان علاقوں کو بھی سوات کہنے لگے۔ اس کے بعد سے سوات کا نام سوات خاص کے ساتھ دیگر تمام علاقوں کے لئے بھی مستعمل ہو گیا۔

سوات خاص اور سوات کوہستان کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ دونوں کا رقبہ پانچ سے چھ ہزار مربع میل تک ہے۔ یہ غلط ہے۔ اس لئے کہ ریاست سوات کا کُل رقبہ تقریباً چار ہزار مربع میل تھا۔ اس میں وادئ سوات کا وہ علاقہ جو اس سے کاٹ دیا گیا تھا اور جو کہ لنڈا کے سے جنوب مغرب کی جانب واقع ہے شامل نہیں ہے لیکن وہ سارے علاقے جو سوات خاص سے باہر ہیں لیکن جنہیں قبضہ کر کے ریاست میں ملا لیا گیا تھا اس میں شامل ہیں۔ جیسے بونیر، خدوخیل، کانڑا، غوربند وادیاں اور دریا کے دائیں جانب والا اباسین کوہستان۔ اس طرح یہ وادئ سوات خاص اور سوات کوہستان کو ملا کر بننے والے علاقے سے کہیں کسی بڑے علاقے پر مشتمل تھا۔ بہر حال دریائے سوات کی اپنی وادی طولاً 130 میل اور عرضاً بالعموم 12 میل سے زیادہ نہیں۔ خوشحال خان خٹک اس علاقہ کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ وادی لمبائی میں 30 کروہ سے زیادہ جبکہ اس کی چوڑائی تقریباً دو کروہ ہے۔ ہیون سانگ کہتا ہے کہ ایک دائرہ میں واقع یو۔چانگ۔نا تقریباً پانچ ہزار لی یا اندازاً 833 میل ہے۔ لیکن یہ بات بھی وادئ سوات کے رقبہ سے میل نہیں کھاتی۔ ایک نئے مطالعہ میں یہ کہا گیا ہے کہ وادئ سوات کا رقبہ تقریباً 2,374.7 مربع میل ہے جو کہ 3,798 مربع کلومیٹر بنتا ہے لیکن ماخذ مفقود ہونے نے اس دعوی پر سوالیہ نشان لگا دیا ہے۔

اگر چہ ریاستِ سوات کا کل رقبہ 4000 مربع میل تھا لیکن 1972ء میں ہونے والی مردم شماری کے مطابق یہ رقبہ 4715 مربع میل ہے جبکہ 1951ء کی مردم شماری کے مطابق ریاستِ سوات کا رقبہ 2934 مربع میل اور کالام یعنی سوات کوہستان کا وہ علاقہ جسے سوات کے حکمران نے 1954ء میں قبائلی علاقہ تسلیم کر لیا تھا جو کہ وفاق پاکستان کا حصہ ہے، اُس کا رقبہ 822 مربع میل ہے۔ اس طرح ان دونوں کو ملا کر رقبہ 3756 مربع میل بنتا ہے۔

وادئ سوات خاص کے جنوب میں ایلم سلسلہ کوہ اور اُس کا مغرب کی سمت پھیلاؤ ہے جو کہ ہزار نو تک ہے۔ مغرب میں اس کی حد بندی اتمان خیل پہاڑیوں اور باجوڑ نے کر دی ہے۔ شمال میں لَرم پہاڑیاں ہیں، جو غرباً اور شرقاً کامرانی اور منجے پہاڑیوں تک پہنچ گئی ہیں جب کہ اس کے مشرق میں غوربند کی چوٹی ہے۔ لیکن ریاست سوات کی حدیں شمال مشرق اور شمال میں بالترتیب گلگت ایجنسی اور ریاست چترال اور شمال مغرب میں ریاست دیر سے ملتی تھیں اور اس کے جنوب مغرب اور جنوب میں بالترتیب دیر، سوات، چترال ایجنسی کا زیر حفاظت علاقہ جسے عرف عام میں ملاکنڈ ایجنسی کے نام سے پکارا جاتا تھا اور ضلع مردان تھے۔ جب کہ اس کے مشرق میں ضلع ہزارہ تھا۔

مختلف درّوں[3] نے وادئ سوات کو اپنے ہمسایہ علاقوں اور وسط ایشیا، جنوبی ایشیاء اور چین سے مربوط کر دیا

ہے۔ جنوب اور مشرق میں ملاکنڈ، مورہ، شاہ کوٹ، کڑاکڑ، چوراٹ، جواڑئی، کلیل، اور کوٹکے جب کہ مغرب سے شمال مشرق کی طرف سوات کوہستان کے میدانی راستہ کے علاوہ شمال اور مغرب کے مشہور درے جارو گوسر، قادر کنڈو، منجے کنڈو، اور شمال مشرق سے جنوب مغرب کی طرف کاٹگلہ ہے۔

سترہویں صدی میں خوشحال خان خٹک اُن چند مشہور اور اہم راستوں کا ذکر کرتے ہیں جو اسے اُس وقت کی ہمسایہ بڑی سلطنتوں سے جوڑتے ہیں۔ وہ رقم طراز ہیں۔

''ایک راستہ ہندوکش کی پہاڑیوں میں سے ہو کر ترکستان کی طرف جاتا ہے جبکہ دوسرا چترال اور پھر آگے بدخشان کو نکل جاتا ہے۔ ایک اور راستہ پٹن کی طرف سے کاشغر کو جاتا ہے جبکہ ایک اور مورنگ [مورہ؟] کی طرف سے نیچے میدان کو جاتا ہے۔''

کسی زمانہ میں گندھارا اور ہندوستان جانے کے لئے جنوب مغرب میں واقع شاہ کوٹ درہ سب سے اہم تھا لیکن انگریزوں نے 1895ء میں چترال جانے کے لئے اپنی اہم ترین شاہراہ کے طور پر ملاکنڈ کے راستہ کو اختیار کیا۔ دوسرے اہم دڑوں میں سے چین جانے کے لئے مشرق میں کوٹکے درہ تھا جہاں سے موجودہ شمالی علاقہ جات میں سے گزر کر راستہ چین کو جاتا ہے۔ سوات کوہستان میں وادی کے انتہائی آخری حد سرذرے پہاڑی کے قریب کا دڑہ جو کہ چترال سے گزر کر کاشغر جانے والوں کے استعمال میں رہا ہے اور افغانستان اور وسطِ ایشیا جانے کے لئے کاٹگلہ درہ۔

سوات زیریں کے پہاڑ سیلی شس (سیلی کون والی چٹان)، فلنک شِسٹ (سنگ تراشی کے قابل پتھر)، ایمفی بولائٹ، ڈولومائٹ (متغیرہ چٹان)، پلوٹونک (عمیق ترین چٹان)، گرینائٹ (سخت ترین چٹان)، لائم سٹون (چونے کا پتھر) اور سنگ مرمر سے بنے ہیں۔ سوات بالا کی وادی (خوازہ خیلہ اور کالام کے درمیان) میں پلوٹونک راکس نے ایک چوڑی پٹی سی بنادی ہے۔ یہ گرینائٹ، ڈیورائٹ (کھردری دانہ دار داخلی چٹان) گیبرو اور پیگماٹائٹز (گہرے رنگ کی عمیق ترین آتشیں چٹان) پر مشتمل ہے۔ کالام میں موجود چٹانیں میٹاسیڈیمنٹری (ثانوی چٹان) اور پلوٹونک راکس (آتشیں چٹان) نوعیت کی ہیں جن میں گرین میلائٹ (متغیرہ چٹان)، ہارن بلینڈ (ایک قسم کی معدنی شے) اور کوارٹزایٹ (چقماق) وغیرہ شامل ہیں۔ سوات خاص میں زمرد اور چائنا کلے کے ذخائر ہیں۔ جبکہ سنگ مرمر بڑی مقدار میں بونیر میں پایا جاتا ہے۔ لیکن ریاست سوات کے دور میں زمرد کے علاوہ دیگر ذخائر سے استفادہ نہیں کیا گیا۔

چترال کے قرب و جوار کی اونچی گھاٹیوں سے نکل کر دریائے سوات اپنے سرچشموں سے جنوب جنوب مغرب میں چکدرہ کی طرف بہتا ہے۔ وہاں سے جنوب مغرب میں ملاکنڈ وہاں سے شمال مغرب میں پنج کوڑہ سے اپنے سنگم اور وہاں سے دوبارہ جنوب مغرب کی سمت حتٰی کہ امبھار سے جاملتا ہے۔ پھر وہاں سے جنوب مشرق میں ضلع پشاور کے ابازئی تک جا پہنچتا ہے۔ یہی دریا، سوات کے اندر تجارتی لکڑی کی ترسیل اور اسے باہر لے جانے کا سب

سے بڑا ذریعہ رہا ہے۔ دریائے سوات اور اُس کے معاونین نہ صرف سوات کو پانی فراہم کرتے ہیں بلکہ یہ علاقہ کے لئے انتہائی قیمتی قدرتی وسیلہ وذریعہ کا کام دیتا ہے۔ اور اس سے سوات کے باہر کے علاقوں کو بھی فائدہ پہنچتا رہا ہے۔ قدرتی چشمے، برف، اور پگھلتے گلیشیئر مل کر دریائے سوات کو مسلسل زندہ رکھتے ہیں۔ موسم گرما میں یہ ایک سیلابی ریلہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اپریل میں اس کا پانی چڑھنا شروع ہوتا ہے اور اسے عبور کرنا ممکن نہیں رہتا۔ ستمبر میں یہ اُترنا شروع ہو جاتا ہے اور موسم سرما کے وسط میں اسے ہر جگہ سے عبور کیا جا سکتا ہے۔

آب وہوا اور قدرتی نباتات

وادئ سوات دریائے سوات اور اُس کے معاونین کے نکاس کا علاقہ ہے۔ اس میں زرخیز سیلابی مٹی کی پہاڑی ہموار سطحوں کے سلسلے ہیں جو اَب بھی وسیع پیانے پر کاشت کئے جاتے ہیں۔ یہ اپنے گھنے جنگلوں اور مختلف النوع پھولوں اور پھلوں کی فصلوں کے لئے مشہور ہے۔ چاول، گندم، مکئی، جو، دالیں، سرسوں، گنا اور مسور یہاں کی بڑی فصلیں رہے ہیں۔ بہت اوپر کے علاقوں میں صرف ایک فصل ہوتی ہے جب کہ وادی خاص میں دو فصلیں ہوتی ہیں۔ یہ سارا کا سارا علاقہ اتنا زرخیز ہے کہ اچھی فصلوں کے حصول کے لئے کوئی زیادہ محنت درکار نہیں ہوتی۔ لوگوں کی عام خوراک چاول، گندم اور مکئی ہیں۔ چاول سے یہاں کے لوگوں کی رغبت کا اظہار اس مشہور قول سے بخوبی ہو جاتا ہے۔

د سوات خلق زاړه شو خو په وريژو ماړه نه شو

سوات کے لوگ بوڑھے ہو گئے لیکن چاول کھانے سے سیری نصیب نہیں ہوئی۔

جڑی بوٹیاں اور جھاڑیاں کثیر تعداد میں اُگتی ہیں۔ عام طور پر جو درخت یہاں پائے جاتے ہیں وہ یہ ہیں چنار، سفیدا، بید، تُوت، سرس، پستو، بکائن، کیکر، زیتون اور عناب اور بلندی پر اخروٹ اور املوک۔ پھل دار درختوں میں سیب، بہی، آڑو، ناشپاتی، اخروٹ اور املوک بہت عام ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ درختوں کی نئی اقسام پرانی اقسام کی جگہ لے رہی ہیں۔ سوات کے پہاڑ چیڑ اور دیودار کے جنگلات کے لئے مشہور رہے ہیں۔ بعض علاقوں میں شہد پیدا ہوتا ہے۔ یہاں کا شہد معیار اور مقدار دونوں لحاظ سے نمایاں حیثیت کا حامل گردانا جاتا ہے۔

پالتو جانوروں میں گائے، بھینس، بکری اور بھیڑ عام طور پر پائے جاتے ہیں۔ معاشرہ کے چند خاص طبقے جیسے گوجر، اجڑ اور گڈریا اپنی روزی کمانے کے لئے انہی پر انحصار کرتے ہیں۔ گھی، مکھن اور دودھ ہر طرف دستیاب ہے۔ سوات میں ان چیزوں کی پیداوار اپنی ضروریات سے زیادہ تھی اس لئے ان کو برآمد کیا جاتا تھا۔

خوشحال خان خٹک نے سترھویں صدی میں پانی اور فصلوں کی فراوانی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''گاؤں کے ہر گھر تک چھوٹی ندیوں کا پانی پہنچتا ہے۔ پانی کی اس بہتات کی وجہ سے فصلیں اچھی ہوتی ہیں اور غلہ ضرورت سے زیادہ پیدا ہوتا ہے جس کی وجہ سے اُسے ہر جانب برآمد کیا جاتا ہے۔''

ہندوستان کے برطانوی حکام نے 1880ء اور 1890ء کی دہائیوں میں تیار کردہ ایک خفیہ ریکارڈ میں سوات کی آب و ہوا کو دیگر یوسف زئی میدانی علاقوں سے مختلف بتایا ہے۔ گرم موسم یہاں اُن سے دیر میں شروع ہوتا ہے لیکن زیادہ مسلسل اور ناقابل برداشت ہوتا ہے۔ ہر طرف کھڑے پہاڑوں کی وجہ سے ہوا آزادی سے گذر نہیں سکتی۔ پہاڑوں میں بہ کثرت آنے والا طوفان فضا کو ٹھنڈا نہیں کرتے بلکہ نیچے کی وادیوں میں گرم پھنکارتی ہوا کا سبب بنتے ہیں۔ حد درجہ کمزور کر دینے والا ملیریا عام تھا۔ اسی طرح کے اور بھی خوفناک ملیریا بخار تھے جس کے لئے یہ علاقہ بدنام تھا۔ موسم سرما نیچے کے میدانی علاقوں کے مقابلہ میں کم سخت ہوتا ہے اس لئے کہ ہوا نہیں چلتی۔ ہر طرف کھڑے برف پوش پہاڑ اُس کی راہ مسدود کر دیتے ہیں اور پالا بھی زیادہ نہیں پڑتا۔ یہاں کے کم بلند علاقوں میں ہر سال برف نہیں گرتی۔ عموماً تین چار سال کے وقفہ کے بعد برف پڑتی ہے لیکن وہ حتمی نہیں ہے۔ سوات میں بالعموم موسم سرما شدید نہیں ہوتا لیکن لمبا ہوتا ہے۔ میدانی علاقہ کے مقابلہ میں یہاں آب و ہوا میں حبس زیادہ ہوتا ہے۔

ہیون سانگ یہاں کے موسم کے بارے میں کہتا ہے کہ 'یہاں گرمی اور سردی قابل برداشت ہیں، ہوا اور بارشیں موسم کے مطابق آتی ہیں'۔ خوشحال خان خٹک (جو یہاں کے باشندوں کے لئے کوئی نرم گوشہ نہیں رکھتا تھا) یہاں کی مٹی کی زرخیزی، قدرتی حسن، سرسبز و شاداب چراگاہوں اور ہوا کے فرحت بخش جھونکوں کی تعریف کرتا ہے اور سوات کو کابل اور کشمیر سے تشبیہ دیتا ہے۔

لوگ، نسل و نسب

سوات کے باشندوں کی اکثریت یوسف زئی قبیلہ کی اکوزئی شاخ سے ہے۔ یہاں آباد اس قبیلہ کی ذیلی شاخیں یہ ہیں۔ 4 رانی زئی، خان خیل، کوز سُلیزی، (ابا خیل اور موسیٰ خیل) بابوزی اور برسُلیزی (متوزیزی، عزی خیل اور جنکی خیل) اور یہ لوگ دریا کے بائیں کنارے جنوب مغرب سے شمال مشرق کی طرف آباد ہیں۔ رانیزئی کے علاوہ ان سب کو اجتماعی طور پر بائیزئی کہا جاتا ہے۔ جب کہ دریا کے دائیں جانب آباد ذیلی قبیلوں کے نام یہ ہیں (شمال مشرق سے جنوب مغرب کی طرف) شامیزئی، سیبوجنی، نیک پی خیل، شموزئی، ادین زئی، ابازئی اور خدکزئی۔ ابازئی اور خدکزئی کے علاوہ ان سب کو اجتماعی طور پر خوازوزی کہا جاتا ہے۔ بونیر، غوربند، کانڑا، پورن، چکیسر اور

مارتو نگ جو کہ ریاست میں شامل علاقے تھے، وہاں بھی آبادی کا بڑا حصہ یوسف زئی قبائل پر مشتمل ہے۔

سوات کوہستان کے باشندوں کی اکثریت توروالی اور گاوری ہیں۔ ریاست کی عمل داری میں آنے سے پہلے یہ لوگ آزادانہ زندگی گزارتے تھے۔ ان کے علاقہ پر سوات کے حکمران نے 1921ء سے 1947ء تک مرحلہ وار قبضہ کیا۔ اس دوران یہ لوگ کبھی کبھار یاسین اور مستوج کے خوش وخت حکمران خاندان کو ایک برائے نام خراج ادا کرتے تھے جب کہ اباسین کوہستان میں دریا کے دائیں جانب کے علاقہ میں آباد لوگوں کا شجرہ نسب کچھ اور ہے اور انہیں اجتماعی طور پر کوہستانی کہا جاتا ہے۔

گوجر برادری ایک بڑی تعداد میں ریاست کے ہر علاقہ میں آباد ہے لیکن اب انہوں نے اپنی پرانی خانہ بدوشی والی زندگی ترک کر دی ہے اور یہ ہر گاؤں اور قصبہ میں پائے جاتے ہیں۔ زمینوں اور جائیداد کے مالک ہیں۔ زیادہ تر کا تعلق کاشتکاری سے ہے لیکن زندگی کے دیگر شعبوں میں بھی موجود ہیں۔ ان کی ایک شاخ اجڑ ابھی تک خانہ بدوش ہیں۔

ہندو اور سکھ برادری کے لوگ بھی نسلوں سے ریاست میں آباد ہیں۔ ان کی اکثریت دکان دار ہے۔ یہاں کی مسلمان آبادی کے ان سے اچھے مراسم ہیں۔

سواتی پختون (جو یوسف زئی قبیلے سے پہلے اس علاقہ کے والی وارث ہوا کرتے تھے) اور دیگر پختون قبیلوں سے تعلق رکھنے والے، جیسے خٹک اور ترکلانڑی بھی خال خال یہاں ملتے ہیں۔

مذہبی طبقات اُن مذہبی شخصیات کی اولاد ہیں جنہوں نے اپنے قول وعمل اور نیک نامی کی وجہ سے لوگوں کا احترام اور عقیدت حاصل کی۔ انہیں سید، میاں اور صاحبزادہ کہا جاتا ہے۔ یہ مذہبی پیشوں سے شاذ و نادر ہی منسلک ہوتے ہیں۔ البتہ وہ ارضی قطعات جنہیں سیریٰ کہا جاتا ہے کے مالک ہیں اور اپنی مذہبی حیثیت سے کئی طرح کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اسی طرح ملاؤں کا تعلق بھی مذہبی طبقہ سے ہے۔ وہ یا تو خود مذہبی عہدوں پر متمکن ہوتے ہیں یا اُن کے باپ دادا ان عہدوں پر فائز رہے ہوں گے۔ وہ بھی مختلف طریقوں سے اپنی مذہبی حیثیت سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

وادی پوری طرح سے آباد ہے۔ 1901ء میں سوات کوہستان کی آبادی بیس ہزار تھی جب کہ سوات بالا اور زیریں کی آبادی ڈیڑھ لاکھ تھی۔ (اس میں وادی سے باہر کے وہ علاقے شامل نہیں جو ریاست کا حصہ بن گئے تھے لیکن وادی سے باہر واقع تھے)۔ 1972ء کی مردم شماری کے مطابق ضلع سوات یعنی ریاستِ سوات کے سب علاقوں کی آبادی 935,444 ہو گئی تھی۔

لوگوں کی بڑی اکثریت یوسف زئی لہجہ والی پشتو بولتی ہے۔ پہاڑی علاقوں میں آباد گوجر آپس میں اپنی زبان گوجری بولتے ہیں لیکن انہیں پشتو بھی آتی ہے۔ کوہستان کے گاوری اور توروالی اپنی زبان بولتے ہیں جسے کوہستانی کہا

جاتا ہے۔ جب کہ اباسین کوہستان کے باشندے اس زبان کا ایک اور لہجہ بولتے ہیں۔

تاریخی تناظر

سوات کی قدیم تاریخ کا ریکارڈ بہت کم ہے۔ تاہم 1954ء کے بعد آثار قدیمہ کی کھوج کے لئے کی جانے والی کھدائیوں نے اس علاقہ کی قدیم تاریخ کے بارے میں موجود معلومات میں گراں قدر اضافہ کر دیا ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ آریائی نسل کے لوگ یہاں بس گئے تھے۔ جیسا کہ رگ وید میں سواستو یعنی موجودہ سوات کے اس تذکرہ سے اس بات کی شہادت ملتی ہے کہ اس خوبصورت وادی میں آریاؤں کی رہائش رہی۔ تاریخی دستاویزات میں سوات کا اولین معلوم تذکرہ پہلی دفعہ یونانی مؤرخ اریان نے کیا ہے۔ سکندر اعظم نے مشرق کی مشکل مہم میں انڈیا کی طرف جاتے ہوئے سوات پر حملہ کر کے اسے بطور گزرگاہ استعمال کیا۔ اس دوران اُسے سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ 327 قبل مسیح میں سوات جانے کے لئے اُس نے دریائے پنج کوڑہ عبور کیا تاکہ علاقہ کے بڑے شہر مساگا پر قبضہ کر سکے۔ شہر کے باشندوں نے پہلے تو پامردی سے مقابلہ کر کے حملہ آوروں کو پسپا کر دیا لیکن پھر وہ اپنے بادشاہ کی موت اور حملہ آوروں کی بہتر جنگی حکمت عملی کے سبب اُن سے صلح کرنے پر مجبور ہو گئے۔ مساگا کی فتح کے بعد سکندر نے اپنے ایک جنرل کو بازیرہ اور تین کو ایک اور شہر اُورا پر قبضہ کے لئے بھیجا اور ان کو ہدایت کی کہ اُس کی آمد تک ان کے گرد فصیل بنائی جائے۔ سکندر بذات خود اُورا کی طرف بڑھا اور بازیرہ کے لئے کائنوس کو ہدایت بھیجیں۔ دونوں شہروں نے حتیٰ الوسع حملہ آوروں کا مقابلہ کیا لیکن وہ ان کو بچا نہیں سکے۔ سکندر نے مساگا اور اُورا کو اردگرد کے اضلاع پر قبضہ کے لئے مضبوط مرکز کی طرح استعمال کیا۔ اس دوران بازیرہ کے دفاع کو بھی مضبوط کیا۔ پھر یہاں سے وہ انڈیا کی مہم پر روانہ ہوا۔ قدیم ماخذ میں ان تینوں شہروں اور اورناس پہاڑی کے محل وقوع کے بارے میں کوئی قابل بھروسہ تفصیل نہیں ہے اور نہ ہی مؤرخ اُن کے سلسلہ میں کسی بات پر متفق ہوئے ہیں۔ بہر حال ایک عمومی خیال یہ ہے کہ بازیرہ بریکوٹ ہے اور اُورا اوڈی گرام۔

یہاں کے باشندوں نے اس غیر ملکی غلبہ کو ہرگز پسند نہیں کیا اور جب سکندر ابھی پنجاب کے دریاؤں کے پاس خیمہ گزیں تھا وہ بے خوف ہو کر آمادۂ بغاوت ہو گئے لیکن اس بات کا صحیح اندازہ لگانا مشکل ہے کہ یہاں کے لوگ سکندر کے رخصت ہونے کے ساتھ ہی یونانیوں کی عمل داری سے آزاد ہوئے یا اس آزادی کے حصول میں انہیں اور زیادہ وقت لگا۔

یونانیوں کے زوال اور 321 قبل مسیح میں چندر گپت موریہ کے برسر اقتدار آتے ہی اس علاقہ میں موریہ

خاندان کا عروج شروع ہوا۔ اس بات کا کوئی ریکارڈ بہ ہر حال موجود نہیں ہے کہ سوات کب اس خاندان کے زیرِ نگیں آیا اور کب تک ان کی حکومت یہاں قائم رہی۔ تاہم ہیون سانگ راجہ اشوک کے بنائے ہوئے ایک اسٹوپا کے بارے میں بتاتا ہے جسے لو۔ ہی۔ تا۔ کیا (روہی تا کیا) کا نام دیتا ہے۔ اور جو قصبہ منگلی سے پچاس لی مغرب میں ہے۔ اس سے اس علاقہ میں اشوک کے اقتدار یا کم از کم اثرات کا پتہ چلتا ہے۔

اشوک کا عہد سوات میں ایک انقلابی تبدیلی کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ اشوک نے جو کہ چندر گپت کا نواسا تھا اور موریہ خاندان کا انتہائی طاقتور حکمران تھا بدھ مت کو قبول کرلیا۔ وہ اس مذہب کا ایک خاموش پیرو کار نہیں تھا بلکہ اُس نے بدھ مت کو ہر طرف پھیلانے کا تہیہ کر کے خود کو اس کا بہت بڑا چیمپئن ثابت کیا۔ اس مقصد کے لئے اُس نے جو لائحہ عمل اختیار کیا وہ کامیاب رہا۔ اور نہ صرف یہ کہ بدھ مت اُس کی اپنی سلطنت میں ایک غالب مذہب بن گیا بلکہ اُس کی حدود سلطنت سے باہر بھی وہ کئی علاقوں میں پھیل گیا۔ اس طرح بدھ مت سوات میں بھی پھیل گیا اور یہ سرزمین اُسے اتنی راس آئی کہ یہ اُس کا بہت بڑا مرکز بن گیا۔ یہ مذہب یہاں خوب پھلا پھولا۔ اس کے آثار یہاں ہر جانب ملتے ہیں۔ پہلا مشہور چینی زائر فاہین جو 403 عیسوی میں یہاں آیا کہتا ہے کہ یہاں بدھ مت کا قانون چلتا ہے۔ تقریباً ایک سو پندرہ سال بعد یہاں آنے والا دوسرا مشہور چینی زائر سنگ یون بتاتا ہے کہ یہاں کے بادشاہ کے بدھ مت کے اصولوں پر سختی سے کاربند ہونے کی وجہ سے ہر طرف اسی مذہب کا چرچا ہے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے اثر و رسوخ میں کمی آتی چلی گئی۔ اس لئے جب 630ء میں ایک اور چینی زائر ہیون سانگ یہاں آیا تو اُس نے بدھ مت کو زوال پذیر پایا۔ وہ بتاتا ہے۔

> ''دریائے سو۔ پو۔ فا۔ سو۔ تو کے دونوں جانب کوئی چودہ سو قدیم خانقاہیں ہیں لیکن ان میں سے بیشتر اب ویران و اُجاڑ پڑی ہیں۔ کسی زمانے میں ان میں کوئی اٹھارہ ہزار کے قریب بدھ بھکشو ہوا کرتے تھے۔ جو کم ہوتے ہوتے صرف چند ہی رہ گئے ہیں۔''

اپنی پرہیزگاری کے باوجود سوات کے بھکشو جادو کی طرف مائل تھے۔ جس میں روز افزوں اضافہ ہوتا رہا۔ اس لئے اس ملک پر 'وجرایان' کو غلبہ حاصل ہوگیا۔ جس سے قدیم اعتقادات کے لئے راستہ کھل گیا۔ اور بھوت پریت جیسے خوفناک وجودوں پر اعتقاد کا دور دورہ پھر آغاز ہوگیا۔ وہ خوفناک رسوم جن کے لئے سوات اپنی ابتدائی تاریخ سے مشہور تھا۔

سوات میں ہند یونان، اور ہند توران دور کے جو سکے ملے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ یا تو یہ علاقہ بلاواسطہ ہند یونانی (وہ یونانی حکمران جو موریہ خاندان کے زوال کے بعد مختلف جگہوں پر اپنی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے) یا تورانی حاکموں کے قبضہ میں ہے یا اس کے اُن سے ثقافتی اور اقتصادی روابط رہے ہیں۔ وادئ سوات

مینندر کے قبضہ میں رہا جو کہ ہندی یونانی تھا۔ بعد میں یہ علاقہ ایک اور ذیلی بادشاہ اینٹی میکسس دوم کے حوالہ کر دیا گیا۔ مینندر کی موت کے بعد اُس کی بیوی اگاتھوکلیا یہاں کی حکمران بن گئی۔ بعد میں اُس نے اپنے بیٹے کو بھی اقتدار میں شریک کر لیا تاکہ اینٹی میکسس دوم کی طاقت کا توڑ کیا جا سکے۔ جس نے غزنی کے قریب اراکوشیا میں اپنی آزادی کا اعلان کر دیا تھا۔ ڈائیوڈوٹس کے اور بھی وارث تھے۔ اس لئے اُس نے اپنے ہی خاندان کے ایک فرد زائی لس اول کو وادیٔ سوات میں ذیلی بادشاہ مقرر کر دیا۔ اُس نے کچھ مختصر عرصہ کے لئے یہاں پر حکومت کی لیکن پھر اینٹی میکسس دوم کی وفات کے بعد اُسے اراکوشیا پر دوبارہ قبضہ کے لئے وہاں بھیج دیا گیا۔ زائی لس اول کے بعد سوات کے ذیلی بادشاہوں میں سے سب سے مشہور اپالوڈوٹس ہے جسے ساکا سردار مایوس نے بے دخل کر دیا۔ ایلی بالا کے ایک اور تورانی قبیلہ سائی نے بھی (جو جیکسارٹس اور اُس کے مغرب میں واقع علاقہ کے تورانیوں سے مختلف تھا) سوات اور اُس کے گرد و پیش کے علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ 100 قبل مسیح کے فوری بعد ہندوستان کے پہلے مشہور ساکا بادشاہ مایوس نے وادیٔ سوات اور گندھارا میں ہند یونانی حکمرانوں کی پیروی کرتے ہوئے اپالوڈوٹس کو حکمرانی سے بے دخل کر دیا۔

وسطی ایشیا کے ایک خانہ بدوش کشان نسل کے سربراہ کڈ پیس اول نے دریائے کابل تک کے بہت سے علاقوں پر قبضہ کر کے اُن پر اپنی حکومت قائم کی۔ اس خاندان کے دورِ حکومت میں اس بات کا صحیح اندازہ لگانا مشکل ہے کہ آیا سوات بھی اس کشان سلطنت کا حصہ تھا یا یہ کہ یہ اپنی آزاد حیثیت برقرار رکھنے میں کامیاب رہا تھا۔ زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ یہاں کے کمزور سرداروں نے اس سلطنت کے سایہ عاطفت میں رہنا قبول کیا ہوگا۔

قریباً 745 عیسوی میں جب کابل کی ترکی شاہی حکومت کی سرحدیں سیستان کی سرحد سے شمالی پنجاب تک پھیلادی گئیں تو اس عمل میں سوات بھی اس کا ایک حصہ بنا دیا گیا۔ یعقوب بن لیث نے 870ء میں اس ترکی شاہی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ اس کے بعد ہندو شاہی خاندان کی حکومت قائم ہوئی اور وقت کے ساتھ ساتھ اُس نے اپنی حدود میں توسیع جاری رکھی۔ اس عہد میں سوات کے بارے میں معلومات خاصی کم ہیں۔ پھر بھی بریکوٹ کے شمال میں ایک پہاڑی پر کندہ تحریر جس کا تعلق جے پال دیو کے عہد حکومت سے ہے، سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ سوات کا علاقہ کسی نہ کسی طرح سے اس ہندو شاہی حکومت کے زیرِ تسلط ضرور تھا۔ جب یہ ہندو شاہی حکومت محمود غزنوی کی زیرِ قیادت مسلمانوں کے ہاتھوں اختتام پذیر ہوئی تو سوات بھی بچ نہیں سکا۔ راجہ جے پال کو شکست دے کر مسلمانوں نے غالباً 1001۔1002ء کے قریب سوات پر حملہ کیا اور اُس وقت کے حکمران راجہ کے اوڈیگرام قلعہ کا محاصرہ کر دیا۔ اس محاصرہ کے بارے میں ایک رومانوی کہانی مشہور ہے کہ جب یہ قلعہ پے در پے حملوں میں بھی فتح نہ ہو سکا تو راجہ کی بیٹی نے جو محمود غزنوی کے ایک جرنل کی محبت میں گرفتار تھی، اُس خفیہ جگہ کا پتہ بتا دیا جہاں سے اس قلعہ کو پانی فراہم کیا جاتا تھا۔ قلعہ کا پانی بند کر کے راجہ کی فوج کو لڑنے پر مجبور کر دیا گیا۔ ایک غلط تاثر یہ پایا جاتا ہے کہ محمود غزنوی اپنی مہمات

کے دوران بذاتِ خود سوات آیا تھا۔ اس ضمن میں کئی ایک غیر مصدقہ حکایات بیان کی جاتی ہیں۔

وادیٔ سوات پر قبضہ کے بعد مختلف افغان قبائل کے لوگ یہاں آ کر آباد ہو گئے۔ انہیں سواتی پختون کہا جانے لگا۔ تاہم یہاں اُن کی طویل حکمرانی کے بارے میں معلومات ناکافی ہیں۔ عملاً یہ لوگ افغانستان اور ہندوستان میں قائم ہونے والی مسلم حکومتوں کے اثر ورسوخ سے آزاد رہے۔

سوات کی تاریخ میں سولہویں صدی عیسوی ایک فیصلہ کن تبدیلی لے آئی جب یوسف زئی افغانوں نے اس علاقہ پر قبضہ کر لیا۔ اُس وقت سوات سواتی پختونوں کے قبضہ میں تھا۔ سلطان اویس ان کا حکمران تھا۔ حالانکہ نئے آنے والوں نے شادی بیاہ کے بندھنوں کے ذریعے سلطان کے ساتھ رشتہ داریاں قائم کیں لیکن دراصل وہ وادی پر قبضہ کے عزائم رکھتے تھے۔ اس صدی کے پہلے رُبع میں سواتی پختونوں کی دفاعی کوششوں کو ناکام بناتے ہوئے وہ سوات زیریں پر قابض ہو گئے۔ ان کی پیش قدمی اس کے بعد رک گئی۔ انہوں نے دوبارہ پیش قدمی مغل بادشاہ ہمایوں کے دور میں کی، جو بابر کا بیٹا تھا۔ سلطان اویس اور اُن کے ساتھ دیگر سواتی پختونوں کو سوات بالا کا علاقہ چھوڑ دینا پڑا اور یوسف زئی اُس پر بھی قابض ہو گئے۔ اگرچہ انہوں نے سوات کوہستان کے پہاڑی علاقوں کو نہیں چھیڑا لیکن وادی کے قریب واقع دیگر علاقوں جیسے غوربند، کانڑا، چکیسر اور پورن تک انہوں نے اپنے قبضہ کو توسیع دی۔

جس دوران یوسف زئی سوات میں پاؤں جما رہے تھے، بابر کابل پر قابض ہو گیا تھا۔ چونکہ ہندستان جانے کا ایک راستہ سوات کے یوسف زئی علاقہ میں سے گزرتا تھا اس لئے بابر اوران میں ٹکراؤ لازمی اَمر تھا۔ بابر نے سوات کی راہ لی اور پنج کوڑہ اور جندول و باجوڑ کے مشترکہ پانیوں کے بیچ میں پڑاؤ کیا۔ وہاں اُس نے سوات کی طرف فوجی پیش قدمی روک دی اور سفارتی حکمت عملی سے کام لیتے ہوئے باجوڑ کے راستہ اشنغر نکل گیا۔ سوات کے یوسف زئی بابر، کامران اور ہمایوں کے عہدِ حکمرانی میں اپنی آزادی برقرار رکھنے میں کامیاب رہے۔ اکبر کے عہد تک مغلوں نے سوات سے کوئی تعارض نہیں کیا۔ اکبر 1556ء میں تخت نشین ہوا اور 1585ء میں اُس نے ایک فوج کشمیر کی طرف روانہ کی اور دوسری فوج زین خان کوکہ کی قیادت میں باجوڑ اور سوات فتح کرنے کے لئے بھیجی۔ یہاں مغل فوج کو سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا اور سخت مشکلات سے دوچار ہوئی۔ زین خان نے کمک طلب کی اور یہ کمک راجہ بیربل اور حکیم ابوالفتح کی کمان میں بمشکل سوات میں داخل ہوئی۔ چک درہ میں ٹھہر کر انہوں نے ایک قلعہ کی بنیاد ڈالی۔ وہاں سے اس مشترک فوج نے بونیر پر چڑھائی کی لیکن کڑاکڑ کے ایک تنگ راستہ میں مغل فوج تباہی سے دوچار ہوئی۔ راجہ بیربل اپنی آٹھ ہزار فوج کے ہمراہ مارا گیا۔ پھر انہوں نے زین خان کی زیرِ قیادت ایک اور کوشش کی اور باجوڑ اور سوات کے علاقوں میں 1587ء سے 1592ء تک لڑائی جاری رہی لیکن کوئی حقیقی دیرپا فتح حاصل نہیں کی جا سکی۔

جہانگیر اور شاہ جہان نے سوات کو نظرانداز کیا۔ 1667ء میں سوات کے یوسف زئی مغلوں سے برسر

پکارا اپنے بھائیوں کی مدد کے لئے نیچے میدانی علاقوں میں آئے۔ اس کے جواب میں مغل سپہ سالار سوات میں داخل ہوا اور ایک گاؤں کو تاراج کر کے جلد ہی واپس لوٹ گیا۔ سواتی یوسف زئی مغل عہد حکومت میں اپنی آزاد حیثیت برقرار رکھنے میں کامیاب ہوئے۔ بلکہ درانیوں اور سکھوں کے ہاتھوں بھی ان کو کچھ خاص گزند نہیں پہنچی۔

انگریزوں کی طرف سے پنجاب کے الحاق اور پشاور پر قبضہ کے بعد سوات کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز ہو گیا۔ سوات آزاد رہا اور برطانیہ کے زیر قبضہ علاقوں سے بھاگ کر آنے والے مفروروں، پناہ گزینوں اور انگریز استعمار کے مخالفین کے لئے ایک پناہ گاہ بن گیا بلکہ برطانیہ مخالف جذبات کا ایک مرکز بن گیا۔ برطانوی قبضہ میں رہنے والے پختونوں کو سوات کی طرف سے قابض قوت کے خلاف اٹھنے کی مسلسل ترغیب ملتی رہی۔

سوات کی تاریخ میں بہت ہی اہم واقعہ یہاں 1849ء میں ایک باقاعدہ حکومت کا قیام ہے۔ اپنی آزادی کو برقرار رکھنے کے متمنی سواتی سردار اپنی دہلیز پر انگریز قوت دیکھ کر خوف محسوس کرنے لگے۔ انہوں نے آپس میں جرگے منعقد کئے اور سید اکبر شاہ کو سوات کا بادشاہ مقرر کر دیا گیا۔ 11 مئی 1857 تک وہ حکمران رہا۔

ہندوستان میں انگریز تسلط سے آزادی حاصل کرنے کی اس تحریک کا یہ سال سوات میں بغیر کسی ہل چل کے گذر گیا۔ سید اکبر شاہ کی وفات سے سوات ایک قسم کی خانہ جنگی میں مبتلا ہو گیا اور وہ اس جنگ آزادی سے بالکل لاتعلق ہو کر اپنے ہی معاملات میں الجھا رہا۔ اخوند آف سوات نے اُس وقت جو رویہ اختیار کیا اُس سے بھی اس استعماری طاقت کو فائدہ پہنچا۔

1857ء کے بعد 1863ء کی امبیلہ مہم تک سواتیوں کا انگریزوں سے کوئی آمنا سامنا نہیں ہوا۔ اس مہم میں انگریز امبیلہ درّہ سے ہو کر بونیر ملکا میں قائم سید احمد شہید بریلوی کے پیروکاروں کی کالونی کو تباہ کرنا چاہتے تھے لیکن ان کی پیش قدمی کو روک دیا گیا اور بونیر اور سوات کے قبائل یک جا ہو گئے۔ استعماری حکومت نے اس مہم کو 15 نومبر 1863ء تک مکمل کرنے کا فرمان جاری کیا لیکن اسے سرحد سے مزید فوجی کمک کے لئے تار پر تار آتے رہے۔ قبائل کی ایک متحدہ قوت نے دو ماہ تک برطانوی افواج کو روکے رکھا۔ استعماری طاقت نے فوجی لحاظ سے ناکامی کے بعد سفارتی کامیابی حاصل کی اور ایک عارضی جنگ بندی کے ذریعہ قبائل کو منتشر کر دیا گیا۔

امبیلہ مہم کے بعد سواتی پُر امن رہے اور 12 جنوری 1877 تک اخوند آف سوات کی وفات تک انہوں نے برطانوی حکومت سے الجھنے کی کوئی کوشش نہیں کی اور اُن سے بنائے رکھنے کی اخوند کی رائے کا احترام کیا جاتا رہا۔ حالانکہ اس دوران اس کے برخلاف کرنے کے لئے شدید دباؤ رہا۔ 1895ء میں کچھ اندرونی واقعات اُس وقت سواتیوں اور برطانوی فوج کے درمیان شدید جھڑپوں کا باعث بنے، جب سواتیوں نے اپنے علاقہ سے چترال جانے والی انگریز فوج کا راستہ روکا۔ جو جندول کے عمرا خان کے خلاف کارروائی کے لئے جا رہی تھی۔ عمرا خان نے چترال،

کمَت، پشاور اور اسمار باونڈری مشن کے برطانوی حکام کی تنبیہات اور مشوروں کو یک سر نظرانداز کیا۔اس پر پشاور میں اعلیٰ انگریز حکام میجر جنرل سر رابرٹ لو کی قیادت میں آرمی کے فرسٹ ڈویژن کو چترال ریلیف فورس کے نام سے حرکت میں لائے جو پندرہ ہزار کی نفری پر مشتمل تھی۔

ایک اعلان کے ذریعہ قبائل کو اُن کے علاقہ سے گذرنے والی فوج کو متحرک کرنے کے اسباب بتائے گئے اور ان کو یقین دلایا گیا کہ اگر وہ غیر جانب دار رہے تو انہیں اور ان کی املاک کو کوئی گزند نہیں پہنچایا جائے گا۔اور یہ کہ انگریز حکومت ان کے علاقوں کو اپنی سلطنت میں ضم کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔اس اعلان کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے سواتیوں نے اُن تینوں دروں کو جن کے ذریعہ چترال جانے کے لئے انگریز فوج سوات میں داخل ہوسکتی تھی بند کر دیا۔

چترال ریلیف فورس یکم اپریل 1895ء کو نوشہرہ سے روانہ ہوئی۔جنگی حکمت عملی کے تحت دشمن کو تذبذب میں مبتلا رکھنے اور انہیں تقسیم کرنے کے لئے مورہ اور شاہ کوٹ کے دروں پر حملوں کا ڈراوا دینے کی چال چلی، لیکن اصل حملہ ملاکنڈ کے درہ سے کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔یہ وہی حکمت عملی تھی جو یوسف زئی قبائل نے چار سو سال قبل سوات کا دفاع کرنے والوں کے خلاف اختیار کی تھی۔تین اپریل کو حملہ کا آغاز ہوا۔قبائلی جن کی اکثریت غیر مسلح تھی پوری طرح مسلح اور منظم انگریز فوج سے انتہائی بے جگری سے لڑے۔انہوں نے اپنی مزاحمت جاری رکھی اور چار دن تک اُس وقت کی دنیا کی سب سے بڑی طاقت کی پیش قدمی کو روکے رکھا۔بالآخر برطانوی فوج اپنی کوشش میں کامیاب ہوئی اور اکبر کے سالار زین خان کی فوج کے بعد پہلی بار ایک جم غفیر وادیٔ سوات کی سرسبز و شاداب پٹی میں جنوب کی طرف سے داخل ہوا۔ملاکنڈ اور چک درہ میں انہوں نے قلعے بنائے۔دیر اور سوات کی ایک پولیٹیکل ایجنسی قائم کی گئی جس کا صدر مقام ملاکنڈ قرار پایا اور اسے تزویری اہمیت کی وجہ سے بلاواسطہ برطانوی ہندوستانی حکومت کے کنٹرول میں دے دیا گیا۔

عمرا خان آف جندول کے فرار کے بعد انگریز حکومت نے خان آف دیر شریف خان کو اُس کی خدمات کے عوض بحال کیا۔چوں کہ اُس نے اس جنگ میں ان کی حمایت کی تھی اور مدد فراہم کی تھی اس لئے عمرا خان کے زیر قبضہ سارے علاقے بھی اُس کے حوالے کر دیئے گئے اور جولائی 1897ء میں اُس کے منصب میں اضافہ کر کے اُسے نواب آف دیر تسلیم کر لیا گیا۔استعماری حکومت کے سرکاری ریکارڈ میں تحریر کیا گیا:'نئے انتظامات اطمینان بخش دکھائی دیتے ہیں۔تجارتی سرگرمیاں بڑھی ہیں اور حکومت کے خلاف لوگوں کے دل میں پیدا ہونے والی دشمنی بھی جلد ختم ہوگئی۔'

تاہم لوگوں کے دل جیتنا آسان نہ تھا، جو اس استعماری طاقت کی موجودگی کو ایک مشترکہ خطرہ سمجھتے تھے۔مخالفانہ جذبات بڑھتے رہے اور بہ مشکل دو سال بعد انگریزوں کے خلاف سب سے خوفناک بغاوت بپا ہوگئی۔اگر

سارے صوبہ سرحد کی سطح پر رکھ کر بھی اس کو دیکھا جائے تو اس کے خوفناک ہونے کے درجہ کو گھٹایا نہیں جا سکے گا۔ صرف سوات ہی نہیں بلکہ برطانوی سلطنت کے شمال مغربی سرحد کے سب قبائل میں وسیع پیانے پر بے چینی پھیل گئی۔ اس دوران جولائی 1897ء میں سوات بالا میں سرتور فقیر نمودار ہوا۔ اس نے دعویٰ کیا کہ انگریزوں کو صرف ملاکنڈ نہیں بلکہ پشاور سے نکال کر دم لے گا۔

شروع میں تو انگریزوں نے اس نئی تحریک کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی لیکن جولائی کے اختتام تک حالات کی نزاکت کو مزید نظرانداز کرنا ممکن نہیں رہا۔ علاقہ کے قریب تعینات افواج کو چوکس کر دیا گیا تاکہ کم سے کم وقت میں ان کو حرکت میں لایا جاسکے اور 26 جولائی 1897ء کو مردان سے گائیڈز بلا لئے گئے۔

اس دن سرتور فقیر نے لنڈاکے سے ملاکنڈ اور چک درہ کی طرف پیش قدمی کا آغاز کیا۔ سوات بالا، بونیر، اتمان خیل علاقہ بلکہ دور دراز سے لوگ ہزاروں کی تعداد میں اُس کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے۔ جب کہ دوسری جانب گائیڈز 27 جولائی کو مردان سے ملاکنڈ پہنچے۔ 28 جولائی کو انڈیا میں مزید فوج کو حرکت میں لایا گیا۔ دونوں مقامات پر گھمسان کا رن پڑا۔ یکم اگست کو ملاکنڈ فوجی کمک پہنچی اور اُس کے دوسرے دن چک درہ۔ 5 یوں دونوں کو بچالیا گیا۔

بغاوت کی شدت کا احساس کرتے ہوئے گورنر جنرل نے 30 جولائی 1897ء کو ملاکنڈ فیلڈ فورس کی روانگی کی اجازت دی تاکہ وہ ملاکنڈ اور آس پاس کے مورچوں پر قبضہ کو مستحکم کرے اور بغاوت میں ملوث قبائل کو سزا دے۔ اگست 1897ء کی ابتدا میں فوری طور پر ایک ریزرو بریگیڈ کی تشکیل کا بھی فیصلہ کرلیا گیا تاکہ فیلڈ فورس کی مدد جاری رہے۔ اس طرح وادیٔ سوات میں پہلی اور آخری تعزیری مہم کا آغاز کیا گیا۔ انگریز 19 اگست 1897ء کو تینگورہ پہنچے۔ کئی مقامات پر اُنہیں شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا اور بہت جانی نقصان اُٹھایا۔ ایچ۔ ایل۔ ایس۔ میکلین اور لیفٹیننٹ آر۔ ٹی۔ گریوز بھی مارے گئے افسروں میں شامل تھے۔ لنڈاکی کے قریب کوٹہ اور نویکلے کے مقام پر ہونے والی لڑائی کی شدت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ برطانوی حکومت نے اس لڑائی میں شریک لیفٹیننٹ کرنل ایڈمز اور وسکاؤنٹ فنکاسل کو سب سے بڑا فوجی اعزاز 'وکٹوریہ کراس' دیا جب کہ پانچ دیگر کو 'آرڈر آف میرٹ' سے نوازا گیا۔

1897ء کی سواتیوں کی بغاوت نے نہ صرف یہ کہ عظیم برطانوی طاقت کو پورا ایک ہفتہ ایسی جنگ پر مجبور کیا جس میں انتہائی غیر متوقع حالات کا انہیں سامنا کرنا پڑا بلکہ پورے قبائلی علاقوں میں سر اٹھانے والی دیگر بغاوتوں نے اس سال کو جو کہ ملکہ وکٹوریہ کے عہد حکومت کی گولڈن جوبلی تقریبات کا سال تھا، پوری تاریخ ہند میں برطانوی حکومت کے لئے مشکل ترین سالوں میں سے ایک بنادیا۔

ملاکنڈ کی اس جنگ کے بعد کے سالوں میں انگریزوں کے خلاف سوات میں مزید کوئی مسلح جدوجہد نہیں

ہوئی۔ سرتورفقیر نے کئی بار کوشش کی لیکن سوات کے اندر کے گروہی تنازعات، نواب آف دیر کے خلاف مسلسل تناؤ کی کیفیت اور کچھ با اثر اقتدار کے طالب لوگوں کے انگریزوں سے اچھے تعلقات کی وجہ سے اُسے کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ 1915ء میں ریاست سوات کی تشکیل تک حالات جوں کے توں رہے۔ اس کے بعد ایک بار پھر انگریز استعمار کے خلاف مزاحمت کی ایک اور ناکام کوشش ہوئی۔

نوٹس

1. اس نکتہ کی مزید وضاحت چینی سیاح ہیون سانگ کے اس بیان سے بھی ہو جاتی ہے جس میں وہ کہتا ہے کہ 'یہاں اونچی سنگلاخ چٹانیں، گہرے غار، پرسکون ندیاں ہیں جو وادیوں میں اٹھکھیلیاں کرتی گزرتی ہیں۔ بعض اوقات انسانی آوازیں بھی سنائی دیتی ہیں۔ جب کہ کبھی میٹھی مدھر تانیں کانوں سے ٹکراتی ہیں۔' ہیون سانگ، *چائینیز اکاؤنٹس آف انڈیا، ٹرانسلیٹیڈ فرام دی چائینیز آف ہیون سانگ*، ترجمہ و توضیح از سموئیل بیل، جلد دوم، نیا ایڈیشن (کلکتہ، سوسل گپتا (انڈیا) لمیٹڈ 1958ء)، صفحہ 169۔

2. عبدالرحمن، 'اپچیسیئی آف دی ہندو شاہیز'، *جنرل آف دی پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی* (کراچی)، جلد 51 (جولائی۔ ستمبر 2003)، صفحہ 10 نوٹ 23۔ ڈاکٹر محمد فاروق سواتی بھی کہتے ہیں کہ اب بعض محققین نے یہ سوچنا شروع کیا ہے کہ اودھیانہ کا مطلب ہے اوڈیان کا مسکن جو کہ ایک قبیلہ یا نسلی گروہ ہے (ڈاکٹر محمد فاروق سواتی نے 20 نومبر 2000ء کو یہ بات آرکیالوجی ڈیپارٹمنٹ، یونیورسٹی آف پشاور، میں مصنف کو زبانی طور پر گفتگو کے دوران بتائی)۔

3. دیگر فطری جغرافیائی خصوصیات کی طرح پہاڑی درے بھی کسی علاقہ کی تاریخ کو ایک خاص سانچہ میں ڈھالنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ان کے ذریعہ لوگوں کی مسلسل آمدورفت سے نہ صرف طرز زندگی کی تنہائی ختم ہوتی ہے بلکہ اس سے انسانی ذہن کے سیاسی افق کھلتے ہیں۔ جس سے دوسری ثقافتوں کو سمجھنے میں اُسے مدد ملتی ہے۔ اُس خطہ میں جہاں اب افغانستان اور پاکستان واقع ہیں لڑی جانے والی جنگیں صرف اس علاقہ پر قبضہ کی تمہیدی کارروائیاں نہیں تھیں بلکہ وہ پورے برصغیر کو زیرنگیں کرنے کا نقطۂ آغاز ثابت ہوئیں۔ اس لئے کہ ان دروں پر قابض ہونے والوں کو اپنے مخالفین پر ایک قسم کی فوقیت حاصل ہوگئی (ایچ۔ سی۔ ورما، *میڈیول روٹس ٹو انڈیا: بغداد ٹو دہلی؛ اے سٹڈی آف ٹریڈ اینڈ ملٹری روٹس*. لاہور: بک ٹریڈرز، تاریخ ندارد، صفحہ 261)۔ حتیٰ کہ اس دور میں جب کہ ٹیکنالوجی نے اتنی ترقی کر لی ہے، دروں پر قبضہ کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ انڈیا کے ساتھ ہونے والی کارگل کے المیہ (1999ء) اور دہشت گردی کے خلاف جاری نام نہاد جنگ میں افغانستان کو پاکستان سے ملانے والے دروں کی اہمیت اس بات کا واضح ثبوت ہے۔

4. دیگر پختونوں کی طرح اکوزئی یوسف زیوں کا بھی یہ دعویٰ ہے کہ اُن کا شجرہ نسب بنی اسرائیل کے ایک بادشاہ طالوت سے ملتا ہے۔ اس ضمن میں سلسلۂ نسب کی جدولیں پیش کی گئی ہیں لیکن موجودہ دور کے کچھ مصنفین نے اس پر سوالیہ نشان لگایا ہے۔

انہوں نے بنی اسرائیل سے تعلق والے نظریہ کے علاوہ آریائی نسل والا نظریہ۔ مخلوط نسل والا نظریہ، یونانی سلسلہ نسب والا نظریہ، اور بنوقطورہ سے تعلق والا نظریہ پیش کیا ہے۔ اس سلسلہ میں خوشحال خان خٹک کا اپنا الگ ایک نظریہ ہے۔ علم الانساب کی اہمیت اور پٹھان، افغان اور ملک جیسے الفاظ کی وضاحت پر بحث کرتے ہوئے سترھویں صدی میں خوشحال خٹک نے یہ دعویٰ کیا کہ پختونوں/افغانوں/پٹھانوں کی اصل کے بارے میں موجود نظریات کا انہوں نے اچھی طرح بہ غور جائزہ لیا ہے مزید یہ کہ ان سے زیادہ کسی نے اس موضوع پر تحقیق نہیں کی ہوگی۔ پھر وہ قطعیت کے ساتھ کہتے ہیں کہ یہ لوگ حضرت یعقوب علیہ السلام کی جگہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ایک بھائی کی نسل سے ہیں۔ یہ بالعموم تسلیم شدہ نظریہ کے برعکس بات ہے۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ اس موضوع پر لکھنے والوں نے خوشحال خان خٹک کے دعویٰ کو سرتاسر نظر انداز کیا ہے۔

5. امپیریل گزیٹیئر آف انڈیا، پروونشل سیریز، نارتھ ویسٹ فرنٹیئر پروونس، ریپرنٹ (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 1991)، صفحہ 23۔

یہ ونسٹن چرچل جو کہ بعد میں برطانیہ کے مشہور زمانہ وزیراعظم بنے، کے بارے میں پائے جانے والے اس عام خیال کو غلط قرار دینے کا انتہائی مناسب موقع ہے کہ وہ بذاتِ خود ملاکنڈ کی جنگ میں شریک تھے۔ درست بات یہ ہے کہ اس جنگ کے دوران وہ انڈیا میں موجود نہیں تھے۔ وہ کہیں بعد میں ملاکنڈ فیلڈ فورس میں شامل ہوئے۔ وہ بھی ایک فوجی نہیں بلکہ نامہ نگار کی حیثیت سے، اس لئے کہ سر بنڈن بلڈ کے عملہ میں ان کے لئے کوئی اسامی خالی نہیں تھی۔ اس فورس کے کمانڈر بنڈن بلڈ نے انہیں ایک نامہ نگار کی حیثیت سے ملاکنڈ آنے کے لئے کہا۔ نتیجتاً چرچل کی ماں لیڈی رینڈولف چرچل نے ڈیلی ٹیلیگراف کے ایڈیٹر سے کہہ کے یہ انتظام کرایا کہ وہ اُس کی تحریر کردہ رپورٹوں کو فی کالم 5 پونڈ ادائیگی کر کے شائع کریں گے۔ جان مارش، وی ینگ ونسٹن چرچل (لندن: ورلڈ ڈسٹری بیوٹرز، 1962ء)، صفحات نمبر ۴۷۔۴۸۔ تفصیل کے لئے دیکھیں صفحہ ۴۴ سے ۵۰ تک)۔ وہ بعد میں آ کر ملاکنڈ فیلڈ فورس کے ساتھ رہا لیکن سوات میں اس فورس کی تعزیری مہم کے دوران وہ نامہ نگار کی حیثیت سے بھی اس کے ہمراہ نہیں تھے۔ اس لئے ملاکنڈ جنگ اور اس تعزیری مہم کے بارے میں اُس کی رپورٹیں دوسروں سے سُن کر لکھی گئی ہیں۔ ان کی حیثیت ایک عینی شاہد کی رپورٹ جیسی نہیں ہے۔

تیسرا باب

ریاست کا قیام

یوسف زئی قبائل کو سوات پر قبضہ وغلبہ تو حاصل ہو گیا لیکن وہ یہاں کوئی منظم حکومت قائم نہیں کر سکے۔ ملک احمد یا خان کجو جیسے سرداروں کی سربراہی میں ان کا پرانا قبائلی طرزِ زندگی جاری رہا۔ شیخ ملی سے منسوب ضوابط اور تعزیرات کسی قانونی حکومت کے لئے مطلوبہ معیار سے مطابقت نہیں رکھتیں۔ یہ تو صرف چند اخلاقی، مذہبی اور سماجی معاملات سے متعلق ہیں۔ یہ دعویٰ کہ ملک احمد کو یوسف زئی قبائل نے اپنا حکمران بنالیا' بلا جواز ہے۔ اس لئے کہ اُس کے پاس سربراہِ مملکت کے اختیارات اور طاقت نہیں تھی۔ سردار کے بالاتر ہونے کا دارومدار اُس کی اپنی صلاحیتوں پر تھا۔ وہ معاملات پر اثر انداز تو ہوتا تھا لیکن اختیار واقتدار کا مالک نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے سوات پر قبضہ کے دوران ملک احمد کے بعد یوسف زئی سرداروں میں سے کوئی بھی کسی ممتاز حیثیت کا حامل نہیں بن سکا۔

تاہم اُنہوں نے سماجی تنظیم کی ایسی بنا ڈالی جو چار سو سال تک بغیر رکاوٹ کے کارگر رہی۔ یہاں تک کہ میاں گل عبدالودود نے اقتدار میں آنے کے بعد اُس میں بنیادی قسم کی تبدیلیاں کیں۔ مخدوم تصدق احمد 1950ء کی دہائی میں اس طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے۔

''سرسری نظر ڈالنے والے کو یہ معاشرہ مکمل طور پر بدنظمی اور طوائف الملوکی کا شکار نظر آئے گا۔ اس لئے کہ ہر طرف ایسے پختون سردار بکھرے ہوئے ہیں جو کسی ایک مقتدر قوت کے تابع نہیں۔ وہ ہر دم ایک دوسرے سے برسرِ پیکار اور ایک دوسرے کو طاقت سے محروم کرنے میں لگے ہوئے ہیں لیکن محقق (مخدوم تصدق احمد) کو ایسا لگتا ہے کہ یہ معاشرہ پوری طرح حالات سے مطابقت رکھتا تھا اور وہ چیز جسے ہم آہنگی اور توازن کہتے ہیں، وہ اُسے حاصل ہو چکا تھا۔ دراصل یہ ایک خود ضابطگی والا ایسا نظام تھا جس میں زرعی تقسیم اراضی کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔ یہ نظام اتنے زمانہ تک پختون سرداروں کی مسلسل نبرد آزمائی، برگزیدہ شخصیات کے تقدس اور نچلے گوجر طبقہ کی ماتحتی کی وجہ سے چلتا رہا۔''

یوسف زئی قبضہ کے بعد قائم ہونے والی پہلی ریاست سوات

(1849ء تا 1857ء)

سوات کے یوسف زئی کسی ایک شخص کو اپنا حکمران تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھے۔ وہ اپنے اپنے سرداروں کے زیرِ قیادت دو علیحدہ ڈلوں (دھڑوں) میں بٹے رہے لیکن قومی سطح کے خطرات کے موقع پر وہ آپس کے جھگڑوں، باہمی رقابتوں اور دشمنیوں کو بھول کر مشترک دشمن کا سامنا کرتے۔ ان کی یہ خوبی اُس وقت بھی سامنے آئی جب انگریزوں نے پشاور پر قبضہ کر لیا اور سمہ رانی زئی کے خلاف تعزیری مہموں کے سلسلہ میں سوات کی سرحد تک پہنچ گئے۔

سواتیوں نے اپنی آزادی کو درپیش اس خطرہ کا مثبت جواب دیا اور اپنے دفاع کے لئے وہ کسی ایک ذمہ دار سردار کی قیادت قبول کرنے اور سوات کا ایک بادشاہ نامزد کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ اس منصب کے کئی دعویدار تھے اور خدشہ تھا کہ انتخاب کا یہ مشکل مرحلہ ان میں مستقل پھوٹ ڈالنے کا سبب نہ بن جائے اور وقت کی اہم ترین ضرورت اتحاد کا خواب بکھر نہ جائے لیکن ستھانہ کے سید اکبر شاہ کو بادشاہ مقرر کر کے اس معاملہ کو سلجھا لیا گیا۔ جسے اخوند آف سوات نے ایک طاقت ور، ذہین اور اسلامی اصولوں پر کاربند شخص قرار دیا۔ جسے سید ہونے کی اضافی خوبی بھی حاصل تھی۔

سیّد اکبر شاہ کا سلسلہ نسب سید علی ترمذی المعروف پیر بابا سے ملتا تھا اور وہ سیّد احمد شہید بریلوی کے حامی تھے۔ 1831ء میں بالاکوٹ کے مقام پر سکھوں کے ساتھ ہونے والی لڑائی میں سیّد احمد کی شہادت کے بعد اُن کے بچ جانے والے پیروکاروں کو سیّد اکبر شاہ نے ہی اپنے قلعہ ستھانہ میں گھر فراہم کیا۔ یہی وہ جگہ ہے جس نے ہری سنگھ اور بعد میں رنجیت سنگھ (1824ء) کی طاقت کو للکارا تھا۔

بادشاہ بننے کے بعد سیّد اکبر شاہ نے غالیگے کو صدر مقام بنایا۔ وادیٔ پشاور میں سیّد احمد شہید کی ماتحتی میں انتظام چلانے اور محاصل جمع کرنے کا تجربہ ہونے کی وجہ سے انہوں نے ایک خام قسم کی انتظامی مشینری قائم کر لی۔ جنگی اخراجات پورے کرنے کے لئے انہوں نے محصولات جیسے عشر وغیرہ جمع کرنے شروع کئے۔ جس پر اُن کے بادشاہ بنائے جانے کے وقت اتفاق ہوا تھا۔ جب اُن کا اقتدار مستحکم بنیادوں پر قائم ہوا تو انہوں نے ایک باقاعدہ فوج بنانے کی ٹھانی جو بندوقوں سے مسلح ہو۔ بالآخر وہ 800 سواروں اور تین ہزار پیادہ فوج جمع کرنے میں کامیاب ہوئے جس کے پاس پانچ چھ بندوقیں تھیں۔

سید اکبر شاہ کی مستحکم طاقتور مرکزی حکومت قائم کرنے کی کوشش زیادہ کامیاب نہ ہو سکی۔ اس لئے کہ لوگ چوں کہ ایک طویل عرصہ تک من مانی کرنے، آزادانہ طور طریق سے رہنے اور ایک غیر منظم طرزِ زندگی کے عادی ہو گئے

تھے۔ نئی حکومت کی عائد کردہ پابندیوں اور ضوابط کے مطابق رہنا انہیں مشکل لگا۔' اس لئے 'سوات کی پہلی اسلامی ریاست' سیّد کی اعلیٰ کارکردگی اور ارفع خصوصیات کے باوجود ناکام ہوگئی۔' ان کی خوبیوں کا بہرحال اعتراف کیا گیا۔'

بعض معترضین اُس کے افسروں کی بدانتظامی، فوج میں مقامی افراد کی عدم موجودگی، عام لوگوں سے اُس کے ملازمین کا ظالمانہ اور نامناسب برتاؤ اور خوازہ خیلہ کے ایک اعلیٰ شریف خاندان کی بے عزتی کو اس حکومت کی ناکامی کا سبب گردانتے ہیں۔ مزید برآں اچھے سرکاری عہدوں اور فوجی مناصب پر غیر مقامی لوگوں کی تقرری نے عوام کے دلوں میں ایک مستقل تلخی پیدا کردی تھی۔

سید اکبر شاہ کی اُن مشکلات کا تعلق کسی حد تک معترضین کی ان باتوں سے بھی رہا ہوگا جن کی وجہ سے وہ ایک ایسی منظم اور مستحکم حکومت قائم کرنے میں ناکام رہے جو اُن کی وفات کے بعد بھی چلتی رہتی لیکن اس خیال کی واضح تردید ضروری اور اہم ہے کہ انہیں سوات سے دورانِ حکومت نکال دیا گیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ 11 مئی 1857ء (اپنی وفات) تک سوات کے حکمران رہے اور ان کے وفات کے دن ہی 1857ء کی جنگِ آزادی کی خبر پشاور پہنچی۔

بنیادی حقیقت یہ ہے کہ یہاں کے لوگ کسی باقاعدہ قانون کی پاسداری اور ایک بااختیار حکومت کی اطاعت کے خواہش مند نہیں تھے۔ سرکاری ضوابط کے نفاذ، معائنوں اور پابندیوں کے لئے وہ تیار نہیں تھے اور وہ عشر کی ادائیگی سے بالکل تنگ آگئے تھے۔ خوانین اور سردار اس بات کے لئے ہرگز تیار نہیں تھے کہ اُن کے اوپر کوئی اور بااختیار طاقت ہو جو اُن کی زندگی کے معمولات میں دخل کی مجاز ہو۔ پھر یہ کہ سید اکبر شاہ کی حیثیت اس وجہ سے بھی کمزور تھی کہ غیر مقامی ہونے کی وجہ سے اُن کا سوات میں کوئی ڈلہ (دھڑا) نہیں تھا۔ اس سب پر مُستزاد یہ کہ ان کی حکومت کو یوں تو اخوند آف سوات کی سرپرستی حاصل تھی جن کی حیثیت پوپ سے کم نہیں تھی لیکن پھر اس کی انگریز مخالف پالیسی اور مختلف مذہبی عقائد کی وجہ سے اخوند آف سوات اُن کے خلاف ہوگئے جس سے اُن کی مشکلات بہت بڑھ گئیں۔ مزید برآں یہ کہ ان میں سے کسی ایک کی حیثیت میں استحکام کا لازمی نتیجہ دوسرے کی حیثیت کی کمزوری تھی۔ اس لئے اخوند آف سوات کا اُن کا مخالف ہو جانا لازم تھا۔

میجر راورٹی سید اکبر شاہ کو صحیح معنوں میں سوات کا بادشاہ تسلیم نہیں کرتا۔ اُس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ سید اکبر شاہ کے لئے باچا کے لقب کا استعمال اُن کے بادشاہ ہونے کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ یہ دراصل سیّد ہونے کی وجہ سے ان کے لئے استعمال کیا گیا۔ لیکن راورٹی کا کمزور استدلال اس حقیقت کی مار نہیں سہ سکتا کہ سید اکبر شاہ کو باقاعدہ حکمران تسلیم کرنے کے بعد یہ لقب دیا گیا تھا ورنہ سیّد تو وہ پہلے سے ہی تھے۔

1857ء کے بعد

سید اکبر شاہ کے بعد اُن کا بیٹا سید مبارک علی شاہ تخت نشیں ہوا جو مبارک شاہ کے نام سے زیادہ معروف ہے لیکن چوں کہ سواتی کسی مضبوط حکومت کے ماتحت زندگی گزارنے کے لئے تیار نہیں تھے، اس لئے وہ اُسے بادشاہ تسلیم کرنے میں پس و پیش کر رہے تھے۔

دوسری جانب اخوند آف سوات کو اس بات کا بھی خوف تھا کہ کہیں سید مبارک شاہ سپاہ (وہ ہندوستانی سپاہی جو اپنی بغاوت کی ناکامی کی وجہ سے مردان سے سوات آئے تھے اور مبارک شاہ سے مل گئے تھے) کی مدد سے سوات میں اپنی حیثیت اتنی مضبوط نہ کرلے کہ جس سے اُس کی اپنی پوزیشن کمزور ہو جائے۔ اس کے علاوہ وہ اپنے بڑے بیٹے کو تخت پر بٹھانا چاہتے تھے۔ اس وجہ سے انہوں نے اس سلسلہ میں اپنا مخالفانہ کردار ادا کیا۔ اس پہلو پر اولف کیرو، سرن زیب سواتی اور ضلع پشاور کے گزٹیئر نے روشنی ڈالی ہے۔ بالآخر مبارک شاہ کو چند ماہ کے بعد 55 ویں مقامی انفنٹری کے سپاہیوں کے ساتھ ساتھ اقتدار سے الگ کر کے سوات سے بے دخل کر دیا گیا جس کے نتیجہ میں سوات کی پہلی ریاست اپنے انجام کو پہنچ گئی۔ جہاں تک ان متنازعہ بیانات کا تعلق ہے کہ 1857ء میں سید اکبر شاہ کی وفات کے بعد سیدو بابا (اخوند) نے بذاتِ خود 1877ء میں اپنی وفات تک حکومت کی[1] یا یہ کہ انہوں نے سیدو شریف کو اپنا دارالحکومت بنایا' تاریخی حقائق سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ دراصل اخوند سیاسی منصب کے لئے کوئی دعویٰ پیش کرنے یا خود کوئی دُنیوی عہدہ قبول کرنے کے سلسلہ میں حد درجہ محتاط تھے۔ اور اُن کی زندگی میں ان کا کوئی دُنیوی منصب قبول کرنے کے بارے میں کبھی کوئی سوال پیدا نہیں ہوا۔'

مئی 1871ء اور جون 1875ء میں اخوند نے اپنے بڑے بیٹے (میاں گل عبدالحنان) کو سوات کا بادشاہ منتخب کرانے کی بالواسطہ کوششیں ضرور کیں لیکن ان مواقع پر بھی انہوں نے خود اس کا نام تجویز نہیں کیا۔ اس طرح اخوند اپنی اس کوشش میں ناکام ہوئے۔ وجہ یہ تھی کہ تخت کے اور بھی بہت مضبوط دعوے دار موجود تھے۔' پنجاب اور اُس کے زیرِ نگیں علاقوں کے انتظام و انصرام' کے بارے میں ایک رپورٹ اس بات کی تہہ تک پہنچتے ہوئے بیان کرتی ہے۔

''اخوند کی انتہائی سن رسیدگی اور اُس کی جانشینی کے جھگڑوں نے ملک میں انتشار کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ اہم ترین دعوے دار اخوند کا بیٹا میاں گل اور سوات کے طاقت ور ترین قبائل میں سے ایک کے سردار شیر دل خان ہیں ان کا تعلق رانیزئی سے ہے۔ لوگوں کی ایک بڑی تعداد اُن کے اس دعویٰ کی حمایت کرتی ہے۔''

1877ء کے بعد

سوات کے درباری مؤرخین اوران کے خوشہ چین سوات میں اقتدار کی اس جنگ کو اخوند آف سوات کے خاندان کے افراد کے درمیان جانشینی کا مسئلہ قرار دے کر پیش کرتے ہیں جب کہ حقیقت یہ ہے کہ خان آف دیر رحمت اللہ خان، الہ ڈنڈ کا شیر دل خان اور اخوند کا بڑا بیٹا میاں گل عبدالحنان تینوں سوات کے تخت کے دعوے دار تھے۔ خان آف دیر رحمت اللہ خان ولد غزن خان، شیر دل خان کے حامی تھے۔ اُس وقت سوات میں دو بہت بڑے ڈلے (دھڑے) تھے۔ ان میں سے ایک کی قیادت شیر دل خان کے پاس تھی جو رانی زئی قبیلہ کے سردار تھے (اب ان کا علاقہ ملاکنڈ ایجنسی میں شامل ہے) جب کہ دوسرے کا سربراہ اخوند کا بڑا بیٹا میاں گل عبدالحنان تھا۔ سوات اور اُس اردگرد کے سارے علاقوں کا ہر قبیلہ ان دونوں میں سے کسی ایک کا حامی تھا۔ بابوزئی اور رحمت اللہ خان آف دیر کے طرف داروں کے مقابلہ میں میاں گل کا پلڑہ عموماً بھاری تھا۔

''لیکن اُس کے حامیوں کی بھیڑ نے مقبوضہ دیہاتوں کی عورتوں کے ساتھ جو ناروا زیادتیاں کیں اس کی وجہ سے اُس کی حمایت میں نمایاں کمی آگئی اور خان آف دیر کی مقبولیت میں اضافہ ہوگیا جس نے اکتوبر (1879ء) میں سوات پر حملہ کر دیا لیکن باجوڑ میں حالات خراب ہونے کی وجہ سے اُسے لوٹ جانا پڑا، تاہم سوات کے ادین زئی تپہ میں اپنا اقتدار برقرار رکھنے کے لئے اُس نے ایک آدمی وہاں مقرر کر دیا۔''

اپریل 1880ء میں شیر دل خان کا انتقال ہوگیا اور سوات میں بڑی سیاسی طاقت رحمت اللہ خان، خان آف دیر کے ہاتھ میں آگئی۔ 1881ء کی ابتداء میں سوات کے ادین زئی تپہ کے علاقہ میں تعینات اُس کے نمائندوں کو نکال دیا گیا۔ یہ علاقہ اُس نے 1879ء میں قبضہ کیا تھا۔ لیکن دریائے سوات کے شمال میں جو علاقہ ہے وہاں اُس کا اثر ورسوخ جوں کا توں برقرار رہا۔ رحمت اللہ خان جسے سوات کی سرزمین پر ہمہ وقت برپا گروہی تنازعات و مسائل نے فائدہ پہنچایا 1881ء میں دریا کے دائیں جانب واقع سوات بالا کا حکمران بن گیا۔ اُس کی جاہ طلبی کی تمنا یقیناً پوری ہو جاتی اور پورا سوات اُس کے زیرنگیں آجاتا اگر خان آف باجوڑ اور اپنے ہی بیٹے کے ساتھ اُس کے جھگڑے اُسے اس کامیاب مہم کو بیچ میں ادھورا چھوڑ کر واپس جانے پر مجبور نہ کرتے۔

میاں گل عبدالحنان نے اس جماعتی سیاست میں ایک اہم کردار ادا کرنے کی کوشش کی لیکن

''سوات میں ایک نمایاں سیاسی حیثیت کے حصول کی اُس کی کوششوں کو لوگوں کی مجہول مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ اُس کی طرف سے مقامی قبائلی سرداروں کی حیثیت کو ختم کرنے کی جدوجہد کو حسد اور نفرت سے دیکھ رہے تھے اور انہیں خوف لاحق تھا کہ اگر اُس کا اقتدار قائم ہوگیا تو اُس کا نتیجہ ان لوگوں سے محصولات وصول کرنا ہوگا۔ اس خیال کو یقیناً ایسا لگتا ہے...... خوانین نے ہی پروان چڑھایا ہوگا۔''

میاں گل کا اثر ورسوخ جو کچھ عرصہ سے کم ہوتا ہوا دکھتا تھا اچانک اُس میں اضافہ ہوگیا اور 1882ء کے اختتام تک سوات کے دیگر تمام سرداروں کے مقابلہ میں اُس کی حیثیت بہت مستحکم ہوگئی۔ تاہم وہ ذاتی طور پر لوگوں میں غیر مقبول تھا' جن کے دلوں میں کسی ایک شخص کو مکمل اختیارات سونپنے کے خلاف نفرت موجود تھی۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ سوچتے تھے کہ ایک مستحکم مقتدر حکمران یقیناً محصول لے گا اور زرعی پیداوار پر بھی ٹیکس مانگے گا'۔

اس وقت تک باجوڑ میں عمرا خان کی گرفت مضبوط ہوگئی تھی اور وہ اب سوات میں اقتدار کی جنگ میں شامل ہوگیا۔ 1883ء میں خان آف دیر اور میاں گل کے درمیان سوات میں اقتدار کے حصول کی ایک سرسری سی کشمکش شروع ہوئی۔ مارچ 1884ء میں وہ ایک معاہدہ تک پہنچ گئے۔ میاں گل نے دیر ملیزئی میں رحمت اللہ خان کے اقتدار کو تسلیم کرلیا۔ اس کے بدلہ میں اُس نے وعدہ کیا کہ وہ سوات خاص کے معاملات میں دخل اندازی نہیں کرے گا۔

1884ء سے 1890ء تک وادئ سوات سازشوں اور گروہی جھگڑوں کا مرکز بنا رہا۔ اس کی وجہ عمرا خان آف جندول کی جاہ طلب کارروائیاں تھیں۔ میاں گل کبھی تو خان آف دیر شریف خان کی حمایت کرتا جو کہ اپنے باپ رحمت اللہ خان کی وفات کے بعد اُس کی جگہ لے چکا تھا اور کبھی جندول کے خان کا ساتھ دیتا۔

اس بات کا قوی امکان تھا کہ عبدالحنان کے اقتدار کے دعویٰ کو لوگ تسلیم کر لیتے حالاں کہ وہ اپنے باپ کی صلاحیتوں سے محروم تھا۔ ایک موقع ایسا آیا تھا کہ لگتا تھا کہ سوات کا اقتدار بلا شرکتِ غیرے اُسے مل جائے گا لیکن اُس کی فطری کاہلی آڑے آئی۔ نہ تو وہ اپنی طاقت کو مستحکم کر سکا، نہ عوام سے تعلق کو بہتر بنا سکا۔ اور نہ اپنے حامیوں کی غارت گرانہ عادات کو قابو کر سکا جن کی وجہ سے اُسے کئی مواقع سے ہاتھ دھونا پڑا تھا۔ وہ 1887ء میں انتقال کر گیا۔

برطانوی بھی اقتدار کی جنگ میں کود پڑتے ہیں (1888ء)

میاں گل عبدالحنان کی جگہ اُس کے بھائی میاں گل عبدالخالق نے لی جو دنیوی معاملات سے بالکل لاتعلق تھا۔ اس لئے اب سوات کے اقتدار کے لئے رسہ کشی عمرا خان آف جندول اور شریف خان آف دیر کے درمیان شروع ہوگئی۔ جن دونوں کا تعلق سوات سے نہیں تھا۔ اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے ایک تیسری طاقت یعنی انگریز بھی اس جنگ میں شامل ہوگئے۔ ان سب کے علاوہ 1880ء کی دہائی کی ابتدا میں سوات کے لوگ کابل حکومت کے ارادوں سے بھی خدشات میں مبتلا تھے جو اُن کے کچھ علاقے ہڑپ کرنے کی کوششیں کر چکی تھی۔ 1888ء میں امیر افغانستان کی کارروائیوں کے نتیجہ میں سوات میں پیدا ہونے والی بے چینی کی وجہ سے برطانوی حکومت نے اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے مداخلت کا فیصلہ کیا۔ حالاں کہ وہ ابھی تک باجوڑ، دیر اور سوات کے معاملات میں مداخلت سے گریزاں

تھی۔ برطانوی حکومت کے احتجاج کے بعد امیر افغانستان نے فی الفور تسلیم کیا کہ سوات اُس کے دائرہ عمل سے باہر ہے لیکن باجوڑ اور دیر پر اُس نے اپنے دعویٰ کو واپس نہیں لیا۔ بہر کیف 12 نومبر 1893ء میں ہونے والے ڈیورنڈ لائن کا معاہدہ ہونے تک افغانستان کی سازشیں جاری رہیں۔ اس معاہدہ پر افغانستان کی طرف سے امیر عبدالرحمٰن اور برطانوی حکومت کی جانب سے مارٹیمر ڈیورنڈ نے دستخط کیے۔ اس معاہدہ کی تیسری شق کہتی ہے۔

''برطانوی حکومت اس بات پر اتفاق کرتی ہے کہ اعلیٰ حضرت امیر اسمار اور اُس کے اوپر چنک تک کی وادی کو اپنے قبضہ میں رکھے۔ اس کے بدلہ میں اعلیٰ حضرت نے بھی اس بات سے اتفاق کیا ہے کہ وہ کسی بھی وقت سوات، باجوڑ یا چترال بشمول ارنا وائی اور وادیٔ بشگال میں مداخلت نہیں کرے گا۔''

امیر عبدالرحمٰن خود اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ اُس نے باجوڑ، سوات، بونیر، دیر، چترال اور چلاس پر اپنا دعویٰ واپس لے لیا ہے۔ اس معاہدہ سے سوات پر افغانستان کا دعویٰ اور مستقبل میں اسے ضم کرنے کی کوششیں دم توڑ گئیں۔ دوسری جانب یہاں کے معاملات میں برطانوی اثر ورسوخ بڑھ گیا۔ اس لئے کہ اب سوات بھی اُن علاقوں میں شامل ہو گیا جو ڈیورنڈ لائن کے برطانوی ہند کی طرف واقع تھے۔[2]

گروہی جھگڑے متواتر جاری رہے جس کی وجہ سے اندرونی حالات بے یقینی اور اضطراب کا مظہر بنے رہے۔ ایک موقع پر عمرا خان الہ ڈنڈ ڈھیری اور کچھ دیگر دیہاتوں پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا لیکن پھر اُسے بے دخل کر کے بات چیت پر مجبور کر دیا گیا۔ جب 1889ء میں بہت سے افغان پناہ گزین افغان جنرل فیض محمد خان غلزئی کی سربراہی میں سوات میں آن بسے تو

''سوات کے لوگ اپنے علاقہ کے انتظام کے بارے میں منقسم سوچ رکھتے تھے۔ کچھ ہندوستان میں قائم برطانوی حکومت کی مداخلت کے طالب تھے۔ دوسرے چاہتے تھے کہ پلوسی میں ہندوستان حکومت کے باغیوں کو بلانا چاہئے جب کہ دیگر چاہتے تھے کہ افغان جنرل فیض محمد خان کو سربراہ بنالیا جائے۔ بہرصورت اس بات پر سب متفق تھے کہ عمرا خان کی مخالفت ضروری ہے جس نے تھانہ پر حملہ کی دھمکی دی تھی اور اس بات کا پورا امکان تھا کہ وہ پورے سوات کو تاراج کر ڈالے۔''

برطانوی حکام کی یہ پیش گوئی سچ ثابت ہوئی کہ اخوند آف سوات جسے وہ سوات میں استحکام اور امن وامان کے قیام کے لئے بنیادی ستون قرار دیتے تھے، کی موت برطانوی مفادات کے لئے معاون ثابت ہوگی۔

''انہیں یقین تھا کہ ایک لحاظ سے برطانوی استعمار کے لئے اخوند کی موت فائدہ مند ثابت ہوگی۔ اب سوات باہم دست و گریبان دشمن گروپوں میں بٹ جائے گا اس لئے ہر وقت ان میں سے کوئی نہ کوئی حریفوں کو زیر کرنے کے لئے برطانوی حکومت کا حلیف بننے کے لئے موجود رہے گا۔''

پہلے ہی ان خوانین میں سے بعض نے اپنی ذاتی حیثیت میں ہندوستان کی برطانوی حکومت سے رسمی گفت و شنید کی کوشش کی تھی۔ 1889ء میں پہلی بار سوات کے باشندوں کے ایک حصہ نے برطانوی حکومت سے سوات کے

مسائل میں باقاعدہ مداخلت کی تائید کی۔سوات میں حکومت قائم ہونے سے پہلے اس بے یقینی کی کیفیت میں عمرا خان آف جندول،شریف خان کو دیر سے نکالنے میں کامیاب ہوگیا۔اُس نے سوات بالا میں پناہ لے لی۔دیر پر قبضہ کے بعد عمرا خان اور مضبوط ہوگیا۔اُس نے پہلے ہی انگریز حکومت سے سوات کو اپنے زیر قبضہ علاقہ میں شامل کرنے کے لئے رسمی گفت گو کا آغاز کر دیا تھا۔ برطانوی حکومت کے لئے اپنی وفاداری اور افادیت ثابت کرنے کی امید پر اپنی تیسری تحریری درخواست میں وہ یوں کہتا ہے(یہ درخواست اکتوبر 1888ء میں پیش ہوئی)

''میری کوششوں سے باجوڑ اور سوات کے سارے سردار برطانوی حکومت کے خدمت گار بن جائیں گے۔مناسب یہ ہوگا کہ ان سب کو میرے ماتحت کر دیا جائے۔ان میں سے جو میرا دوست ہوا سے برطانوی حکومت کی طرف سے عزت افزائی حاصل ہو اور جو مجھے ناراض کرے اُس سے ایسا سلوک کیا جائے جیسے اُس نے برطانوی حکومت کو ناراض کر دیا ہو۔''

عمرا خان کمشنر پشاور کو ستمبر 1890ء کے اپنے خط میں بہت ہی بے تکلف ہو کر اپنا مقصد اور خواہش بتا دیتا ہے۔وہ برطانوی حکومت سے کھلی چھوٹ چاہتا تھا۔سوات کے خوانین نے بھی اپنی طرف سے برطانوی حکام سے رابطہ کر کے عمرا خان کے اچانک حملوں اور تجاوزات کے خلاف مدد مانگی۔1892ء میں سوات کے خوانین نے عمرا خان کے حملے بند نہ ہونے کی صورت میں ہندوستانی مجاہدین یا امیر افغانستان سے مدد طلب کرنے کی دھمکی دی۔

برطانوی حکومت کو نہ عمرا خان سے محبت تھی اور نہ ہی انہیں سواتیوں کی کوئی پرواتھی۔انہیں صرف اپنا مفاد عزیز تھا۔مسٹر ڈین سواتیوں کے بارے میں لکھتے ہوئے رقم طراز ہے کہ

''اگر ہم نے سوات کے خوانین کا اعتماد کھو دیا جو کہ عمرا خان کے اس علاقہ پر قبضہ کی صورت میں یقیناً ہم کھو دیں گے تو اس اعتماد کے دوبارہ حصول کا امکان بہت کم رہے گا۔سوات کے حالات سے یہ بات آشکارا ہے۔وہ اپنی آزاد حیثیت برقرار رکھنا چاہتا ہے۔عمرا خان اور امیر آف کابل دونوں سے اُسے خوف لاحق ہے۔سوات کے معاملات میں عمرا خان کی مداخلت کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔اس لئے اس کی آزاد حیثیت کو برقرار رکھا جانا چاہیے۔''

اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے وہ مزید کہتا ہے کہ'فی الوقت عمرا خان سے اس ضمن میں کوئی سلسلہ جنبانی نہیں ہونی چاہئے حتیٰ کہ وہ سوات کے خلاف کوئی جارحیت آغاز کرے۔'سوات کے خوانین کے خط کے جواب میں پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر نے یوں خیال آرائی کی ہے کہ'یہ لوگ صرف یہ چاہتے ہیں کہ ہمیں اپنے خلاف عمرا خان کی مدد سے روکیں یا یہ کہ ہم اس پر اچھی طرح واضح کر دیں کہ سوات کے معاملات سے خود کو بالکل الگ رکھے۔'عمرا خان کے ساتھ مجوزہ معاہدہ کا ذکر کرتے ہوئے کمشنر،پشاور ڈویژن،کہتا ہے کہ

''جہاں تک سوات کا تعلق ہے میرے خیال میں عمرا خان کے ساتھ کوئی ایسا وعدہ کرنا غلط تھا۔اس لئے کہ آنے والے دنوں میں ممکن ہے ہم اپنا اثر ورسوخ اُس وادی تک بڑھانا چاہیں یا یہ کہ اس دوران عمرا خان نے اس پر قبضہ کر لیا ہو اور پھر ہم اُس کو اپنے مفادات کے لئے بطور آلہ کار استعمال کر سکیں۔''

تھانہ کے خوانین کے خط کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتا ہے:

''میں اسے غور کرنے کے قابل نہیں سمجھتا۔ میرا انہیں خیال کہ برطانوی حکومت اس وقت وہاں کے باشندوں کے کہنے پر سوات کو زیر حفاظت علاقہ قرار دینے کے لئے تیار ہے اور یہ بات یقینی ہے کہ عمرا خان اس بات پر شدید ناراض ہوگا اگر ہم اُس علاقہ میں اُسے مداخلت سے روکنے کا کسی کو یقین دہانی کرادیں۔ اس لئے اگر ہم اُس سے دوستانہ تعلقات برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو ایسے رابطوں کو نظر انداز کرنا چاہئے۔ ان کو موقع دیا جانا چاہئے کہ وہ لڑ کر خود ہی اپنے معاملات کو ٹھیک کریں۔''

گورنر جنرل ان کونسل نے اس بات سے اتفاق کیا کہ ڈین کی تجویز قابل عمل نہیں۔ وہ مزید کہتا ہے کہ 'بہتر یہی ہے کہ عمرا خان کو سوات میں مداخلت سے باز رہنے کا مجوزہ انتباہ جاری نہ کیا جائے۔' اس کے خیال میں ایک تو یہ لازم نہیں کہ اس انتباہ کا کوئی اثر ہو اور اس سے یقیناً عمرا خان برطانوی حکومت کے خلاف بہت زیادہ نالاں ہو جائے گا۔ تاہم اُس نے یہ بات اچھی طرح واضح کردی کہ

''جب تک ہماری حکومت کو مداخلت پر مجبور نہ کردیا جائے ہمیں ان رقابتوں اور سازشوں سے بچ کر رہنا چاہئے جو کہ سرحد کے اُس طرف کی زندگی کا لازمی جز ہیں۔ ہندوستان کی حکومت ایک موقع پر عمرا خان کی حوصلہ افزائی پر آمادہ تھی تاکہ امیر افغانستان کو اس پورے علاقہ کو تاخت و تاراج کرنے سے روکا جاسکے۔ وہ مسئلہ بالکل مختلف تھا۔ لیکن اب سواتیوں اور عمرا خان کے درمیان میں حائل ہونا بالکل علیحدہ بات ہے۔''

1893ء میں عمرا خان کو سوات میں کچھ کامیابی حاصل ہوئی لیکن یہاں گروہی تنازعات مزید دو سال تک جاری رہے۔ اُسے سوات میں کچھ زیادہ کامیابی نہیں ملی تھی کہ اُس نے چترال پر حملہ کردیا۔ نتیجتاً اُسے افغانستان فرار ہونا پڑا اور سوات زیریں میں سے انگریزوں کو گزرگاہ مل گئی۔ اس طرح سوات جو کہ 1895ء تک ایک ایسی سرزمین تھی جس پر کسی یورپی باشندے نے قدم نہیں رکھا تھا اور اس داستانی حسن کا کسی یورپی آنکھ نے حظ نہیں اٹھایا تھا۔ اُس کا بند دروازہ برطانویوں کے لئے کھل گیا۔

زیریں وادیٔ سوات کو تھانہ قصبہ تک ایک ڈھیلے ڈھالے برطانوی انتظام کا حصہ بنادیا گیا۔ یہ انتظام بلوچستان اور کُرم میں بہت کامیاب رہا تھا۔ اس سے زیریں سوات سے گذرنے والا پشاور سے چترال جانے والا راستہ محفوظ ہوگیا جس سے چترال میں تعینات فوج تک کمک پہنچانا آسان اور محفوظ ہوگیا۔ تھانہ سے آگے کی وادی اب بھی اپنے قدیمی قبائلی انتشار کا شکار رہی۔

ڈیورنڈ لائن معاہدہ سے سوات تک انگریز حکومت کا اثر ورسوخ پہنچ گیا تھا لیکن وہ براہ راست یہاں کے معاملات میں مداخلت سے پھر بھی گریزاں تھے۔ مقامی سرداروں کے ساتھ ان کے جو تنازعات ہوتے تھے وہ آزادانہ طور پر انہیں نمٹا لیتے تھے۔ 1895ء کی چترال ریلیف مہم کے بہت اہم اور دور رس نتائج نکلے اور مقامی سیاست میں یہ ایک انقلابی موڑ ثابت ہوا۔ باجوڑ اور دیر میں اہم سیاسی عہدوں پر قابض لوگ بدل گئے اور انگریزوں کا

حامی خان آف دیراور اُسی کی طرح کے دیگر خوانین اپنی اپنی حیثیتوں پر بحال کر دیئے گئے۔ انگریز حکومت نے خود کو صرف مقامی سیاست میں مداخلت کرنے کا اہل ثابت نہیں کیا بلکہ مقامی سیاست اور اقتدار کی جنگ میں حصہ دار بن گئی۔

تزویراتی اہمیت

عالمی سطح پر یہاں کی تزویراتی اہمیت کے پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جغرافیائی سیاسی صورت حال میں سوات کا محل وقوع اور حیثیت 1895ء میں بھی واضح ہو کر آئی۔ اگر چہ امبیلہ مہم سے یہ بات بالکل صاف ہو گئی تھی کہ پہاڑوں کے یوسف زئی پردہ شکنی کے خطرہ کے جواب میں کتنی شدید مزاحمت کر سکتے ہیں لیکن چترال ریلیف پہنچانا اشد ضروری تھا۔ اس لئے کہ روس قریب ہی سے اس بات کا بہ غور جائزہ لے رہا تھا۔ گلگت کا راستہ بہت لمبا اور پُر خطر تھا۔ اس لئے پہاڑی یوسف زئی کو ناراض کرنے کا خطرہ مول لینے کے سوا چارہ نہیں تھا۔ اس لئے فیصلہ کیا گیا کہ دو اطراف سے چترال جایا جائے۔ بڑی فوج تو ملاکنڈ کے راستہ سے جائے جب کہ دوسری چھوٹی فوج اور کمک کے لئے گلگت کا راستہ اختیار کیا جائے۔

1878ء کے بعد سے انگریزوں نے مشرقی ہندوکش سلسلہ میں اہم دروں کے قبضہ کے لئے مسلسل رواں لائحہ عمل اختیار کیا۔ سب سے پہلے انہوں نے علاقہ میں اپنا اثر و رسوخ استعمال کرتے ہوئے کشمیر کے مہاراجہ کے ذریعہ گلگت ایجنسی کی تشکیل کی۔ 1892ء میں چترال میں موجود سیاسی انتشار سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے چالٹ اور ہنزہ میں قلعے بنائے۔ چترال کے بیرونی معاملات ہاتھ میں لینے کے بعد وہاں بھی ایک مستقل قلعہ بنایا۔ حتمی طور پر انگریز افواج نے ملاکنڈ اور چکدرہ میں پڑاؤ ڈالا اور 1895ء میں ملاکنڈ سے چترال تک سڑک کی تعمیر کا کام شروع ہوا۔ اس سڑک کو سوات اور دیر میں سے ہو کے گذرنا تھا۔ اس سال دیر اور سوات ایجنسی قائم ہوئی۔ مارچ 1897ء میں اس میں چترال کو بھی شامل کر لیا گیا۔ اسے عام طور پر ملاکنڈ ایجنسی کہا جاتا ہے۔

1893ء میں روس کی طرف سے برطانوی ہند کے خلاف کارروائی کے لئے روس کے پاس ممکنہ چار اہم راستوں کا ذکر کرتے ہوئے پوپوسکی نے کہا کہ مرکزی ایشیائی۔ چترال والا راستہ اگر چہ مشکل پہاڑی سڑک ہے لیکن یہ مقابلتاً کم تکلیف دہ ہوگا۔ اس سلسلہ میں اُس نے لکھا کہ

> ''یہاں سے یہ راستہ یا تو وادیٔ کنڑ میں سے دریائے کابل کے قریب سے گزرتا جلال آباد جاتا ہے۔ یا براستہ دیر لڑم کوتل سے ہوتا ہوا وادیٔ سوات اور پھر آگے اینگلو انڈین کے پشاور مستقر، یا آخر میں وہ راستہ جو وادیٔ سوات کے کئی دروں میں سے ایک کے ذریعہ وادیٔ بونیر میں اور وہاں سے اباسین تک یعنی اٹک سے 60 میل اوپر کی طرف پہنچا سکتا ہے۔

اس راستہ سے کسی روسی لشکر کی پیش قدمی سے یقیناً اتنی ہی ہلچل پیدا ہوگی جتنی کہ پامیر سطح مرتفع سے گزر کر کشمیر پہنچنے والے لشکر کی وجہ سے پیدا ہوگی اور اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی بے یقینی کی اس کیفیت سے کہ یہ لشکر جلال آباد، پشاور یا اباسین کنارے میں سے کسی جگہ نمودار ہوگا کسی حد تک دفاعی نظام کو متاثر کرے گا۔ گزشتہ جنگوں کی تاریخ کافرستان کی تزویراتی اہمیت اجاگر کرتی ہے۔ سکندر اعظم نے ہندوستان کے خلاف اپنی مہم کا آغاز باختر سے کیا تھا۔ اُس کی فوج کا مرکزی حصہ دریائے کابل کی وادی کے ساتھ چلا جب کہ وہ خود اس فوج کے بائیں بازو کی قیادت کرتا ہوا شمال میں اسے وادیٔ سوات و بونیر میں لے گیا اور مشکل پہاڑی درہ میں سے ہوکر اباسین پہنچ گیا۔''

انیسویں صدی کے اختتام پر اس علاقہ کی تزویری اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ حالاں کہ لارڈ کرزن نے تمام سرحدوں سے اپنی افواج پیچھے کر دیں لیکن چترال میں موجود قلعہ کی فوج کو برقرار رکھا اور اپنی فرنٹیئر پالیسی کے ایک اہم حصہ کے طور پر وادیٔ سوات میں سے گزرتی چترال سڑک کی تعمیر شروع کی جب کہ دوسری جگہوں پر اس پالیسی کے تحت اس نے افواج واپس بلا لیں۔

1895ء کے بعد

شریف خان[3] جس نے عمرا خان اور انگریزوں کی لڑائی میں انگریزوں کا ساتھ دیا تھا اور 1890ء سے سوات میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہا تھا، کو 1895ء میں خان آف دیر کی حیثیت پر بحال کر دیا گیا۔ اس طرح اُسے اپنے کھوئے ہوئے علاقوں کے ساتھ ساتھ عمرا خان کے مفتوحہ علاقوں کا قبضہ بھی مل گیا جو کہ افغانستان فرار ہوگیا تھا۔ اب اُس کی جنوبی سرحد دریائے سوات سے ملتی تھی۔ اس لئے اُس نے ابازئی، خدکزئی، ادین زئی، شموزئی، نیک پی خیل، سیبوجنی اور شامیزئی شاخوں کو اپنی رعایا قرار دیا جو کہ دریا کے دائیں کنارے پر آباد تھے اور جن کا تعلق خواز وزئی شاخ سے تھا جو کہ یوسف زئی کی ذیلی شاخ اکوزئی سے جا ملتی تھی۔ شریف خان کا بھی نسبی تعلق اس شاخ سے تھا۔ 1896ء میں سوات بالا میں جنگ چھڑ گئی اور دریا کے دائیں کنارے آباد قبائل میں اُس کی مداخلت سے عام بے چینی پھیل گئی۔

چوں کہ عمرا خان اب طویل عرصہ سے سوات پر اقتدار حاصل کرنے کی کش مکش سے باہر ہوگیا تھا، اس لئے دریائے سوات کے بائیں جانب کے کچھ حصے ایک خاص حد تک انگریزوں کے زیرِ حفاظت علاقے میں شامل کر لئے گئے۔ تاہم شریف خان سوات بالا میں مکمل بلا شرکت غیرے قوت حاصل نہ کر سکا بلکہ یہاں اُس کے مدِ مقابل اور بھی کئی لوگ تھے۔ اگر چہ ہمسایہ دیر میں مضبوط خانی نظام موجود تھا لیکن سوات میں کسی ایک شخص کو اس قسم کا اقتدار حاصل ہونا صرف خواب و خیال تھا۔ سوات میں سیاست ڈلہ (دھڑا) نظام کی بنیاد پر قائم تھی۔ ہر ایک ڈلہ (دھڑا) اپنے خان

کی سربراہی میں دوسرے کی مخالفت پر کمربستہ رہتا تھا۔

1897ء میں، سیدو بابا کے پوتے سوات میں حصول اقتدار کی رسہ کشی میں شامل ہو گئے۔ خان آف دیراور ان میاں گلوں کی رقابت سے ٹکراؤ کی فضاء قائم ہوگئی۔ انگریزوں کی طرف سے خان آف دیر کو اجازت تھی کہ وہ دریا کے دائیں جانب آباد قبائل کے شدت پسند گروپوں کی سازشوں کا طاقت کے ساتھ خاتمہ کرے جن پر اقتدار کا وہ دعوے دار تھا۔ سوات بالا کے قبائل کا ایک مشترکہ جرگہ (جس میں دائیں کنارے کی چاروں خواز وزئی شاخیں اور بائیں کنارے کے موسیٰ خیل، بابوزئی، اور جنکی خیل سب شامل تھے) چک درہ میں پولیٹیکل ایجنٹ میجر ڈین سے ملا اور اُس سے درخواست کی کہ وہ ان کے اور خان آف دیر کے معاملات میں مداخلت کر کے انہیں حل کرے۔ جرگہ نے برطانوی حکومت کو اپنی وفاداری اور امداد کا یقین دلایا۔ حکومت کی طرف سے میجر ڈین نے اپنے لائحہ عمل کی وضاحت کرتے ہوئے انہیں بتایا کہ

''حکومت ان کے اندرونی نظام میں مداخلت کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی لیکن وہ پولیٹیکل ایجنٹ کے سامنے لائے گئے تنازعات کو حل کرنے میں ان کی مدد کرے گی۔ مزید یہ کہ برطانوی حکومت ان پر کسی قسم کا محصول نہیں لگانا چاہتی۔ وہ صرف یہ چاہتی ہے کہ زیریں سوات (رانی زئ) کی طرح سوات بالا میں بھی امن وامان کی فضا قائم رہے۔''

30 اکتوبر کو برطانوی حکومت اور سوات بالا کے چھ سو ملکوں کے درمیان ایک اہم ملاقات ہوئی۔ ان لوگوں کو میاں گل حضرات اپنے ساتھ لائے تھے۔

''جرگے نے مستقبل میں اپنے علاقہ کے انتظام کا سوال اٹھایا۔ ان کی ایک بڑی تعداد نے براہ راست ہند برطانوی حکومت کنٹرول کی تائید کی۔ انہوں نے کہا کہ بغیر اس کے نہ تو انہیں انصاف مل سکتا ہے اور نہ ان کے باہمی تنازعات کا سلسلہ رُک سکتا ہے۔''

میجر ڈین نے اس ملاقات کو اہم قرار دیتے ہوئے کہا کہ 'یہ سوات بالا کی مذہبی اور قبائلی دونوں قسم کی قیادت کی طرف سے اطاعت کا اظہار تھی اور مزید یہ کہ یہ برطانوی حکومت کے خلاف دشمنی کے جذبات ختم کرنے کے لئے ایک اور نادر موقع کی صورت تھی'۔

چوں کہ برطانوی حکومت اس علاقہ کا کنٹرول براہِ راست اپنے ہاتھ میں لینے سے دل چسپی نہیں رکھتی تھی، اس لئے اُس نے شریف خان کو یہاں مداخلت سے باز رہنے کے لئے نہیں کہا۔ نومبر 1898ء میں دائیں کنارے کے قبائل نے شریف خان کی دخل اندازیوں سے برافروختہ ہو کر سرتور فقیر سے مدد کی درخواست کی۔ وہ ان کی مدد کے لئے دریا عبور کر کے ان کے پاس آیا لیکن وہ انگریزوں کے خلاف ہو جانے سے اس مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ انگریز حکومت جس نے شریف خان کی حیثیت میں اضافہ کر کے اُسے نواب بنا دیا تھا، دریا کے دائیں جانب کے قبائل پر اُس کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرتی تھی حالاں کہ ان قبائل پر اُس کی حکمرانی برائے نام ہی تھی۔

نواب، سوات پر مکمل قبضہ کے لئے اتنا پرعزم تھا کہ وہ اگست 1897ء کو چکدرہ میں سوات بالا کے لوگوں سے برطانوی حکومت کے براہِ راست معاملات طے کرنے سے شدید ناراض ہوگیا۔ اُس نے اس موقع پر اپنے کچھ حواری چکدرہ بھیجے تاکہ وہ لوگوں کو اس بات پر قائل کریں کہ انگریز حکومت سے براہِ راست معاملات طے کرنے کے بجائے نواب کے ذریعہ اُن سے بات کی جائے لیکن سوات کے لوگ جو آپس کی لڑائیوں اور نواب کی غارت گری سے تنگ آئے ہوئے تھے، اپنی ایک منظم حکومت قائم کرنے کے لئے بے تاب تھے۔ نومبر 1897ء میں سوات بالا کے جرگے سے ملنے کے بعد میجر ڈین نے لکھا۔

''سوات بالا میں حکومت کی کمی کا احساس اتنا شدید ہے کہ میری معلومات کے مطابق جرگہ نے حال ہی میں اپنے کچھ سرکردہ ملکوں کو اپنی مہریں لگا کر ایک خالی کاغذ کے ساتھ میاں رحیم شاہ کے بھائی امیر شاہ کے پاس بھیجا کہ وہ اُن کا بادشاہ بن کے سوات آجائے اور یہ کہ اس کاغذ پر جس پر اُن کی مہریں ثبت ہیں، وہ جو بھی شرائط چاہے لکھ دے۔ جہاں تک مجھے علم ہے انہوں نے اُس سے یہ درخواست چوتھی بار کی ہے۔''

1901ء میں دریا کے بائیں جانب سوات بالا کے سیاسی حالات کا سالانہ انتظامی رپورٹ میں خلاصہ یوں بیان کیا گیا ہے۔

''حسبِ معمول گروہی تنازعات جاری ہیں۔ علاقہ اندرونی طور پر انتہائی مایوس کن خلفشار کا شکار ہے۔ میاں گلوں کی غیر مذہبی حکومت قائم کرنے کی کوشش ناکام رہی ہے۔ اُس پاگل فقیر نے اپنی اہمیت کھودی ہے اور بابوزئی کے مَلِک ں نے اپنی اجتماعی قوت کو آپس میں لڑلڑ کر پارہ پارہ کردیا ہے۔''

دریا کے دائیں جانب نواب کے محصولاتِ حکام کی سختی سے لوگوں میں شدید غصہ پیدا ہوا جسے دور کرنے کے لئے اُن سے کچھ بہتر قسم کے لوگ لائے گئے لیکن نواب کے زیر قبضہ سارے علاقہ میں عام طور پر لوگوں میں بے اطمینانی پائی جاتی تھی۔ اس کی ایک وجہ تو محاصل جمع کرنے کا طریقہ تھا اور دوسری وجہ اپنی رعایا کی فلاح و بہبود کے کاموں سے نواب کی لاتعلقی تھی۔ 1904ء میں ایک بار پھر نواب کی ظالمانہ و جابرانہ کارروائی سے وہی قبائل دوبارہ انتہائی برافروختہ ہوئے لیکن اس سے پہلے کہ وہ پھر سرتور فقیر سے مدد مانگیں ملاکنڈ کے پولیٹیکل ایجنٹ میجر ڈین نے فریقین میں معاملات ٹھنڈے کئے۔ اُس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ اضطراب کی یہ کیفیت انگریز سرکار کے لئے کوئی مسئلہ نہ بنائے۔

شریف خان کا 6 دسمبر 1904ء میں انتقال ہوگیا۔ اورنگ زیب خان اُس کا جانشین ہوا جسے زیادہ تر بادشاہ خان کے نام سے جانا جاتا ہے۔ بادشاہ خان کے اپنے بھائی میاں گل جان کے ساتھ تعلقات باپ کی زندگی میں بھی اچھے نہ تھے۔ اُن کا تنازعہ آنے والے برسوں میں بھی جاری رہا جس کی وجہ سے باجوڑ، دیر اور سوات میں بنتے بگڑتے اتحادوں اور سازشوں کا دور دورہ رہا۔ بادشاہ خان ایک گرم مزاج آدمی تھا اور اس لئے اُس نے نہ صرف بڑی آسانی

سے سوات کے اپنے زیرِ عمل داری قبائل کو ناراض کیا بلکہ اپنے آمرانہ اور ااُجی مزاج سے اپنے عوام کو بھی خود سے برگشتہ کر دیا۔' 1907ء میں سوات کے ڈلوں (دھڑوں) میں اقتدار کی تبدیلی کے ساتھ عشر کی ادائیگی بند کر دی گئی اور نواب دیر کی اطاعت کا جوا اُتار پھینکا گیا۔ دریا کے دائیں کنارے پر نواب کا اقتدار فی الوقت ختم ہو گیا۔

نواب دیر اور دائیں کنارے کے قبائل کے درمیان تعلقات کشیدہ رہے۔ اگست 1909ء میں شموزئی اور نیک پی خیل کے جرگہ کی بحفاظت گھر تک پہنچانے کے بہانے اُس علاقے پر حملہ کیا گیا جس سے بہت نقصان ہوا۔ ایک برطانوی سرکاری رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ 'نواب نے پولیٹیکل ایجنٹ کے کہنے پر اپنی فوج واپس بلا لی۔ یہ جھگڑا ثالثی کے لئے انتہائی موزوں ہے اور فریقین کے لئے قابل قبول عارضی امن معاہدہ کی پوری کوشش کی جائے گی۔'

سوات کے علاقے ہاتھ سے نکلنے کے بعد نواب مسلسل انگریز حکومت سے تقاضا کرتا رہا کہ وہ اُس علاقہ پر اُس کے دعویٰ کے مسئلہ کو حل کرے۔ جب انھوں نے مداخلت نہ کرنے کا عندیہ دیا تو اُس نے بے خوف ہو کر اس پر حملہ کر دیا اور 1910ء میں دوبارہ اس علاقہ پر قبضہ کر لیا اور اپنی پوزیشن مستحکم کرنے کے لئے اُس پر قلعے تعمیر کرنے شروع کر دیئے۔ لوگوں نے اُس کے اس اقدام کے لئے انگریز حکومت کو ذمہ دار ٹھہرایا اس لئے کہ وہ اُن کا زیرِ سرپرستی تھا۔ اس نقطۂ نظر کی تصدیق آئندہ برس آنے والی اس رپورٹ سے ہو گئی جس میں نواب کی مضبوط حیثیت کو انگریز حکومت کے لئے مفید قرار دیا گیا۔ یہ رپورٹ کہتی ہے۔

''ملاکنڈ میں دیر کے نواب نے اپنی پوزیشن مستحکم کر لی ہے۔ باجوڑ کے سرداروں نے اُس کے خلاف کئی اتحاد بنائے لیکن اُس کا توڑ کوئی نہیں کر سکا۔ اُس نے اپنے اقتدار کو سوات کوہستان میں توسیع دے دی ہے حالاں کہ دریا کے بائیں کنارے کے قبائل نے اپنی جانب اُس کی پیش قدمی روک دی ہے۔ اُس سے معاملہ کرنا خاصا مشکل ہے... لیکن وہ حکومت سے وفاداری اور اُس سے کئے گئے معاہدوں کی پاسداری میں مستعد ہے۔ اور یہ حقیقت کہ اُس نے اپنی پوزیشن مضبوط کر لی ہے ہمارے مفاد میں ہے۔''

جنوری 1911ء میں نواب نے شموزئی کا علاقہ قبضہ میں کر لیا۔ اس طرح وہ چک درہ سے کوہستان تک دریا کے دائیں کنارے کے پورے علاقہ کا مالک بن گیا۔ اس کی بڑی وجہ یہاں کے قبائل کے باہمی جھگڑے تھے۔ وہ میاں گلوں کے باہمی تنازع سے بھی فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ اُس نے دریا کے بائیں جانب سوات بالا میں عزی خیل کی حدود میں ایک قلعہ کی تعمیر شروع کی لیکن وہاں کے قبائل کی مزاحمت کی وجہ سے اُس پر کام روک دیا گیا۔ ابا خیل اور موسیٰ خیل نے برطانوی حکومت سے کہا کہ وہ انہیں بھی خان خیلوں کی طرح اپنے زیرِ حفاظت لے آئیں۔ نواب کی حکومت غیر مقبول تھی۔ اس کی بڑی وجہ اُس کے حکام کا ناشائستہ رویہ تھا۔ اس لئے اس بات کا خدشہ تھا کہ اُس کا ظلم و جبر کہیں انگریز حکومت کو مداخلت کرنے کا موقع نہ فراہم کر دے۔

ریاست کی تشکیل

بادشاہ خان جندول کے عمرا خان کی تقلید پر عمل پیرا نظر آتا تھا لیکن علاقہ کا اُس کا انتظام ایسا تھا کہ وہ سردار اور عوام جن کی مدد اس کام کے لئے اُسے درکار تھی، وہ اُس سے برگشتہ ہوتے چلے گئے۔ سوات بالا کے قبائل مسلسل جنگ و جدل اور نواب کی غارت گری سے پیدا شدہ تناؤ سے تنگ آ چکے تھے۔ نواب کے نمائندوں کا رویہ انتہائی نا قابل برداشت تھا۔ حتیٰ کہ وہ اُس کے حامیوں کو بھی نہیں بخشتے تھے۔ حکومت کی عدم موجودگی نے انصاف کا حصول اور تنازعات اور معاملات کا حل ناممکن تھا۔ موقع بہ موقع وہ انگریز سرکار کے پولیٹیکل ایجنٹ سے رسمی وغیر رسمی انداز سے استدعا کرتے رہے تھے کہ شاید یہ حکومت ان کو تحفظ فراہم کر سکے لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔

نواب نے دائیں جانب کے قبائل سے کہا کہ وہ جندول کے خلاف اُس کے اقدام میں مدد کے لئے لشکر بھیجیں۔ اُس نے نیک پی خیل علاقہ کے باشندوں پر میدان لشکر بھیجنے میں تاخیر پر فی ملکیت تین روپیہ جرمانہ عائد کر دیا۔ نواب کے قبضہ اور اُس کے ظلم و جبر نے ہندوستانی مجاہدین کو بھی اقدام پر مجبور کر دیا۔ انہوں نے سوات بالا میں دریا کے بائیں جانب جنکی خیل کے علاقہ میں نواب کے خلاف ایک قلعہ بنانے کے لئے سرتور فقیر تک رسائی کی۔ اس سلسلہ میں وہ بونیر اور غوربند کے جرگوں سے ملے۔ سرتور فقیر نے اُن سے وعدہ کیا کہ نواب کو زیر کرنے کے بعد وہ انگریز حکومت سے نبرد آزمائی کے مسئلہ پر غور کریں گے۔ تاہم نواب نے سرتور فقیر کو اس پیغام کے ساتھ 800 روپے بھیجے کہ یہ اسلحہ خریدنے کے لئے ہیں۔ سرتور فقیر نے پہلے تو رقم لینے سے انکار کیا لیکن پھر اس یقین دھانی پر کہ نواب اب انگریزوں کا دشمن بن گیا ہے رقم لے لی۔ نواب نے فقیر کو سالانہ 400 من غلہ فراہم کرنے کا وعدہ بھی کیا۔ حالاں کہ سرتور فقیر اس کے بعد مقابلتاً لاتعلق رہا لیکن ان علاقوں کی سیاست میں اُسے بطور ایک عنصر کے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

سواتیوں نے ایک بار پھر عشر ادا کرنے سے انکار کر دیا اس لئے نواب نے اس کے حصول کے لئے سید بادشاہ خان کو بھیجا۔ میاں گل عبدالودود نے بھی لوگوں سے کہا کہ وہ ادائیگی کر دیں۔ نواب دائیں جانب کے قبائل سے بزور عشر لینے میں کامیاب تو ہو گیا لیکن خاصی تاخیر کے بعد۔ یہ قبائل جو آپس کے جھگڑوں، نواب کے ایجنٹوں کی زیادتیوں اور میاں گلوں اور اُن کے باہمی تنازعات سے حقیقتاً اکتاہٹ کا شکار تھے اور جو 1913ء کے اختتام تک اپنا ایک حکمران مقرر کرنے کی پہلے ہی ایک کوشش کر چکے تھے۔ 1913ء میں انہوں نے عبدالجبار شاہ کے چچازاد بھائیوں کو جو کہ بونیر میں تھے بادشاہ بننے کی رسمی دعوت دی۔ عبدالجبار شاہ کے الفاظ میں:

''چھ یا سات مہینے سے زیادہ قبل سوات کے لوگ ریاست دیر اور یاغستان کے بعض حصوں کے لوگوں کی نا قابل برداشت سرگرمیوں اور زیادتیوں اور آپس کے جھگڑوں کے خاتمہ کے لئے باہمی سوچ بچار کے بعد اس فیصلہ تک پہنچے کہ ہبرے مرحوم و

مغفور دادا سید اکبر بادشاہ کے خاندان کے کسی فرد کو اپنا بادشاہ منتخب کر لیں۔ اس مقصد کے لئے سوات کے کچھ خاص سرکردہ افراد پر مشتمل جرگہ بونیر اور ملکا میں میرے چچازاد بھائیوں سے گفت وشنید کے لئے ملا۔"

باہمی مشوروں کے بعد ان لوگوں نے عبدالجبار شاہ کے نام پر اتفاق کیا لیکن اُس نے غور کے بعد یہ سوچ کر کہ اس میں ممکنہ مشکلات فوائد سے کہیں زیادہ ہیں، جرگہ کو واپس کر دیا۔ سواتیوں نے دیر اور باجوڑ میں بھی ایک خفیہ معاہدہ کیا۔ نواب کے بھائی میاں گل جان کا اپنے بھائی کے ساتھ جھگڑا تھا جس کی وجہ سے باجوڑ میں اتحادوں کی اور مختلف اقدامات کی دوڑ لگی ہوئی تھی۔ نواب کی سازش سے میاں گل جان کو قتل کر دیا گیا جس کے بعد نواب اپنی فوج کی قیادت کرتا ہوا میاں گل جان کے حامیوں سے نمٹنے کے لئے باجوڑ پہنچا۔ دیر اور باجوڑ میں نواب کے ظلم و زیادتی کے شکار افراد نے پہلے سوات کے لوگوں کے ساتھ مل کر اُس کے خلاف محاذ بنانے کی کوشش کی اور پھر بعد میں سید عبدالجبار شاہ کا بھی اس مقصد کے تحت ساتھ دیا۔

کچھ ماہ گذرنے کے بعد جرگہ نے پھر عبدالجبار شاہ کو دعوت دی۔ اُس نے دوبارہ انکار کیا۔ اس کے رشتہ داروں نے اُسے ترغیب دی کہ وہ اس پیش کش کو نہ ٹھکرائے۔ اُس کی طرف سے اب بھی انکار کی صورت میں نادہ گئی چملہ کے حضرت جمال نے اس پیش کش کو قبول کرنے کا عہد کیا جو کہ اُس کا رشتہ دار تھا۔ اس پر اس بار اُس نے یہ دعوت قبول کر لی۔ جرگہ اُس کے ساتھ دو مہینے تک انتظار کرتا رہا۔ اس دوران دیر، سوات اور باجوڑ کے بہت سے لوگوں نے اُسے خطوط بھیجے۔ 25 جون 1914ء کو عبدالجبار شاہ چیف کمشنر سے ملا، اس معاملہ میں اُس سے مشاورت کی اور اُسے اپنی وفاداری کا یقین دلایا۔ اُس نے ہزارہ کے ڈپٹی کمشنر کو اپنے ایک خط میں یہ لکھا کہ 'جیسے ہی میری موجودہ حالت اور صورتِ حال میں تبدیلی آئے گی تو اس سے اب تک کی میری وفاداری میں اضافہ ہو جائے گا۔ آئندہ میری حیثیت جو بھی بنے گی میری وفاداری اور میرا عمل مجھے مستحکم ثابت کریں گے۔ میں دعا گو ہوں کہ خدا میری وفاداری کا شاہد ہو'

عبدالجبار شاہ نے سواتی علاقوں سے دیر کے نواب کو نکال باہر کرنے اور اپنی بطور بادشاہ تقرری کے انتظامات کرنے شروع کئے۔ سرتور فقیر، ہندوستانی مجاہدین اور بونیر کے لوگوں نے اُس سے وفاداری کا عہد کیا۔ دیر کے نواب کی ماں نواب کی جگہ اُس کے بھائی محمد عیسیٰ خان کو حکمران بنانے پر آمادہ ہوگئی۔ نواب کے خلاف اقدامات اور دیر اور سوات میں مستقبل کے انتظامات حتیٰ کہ دیر اور سوات کے درمیان سرحد کی حد بندی پر اتفاق الغرض سب کچھ تیار تھا۔ عبدالجبار شاہ کی سوات میں داخل ہونے کے لئے 8 ستمبر 1914ء کی تاریخ مقرر کی گئی۔ بونیر کی افواج کو اُس کے ساتھ آنا تھا۔ اسی دوران سوات اور باجوڑ کے لوگوں نے اس عمل میں اپنا مقررہ کردار ادا کرنا تھا۔

اس منصوبہ پر عمل درآمد شروع ہونے سے پہلے مردان کے اسسٹنٹ کمشنر مسٹر بروس کو اس کی سن گن ہوگئی۔ اُس نے فی الفور عبدالجبار شاہ اور اُس کے رشتہ داروں کو بلا کر اُن سے معلومات حاصل کیں اور ان سے اس منصوبہ کو

ترک کرنے اور پولیٹیکل ایجنٹ ملاکنڈ سے ملاقات کرنے کے لئے کہا۔ پہلی جنگ عظیم چھڑ گئی تھی اور ہر طرف افواہوں کا بازار گرم تھا۔ گو کہ اکثر افواہیں انتہائی احمقانہ تھیں لیکن سرحد کے اُس طرف جنگ کے بارے میں کسی کو کیا معلوم تھا کہ جنگ کیا ہے اور اُس کا اصل مطلب کیا ہے۔ مزید برآں اگر یہ لشکر بظاہر کسی خاندانی جھگڑے میں شرکت کے لیے بھی جا رہے ہیں تو بھی مسٹر بروس کا خیال تھا' کہ ان کی توانائیوں کو بآسانی کسی اور مقصد کے لئے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے اس لئے لوگوں کی اتنی بڑی تعداد کا متحرک ہونا نامناسب ہے۔' بروس کا مزید یہ بھی خیال تھا' کہ عبدالجبار شاہ اور اُس کے رشتہ داروں کو آلہ کار کے طور پر بھی کسی سازش میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔'

عبدالجبار شاہ نے فی الوقت اس منصوبہ کو ترک کردیا۔ بروس کے مشورہ پر اُس نے پولیٹیکل ایجنٹ سے ملاقات کی جس نے اُسے تنبیہ کی کہ اگر اُس نے ایک حکمران کی حیثیت سے سوات میں داخل ہونے کا خیال ترک نہ کیا تو انگریز حکومت نواب دیر کی مدد کرے گی۔ نتیجتاً عبدالجبار شاہ نے واپس جا کر اپنے اہل خاندان اور لوگوں سے کہا کہ اس وقت انگریز حکومت کی مرضی کے خلاف کوئی اقدام کرنا مناسب نہیں رہے گا۔ اس طرح سواتیوں کی اپنی ریاست و حکومت بنانے کی خواہش برطانوی حکومت کے مقاصد و مفادات کی بھینٹ چڑھ گئی۔

لوگ درآں حالیکہ اب بھی گروہوں میں بٹے ہوئے تھے، نواب کے قبضہ کے خلاف انہوں نے ایک متحدہ محاذ بنالیا۔ نواب کی خودسرانہ ظالم حکومت کے خلاف لوگوں میں پائی جانے والی نفرت و کراہیت کا اندازہ پشتو عوامی شاعری کی اس ایک مثال سے بھی لگ سکتا ہے۔

هم دی زمونګ دانے هم یے وړی په مونګ په ہورته
او ګوره د دیر د نواب زور ته

'دیر کے نواب کی اندھی طاقت دیکھو کہ ہم اپنا ہی غلہ اپنے کاندھوں پر اُس کے لئے ڈھو کر لے جا رہے ہیں۔'

نواب دیر کے خلاف اتحاد کا مرکزی کردار سنڈاکئی بابا تھا۔ حالاں کہ اپنے حریف بھائی کی موت کی وجہ سے نواب کی پوزیشن خاصی مضبوط ہو گئی تھی لیکن 1915ء کی ابتداء میں سوات بالا کے شامیزیٔ اور سیبوجنی علاقوں میں اُس کے خلاف ایک بغاوت شروع ہوگئی۔ نیک پی خیل چوں کہ اس اتحاد کا ایک حصہ تھا اس لئے وہ بھی اس بغاوت میں شامل ہوگیا۔ باغیوں نے نواب کی افواج کو بڑا جانی نقصان پہنچایا اور اپنے علاقوں میں موجود قلعوں پر قبضہ کرلیا۔ اب نواب نے کمبڑ کے سید بادشاہ کو سواتیوں کی سرکوبی کے لئے بھیجا لیکن وہ اپنی سفارت کاری اور طاقت دونوں طریقے استعمال کرنے میں ناکام رہا۔ نواب نے مزید کمک بھیجی۔ سواتیوں نے کوہستانیوں، بونیریوں، ہندوستانی مجاہدین اور عبدالجبار شاہ سے مدد مانگی۔ پولیٹیکل ایجنٹ نے بائیں جانب کے سواتیوں کو ترغیب دی کہ وہ نواب کے خلاف لڑائی میں دائیں جانب کے سواتیوں کی مدد نہ کریں لیکن اس جنگ میں دائیں کنارے پر آباد شامیزیٔ، سیبوجنی

ورنیک پی خیل قبائل کو فتح نصیب ہوئی۔

اس جنگ میں سواتیوں کا ساتھ دینے کے بجائے میاں گل پولیٹیکل ایجنٹ سے ملاقات کے لئے چلے گئے۔ عبدالودود نے بعد میں نواب کے جنرل سے ملاقات کی۔اس کا دوسرا بھائی بیماری کی وجہ سے اس ملاقات کے لئے نہیں جاسکا۔ان علاقوں کے سواتیوں نے اس کے باوجود میاں گلوں کو عشر دینے ،اور نواب کی جگہ انہیں اپنا حکمران بنانے کی پیش کش کی۔جس کے جواب میں گل شہزادہ (میاں گل عبدالودود) نے کہا کہ چوں کہ اُس کا بھائی اُس کے ساتھ متحد ہونے کے لئے تیار نہیں ہے...یہ خیال اس وقت نا قابل عمل ہے۔'

بالآخر نواب کی فوج کو مکمل شکست ہوگئی اور اسے سوات بالا سے ادینزئ کی طرف دھکیل دیا گیا۔دونوں طرف بڑا جانی نقصان ہوا،تعداد اور مارے گئے لوگوں کی اہمیت،ہر دولحاظ سے فاتحین نے پھر ایک آزاد ریاست کے قیام کی تگ ودو کی اور سنڈاکئی بابا کو اختلافات کی صورت میں حَکَم تسلیم کیا گیا۔اسی میں پانچ بڑوں کی ایک کونسل بنائی گئی جس میں شامیزئ علاقہ سے ماسم خان،سیبوجنی سے تاج محمد خان،اور نیک پی خیل سے زرین خان،امیر سلطان اور جعفر خان لئے گئے۔یہ حکومت تھی۔لیکن اصل اختیارات سنڈاکئی بابا کے ہاتھ میں تھے۔

نہ تو اس پانچ رکنی کونسل کی نامزدگی کی صحیح تاریخ معلوم ہے جسے آزاد کئے گئے علاقوں کی حکومت چلانی تھی اور نہ ہی اس ریاست سوات کے قیام کی اصل تاریخ کا پتہ ہے۔3اپریل1915ءکو ختم ہونے والے ہفتہ کی صوبہ سرحد کی خفیہ سیاسی ڈائری سے صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ نواب دیر کی فوج کو مکمل شکست دے کر ادینزئ علاقہ کی طرف دھکیل دیا گیا۔اس کے بعد کے ہفتہ کی ڈائری نے جو 10اپریل1915ءکو ختم ہو رہا تھا،بتایا ہے کہ ایک پانچ رکنی کونسل کا قیام عمل میں لایا گیا ہے لیکن اصل طاقت سنڈاکئی بابا کے ہاتھ میں دے دی گئی ہے۔

تاہم دریا کے دائیں جانب کے علاقہ پر نواب دیر کے اقتدار کا مکمل خاتمہ مارچ1915ءکے اختتام تک ہی ہوگیا تھا جب کہ اپریل کی ابتدا میں پانچ رکنی کونسل کا قیام عمل میں لایا گیا۔اس طرح ریاست سوات کی بنیاد سوات بالا میں دائیں جانب کے قبائل یعنی نیکپی خیل،شامیزئی،اور سیبوجنی نے رکھ دی۔4

کونسل نے عبدالودود کو اس ریاست کی سربراہی کے لئے قائل کرنے کی کوشش کی۔

''انہوں... نے اُس سے کہا کہ انہیں اس بات کا دُکھ ہے کہ انہوں نے ابھی تک ان کی مدد نہیں کی۔لیکن وہ ماضی میں اُن کی بے دلی کو نظر انداز کرنے کے لئے تیار ہیں اگر وہ قیادت قبول کرکے اپنا مستقبل بھی اُن کے ساتھ داؤ پر لگانے کے لئے تیار ہوں۔انہوں نے اس سے کہا کہ اگر وہ تیار نہیں ہوئے تو وہ کسی کو باہر سے اپنی مدد کے لئے لائیں گے اور یہ شاید ستھانہ کے سید عبدالجبار شاہ ہوں۔''

میاں گل عبدالودود نے جواب میں کہا کہ 'اُن کا تجویز کردہ اقدام چوں کہ بہت اہم ہے اس لیے اسے ایک

معمولی چیز نہیں سمجھنا چاہئے۔ انہوں ... نے مزید کہا کہ وہ اُس وقت تک کوئی واضح جواب نہیں دے سکتے جب تک پولیٹیکل ایجنٹ سے مل کر اس سلسلہ میں اُس کی رائے نہ لے لیں۔[1]

کونسل نے نواب سے چھینے ہوئے قلعوں کو مضبوط کرنے کی کوشش شروع کی اور نواب کے خلاف باڑوہ کے خان سے اتحاد کرنے کے لئے بات چیت کی۔ لوگوں نے اس بحران میں سنڈاکئی بابا کی مدد اور خدمات کے اعتراف میں اُنہیں بیس ہزار لکڑی کے بڑے تنے دینے پر اتفاق کیا۔[2] اس کے علاوہ اُن سے درخواست کی گئی کہ وہ سوات میں رک جائیں اور اُن کے سربراہ بن جائیں۔[3] لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ وہ اس اعزاز کو قبول کرنے پر تیار نہیں ہوئے۔

عبدالجبار شاہ کی تقرری

میاں گل عبدالودود اور سنڈاکئی بابا دونوں کی جانب سے انکار کے بعد لوگوں نے پھر عبدالجبار شاہ کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اُس نے یہ دعوت قبول کی۔ اور اپریل 1915ء کے اختتام کے قریب وہ سوات آ گیا۔ 24 اپریل 1915ء کو اُسے سوات کا بادشاہ بنا دیا گیا۔

نوٹس

1. عثمان علی اینڈ محمد اسلم خان، "اَور جن اینڈ ڈیویژن آف سیٹلمنٹس ان سوات ویلی"، *پاکستان جنرل آف جیوگرافی* (پشاور)، جلد 1 (جون۔ دسمبر، 1991)، صفحات 103-104۔ عجیب بات یہ ہے کہ عثمان علی اور اسلم خان نے اپنی بات کے ثبوت کے لئے محمد عبدالغفور قاسمی کا حوالہ دیا ہے حالاں کہ قاسمی کی کتاب *تاریخ ریاست سوات* اور *دی ہسٹری آف سوات* یعنی پشتو اور انگریزی بیانات دونوں میں ان کے اس دعویٰ کی توثیق موجود نہیں ہے۔
2. معاہدہ کی دوسری شق دیکھیں۔ امیر عبدالرحمٰن اور ہنری مارٹیمر ڈیورنڈ کے درمیان طے پانے والے معاہدہ جسے ڈیورنڈ معاہدہ کہا جاتا ہے، کی ابتدائی تین شقوں کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

(۱) ہز ہائی نس کی مملکت کی مشرقی اور جنوبی سرحد واخان سے ایرانی سرحد تک اس معاہدہ سے منسلک نقشہ میں واضح کر دی گئی ہے۔

(۲) انڈیا کی حکومت اس خط کے اُس جانب علاقوں میں جو کہ افغانستان کی طرف واقع ہیں مداخلت نہیں کرے گی۔ اور ہز ہائی نس امیر اس خط کے اس جانب انڈیا کی طرف واقع علاقوں میں کسی بھی وقت مداخلت نہیں کریں گے۔

(۳) اسی طرح برطانوی حکومت اس بات سے اتفاق کرتی ہے کہ ہز ہائی نس امیر اسمار اور اُس سے چناک تک کی وادی پر اپنا قبضہ برقرار رکھے جب کہ ہز ہائی نس نے بھی یہ بات مان لی ہے کہ وہ کبھی بھی سوات، باجوڑ اور چترال میں مداخلت نہیں کریں گے۔ ارناوئی اور بشگال کی وادی بھی اس میں شامل ہے۔ برطانوی حکومت نے اس بات پر بھی اتفاق کرلیا ہے کہ برمل کی پٹی کو ہز ہائی نس کے لئے چھوڑ دیا جائے جیسا کہ ہز ہائی نس کو دیئے گئے تفصیلی نقشہ میں دکھایا گیا ہے۔ جواباً انہوں نے وزیری اور داوڑ علاقہ پر اپنے دعویٰ کو ختم کر دیا ہے۔ ہز ہائی نس نے چاگئی پر اپنے دعویٰ کو بھی چھوڑ دیا ہے۔ ایم حسن کاکڑ، *افغانستان: اے سٹڈی ان انٹرنیشنل پولیٹیکل ڈیویلپمنٹس، 1880-1896ء* (کابل، 1971ء)، صفحہ 286: لودویگ ڈبلیو ایڈمیک، *افغانستان، 1900-1923ء: اے ڈپلومیٹک ہسٹری* (برکلے: یونیورسٹی آف کیلی فورنیا پریس، 1967ء)، صفحہ 176۔

3. شریف خان اور اُس کا باپ دونوں ہی انگریز حکومت کے وفادار تھے لیکن 1890ء میں وہ اُسے عمرا خان سے بچانے کے لئے مدد سے گریزاں رہی۔ وجوہات گورنر جنرل ان کونسل والے بیان سے واضح ہیں۔ باوجود اس حقیقت کے کہ اُس نے نوآبادیاتی حکومت کو 1889ء کے اختتام کے وقت تجویز دی تھی کہ اگر وہ اُسے 'یوسف زئی علاقہ کا امیر مقرر کریں (مراد ہے دیر اور باجوڑ)، اُسے تحفظ فراہم کریں اور اُس کی تائید کریں تو وہ سوات اور دیگر علاقوں میں خود ہی اپنا اقتدار قائم کرلے گا۔' دیکھیں سی ایل ٹوپر، چیف سیکرٹری ٹو حکومت پنجاب و متعلقہ علاقے کے سیکرٹری ٹو گورنمنٹ آف انڈیا کے شعبۂ خارجہ، لاہور 13 مارچ 1893 *کمشنر آفس پشاور کی فائلیں*، بنڈل نمبر 34، سیریل نمبر 952-B، پراونشل ارکائیوز، پشاور۔

4. ہم نے نیکپی خیل کو اس لئے مقدم رکھا ہے کہ پانچ رکنی کونسل میں نیکپی خیل کے نمائندوں کی تعداد تین تھی۔ سربراہی سنڈاکئی بابا کے پاس تھی۔ شامیزئی اور سیبوجنی سے ایک ایک رُکن لیا گیا تھا۔ مزید برآں چندا خورہ (جسے اب عموماً کبل کہا جاتا ہے) کو اس نوزائیدہ ریاست کا پایۂ تخت بنایا گیا تھا جو کہ نیک پی خیل میں واقع ہے۔ ان سب باتوں سے نیک پی خیل کو حاصل نمایاں حیثیت کے بارے میں پتہ چلتا ہے جو کہ اُسے نواب دیر کے خلاف بغاوت اور ریاست سوات کے قیام کے اُمور میں یقینی طور پر حاصل تھی۔ علاوہ ازایں یہیں پر عبدالجبار شاہ اور بعد میں میاں گل عبدالودود کو ریاست سوات کا بادشاہ مقرر کیا گیا۔

چوتھا باب

استحکام: پہلا مرحلہ
(1915ءتا1917ء)

اقتدار میں آنے کے بعد عبدالجبار شاہ کی حیثیت

بالآخر سوات کی علاحدہ ریاست کا قیام عمل میں آ گیا اور عبدالجبار شاہ (1880ءتا1956ء) کو اُس کا پہلا بادشاہ مقرر کر دیا گیا۔ اُسے ایک مشکل کام سونپا گیا۔ اُسے اپنی حاکمیت قائم کرنی تھی، ایک فوج تشکیل دینی تھی اور اپنی رعایا کی توقعات پر پورا اترنا تھا۔ اس سب کے حصول کے لئے مدبرانہ حکمت عملی، مہارت، احتیاط، سمجھ بوجھ اور اپنے لوگوں کی تائید درکار تھی۔

باہر کا آدمی ہونے کی وجہ سے اُس کی پوزیشن کمزور تھی۔ یہاں نہ تو اُس کا اپنا کوئی ڈلہ (دھڑہ) تھا اور نہ ہی اُس کی جڑیں اس خاک میں پیوست تھیں۔ اُس سے لوگوں کی وفاداری بھی مستحکم بنیادوں پر قائم نہیں ہوئی تھی۔ اصل طاقت سنڈاکئی بابا اور جرگہ کے ہاتھ میں تھی۔ میاں گل اپنے روحانی سلسلہ نسب اور اثر ورسوخ کی وجہ سے اپنے علاحدہ عزائم رکھتے تھے۔ دوسری طرف نواب دیر بھی ایک مضبوط حریف کی شکل میں ہر دم موجود تھا، جسے برطانوی حکومت کی پشتیبانی بھی حاصل تھی، اور جو سوات میں اپنے کھوئے ہوئے علاقوں کو دوبارہ قبضہ میں لینے کے لئے کسی بھی وقت میدان میں کود سکتا تھا۔ میاں گلوں کے علاوہ بھی سوات میں کچھ ایسے سرکردہ لوگ تھے جو اُسے ناپسند کرتے تھے۔ جن کے اپنے مقاصد اور ایجنڈے تھے۔

اُسے مختلف حریف قبائل، نافرمان لوگوں اور خوانین کے درمیان ایک قسم کا توازن برقرار رکھنا تھا۔ لوگ ایک منظم نظام اور نظم ونسق کی جگہ گروہی شکل کی زندگی کے عادی تھے۔ پہلے نہ تو کوئی مستحکم حکومت رہی تھی نہ کوئی لازمی ضابطۂ قانون تھا جو کہ کسی بھی کامیاب حکومت کے لئے لازم وملزوم ہیں۔ پہلی جنگ عظیم کی وجہ سے برطانوی حکومت

سوات کے حالات کے بارے میں چوکنی محتاط ،اور بدظنی کا شکار تھی۔عبدالجبار شاہ کا ابتداء میں اُن سے تعلق وفادارانہ تھا لیکن بعد میں نواب دیراور میاں گلوں کے مقابلہ میں اُس کی حیثیت ان کی نظر میں خاصی کمزور تھی۔

میاں گل برادران

یہ لوگ سیدو بابا سے سلسلۂ نسب کی وجہ سے سوات پر حکمرانی کا عزم رکھتے تھے۔ان کے پاس لوگوں کی حمایت بھی تھی اوراثر ورسوخ بھی تھا۔ریاست کے قیام کے بعد عبدالجبار شاہ کے عہد میں وہ اس چیز کو اپنے ارادوں کی تکمیل کے لئے استعمال کرنے پر جت گئے۔

سوات میں ایک غیر مذہبی سیاسی قیادت کی نمائندہ شکل تو خوانین کی تھی لیکن مذہبی افراد ایک اور قسم کی قیادت کی نمائندگی کررہے تھے۔ان مذہبی افراد میں سیدو بابا کے چار پوتے بھی شامل تھے۔جو یوں تو کھلے دل کے شرفا سی زندگی گزارتے تھے لیکن اپنے سلسلہ نسب اور سیدو بابا کے مزار سے تعلق کی وجہ سے انہیں خاصا رسوخ حاصل تھا۔ان میں سے ہرایک اقتدار کا بھوکا تھا۔اور سوات میں اپنی بلاشرکت غیرے حکومت کا متمنی تھا۔ان میں سے ہرایک کو بیرونی حریفوں سے پہلے خاندان کے اندرتین حریفوں سے نمٹنا تھا۔

حریفوں سے اپنا راستہ صاف کرنے کے لئے شروع ہونے والی کشاکش میں میاں گل عبدالودود نے 1903ء میں اپنے چچازاد بھائی میاں گل عبدالرزاق (المعروف سید باچا) کو قتل کرڈالا جس کے نتیجہ میں مقتول کے سگے بھائی میاں گل عبدالواحد (المعروف امیر باچا) اور میاں گل عبدالودود میں جان نشینی کے لئے جنگ چھڑگئی۔اُسے بھی نومبر 1907ء میں میاں گل عبدالودود نے کہیں باہر شکار کے دوران گولی ماردی۔

چچازاد بھائیوں کا صفایا کرنے کے بعد اب صرف یہ دو سگے بھائی رہ گئے یعنی میاں گل عبدالودود اور میاں گل شیرین جان۔ایک دوسرے سے حسد اور ذاتی جاہ طلبی کی خواہش نے دونوں بھائیوں کو ایک ساتھ رہنے اور اپنے اثر و رسوخ اور طاقت کو یک جا کرنے میں ہمیشہ رکاوٹ ڈالی۔حالاں کہ سوات میں دونوں کو بہت اثر ورسوخ حاصل تھا لیکن وہ دونوں ایک دوسرے سے مفاہمت کو تیار نہیں تھے۔بائیں کنارے کے سواتی باشندے ان دونوں بھائیوں کی حمایت میں ایک دوسرے سے مسلسل دست وگریبان تھے۔عبدالودود پہلے ہی اپنے دو چچازاد بھائی قتل کرچکا تھا اس لئے قدرتی طور پر اُس کا بھائی اُس پر اعتماد کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ان کے حامی بھی اس گھٹیا بے مقصد لڑائی سے تنگ آئے ہوئے تھے۔اس دوران ایک لڑکے کی اچانک خود کو اخوند کا پوتا ہونے کے اعلان نے خاصی ہلچل مچادی اور انتشار میں مزید اضافہ ہوگیا۔

گو کہ انگریز سرکار سے اُن کے تعلقات بہت عمدہ تھے لیکن ایک دوسرے اور اپنے حامیوں کے ساتھ لڑائی میں وہ بری طرح پھنسے ہوئے تھے۔ ان کی آپس کی ایک شدید لڑائی کے بعد انہیں پولیٹیکل حکام نے ملاکنڈ طلب کرلیا تا کہ ان کے درمیان ایک معاہدہ کرایا جائے کہ وہ منجملہ اور باتوں کے سیدو بابا کے مزار کے لئے آپس میں لڑنا بند کردیں۔ چوں کہ 1911ء میں ملاکنڈ میں طے پا جانے والے اس معاہدہ پر وہ عمل درآمد نہیں کر سکے اس لئے 1912ء میں انہیں دوبارہ ملاکنڈ طلب کرلیا گیا اور معاملات عارضی طور پر حل کر لئے گئے لیکن اس سال کے اختتام پر عبدالودود کے حامی ہر طرف چھا گئے اور سیدو اور بابا کا مزار مکمل طور پر اُس کے قبضہ میں آ گئے۔

سوات بالا کے سب قبائل کے دستے اس جنگ میں شریک ہوگئے۔ عبدالودود نے کاٹیلئی (امانکوٹ) کے قلعہ پر دھوکہ سے قبضہ کرلیا اور ابا خیل اور موسیٰ خیل علاقوں کے علاوہ اُس کے گروہ کو ہر جگہ غلبہ حاصل ہوگیا۔ ایک ہفتہ بعد شیرین جان کے لوگوں نے عبدالودود کے حامیوں پر ایک ناکام حملہ کیا لیکن عبدالودود نے اوڈیگرام اور بلوگرام پر بھی قبضہ کرلیا۔ جنوری 1913ء میں مفاہمت ہوگئی لیکن سال کے اختتام تک اس بات کے آثار ہویدا تھے کہ یہ مصالحت چلے گی نہیں۔

نواب دیر نے ان میں سے ہر ایک بھائی کے ساتھ اپنی شرائط پر معاملات طے کرنے چاہے۔ اُس نے شیرین جان کی مدد کے لئے اپنے آدمی بھی بھیجے۔ دونوں بھائیوں نے نواب سے ملاقات کی۔ مذاکرات کے دوران اُس نے کھلم کھلا شیرین جان کی حمایت کی۔ اس پر عبدالودود اور ابا خیل اور موسیٰ خیل کے جرگہ نے احتجاج کیا کہ وہ ان کے معاملات میں مداخلت کر رہا ہے۔ اسلحہ کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دونوں نے اپنے کارخانے لگائے اور ماہر کاریگروں کو ملازم رکھا۔

میاں گل بھائیوں نے ایک بار پھر صلح کرلی اور ایک دوسرے سے چھینے ہوئے ہتھیار ایک دوسرے کو واپس کردیئے۔ انہوں نے مختلف علاقوں میں اپنے قلعے بنانے کے لئے بعض مَلکوں سے باضابطہ اجازت مانگی تا کہ لوگوں سے عشر لینا شروع کرسکیں لیکن جلد ہی انہوں نے دوبارہ ایک دوسرے سے لڑنا شروع کردیا۔ ایک بار اور صلح کا معاہدہ ہوا جس کی رو سے قمبر عبدالودود اور تختہ بند شیرین جان کو مل گئے۔

عبدالجبار شاہ اور میاں گل برادران

عبدالجبار شاہ نے اقتدار سنبھالتے ہی بہت جلد ریاست کا ایک انتظامی ڈھانچہ بنالیا، اہم مقامات پر قلعے تعمیر کئے اور عشر اور گھرانہ ٹیکس وصول کرنا شروع کردیا۔ جس دوران وہ اپنی پوزیشن مستحکم کرنے میں مصروف تھا بائیں

جانب کے قبائل مرحلہ وار کچھ ردوکد کے ساتھ اُس کی حکومت کو تسلیم کرتے چلے گئے ۔ پولیٹیکل ایجنٹ کو سوات بالا سے ایک خط موصول ہوا کہ دیر کے ملیزیٔ اور سوات کے خوزوزئی قبائل کے درمیان حد بندی کا ٹکلہ کے مقام پر کی جائے جو کہ چترال جانے والی سڑک پر چک درہ اور سیریٔ کے درمیان ایک درّہ ہے۔

میاں گل عبدالودود کو معلوم نہیں تھا کہ ایک ریاست کے کل پرزوں کو کس طرح چلایا جاتا ہے اور اُسے یقین نہیں تھا کہ سوات میں اس قسم کی ریاست چل سکتی ہے۔ دو دفعہ حکمرانی کی پیش کش کو رد کرنے کے بعد اب اُس نے دیکھا کہ اُس کے خدشات بے بنیاد تھے اور یہ کہ حکومت تو وہ بھی چلا سکتا ہے۔ اس کے بعد اُس نے اپنی پوری طاقت عبدالجبار شاہ کے خلاف لگادی۔ اُس کے بھائی نے جمروز خان کو یہ پیغام دے کر عبدالجبار شاہ کے پاس بھیجا کہ وہ اُسے حکمران تسلیم کرنے کے لئے تیار ہے لیکن عبدالودود نے اُس کے اقتدارِ اعلیٰ کو ماننے سے انکار کردیا اور کہا کہ بائیں کنارے پرآباد قبائل کو کسی بادشاہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور یہ کہ اُن کا دائیں جانب کے قبائل سے کوئی لینا دینا نہیں ہے جو کہ نواب دیر کی رعیت ہیں۔ اس لئے بظاہر لگتا تھا کہ بائیں جانب کے قبائل عبدالجبار شاہ کی حکومت تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

عبدالودود نے اپنے مقاصد کے لئے اب عبدالجبار شاہ کے خلاف سازش شروع کردی لیکن جس ڈھب کے حالات تھے ان میں اُس کی پوزیشن اتنی مضبوط نہیں تھی۔ اُس نے یہ سوچا کہ بہتر یہ ہے کہ بھائی کے ساتھ مفاہمت کرلی جائے۔ اس اتحاد سے ان کے خیال میں وہ اتنے مضبوط ہو جائیں گے کہ لوگوں سے عشر طلب کرسکیں گے لیکن اس سے قبائل اُن سے بھاگ کر مخالف کیمپ میں جانے لگے۔ اوڈیگرام کے سعداللہ خان پر جو کہ عشر دینے کے خلاف لوگوں کی قیادت کررہے تھے میاں گلوں کے لشکر نے حملہ کردیا۔ سعداللہ خان نے اس سلسلہ میں عبدالجبار شاہ اور سنڈاکئی بابا سے مدد مانگی۔ عبدالجبار شاہ مدد پرآمادہ ہوگئے۔

سنڈاکئی بابا نے جو کہ اب تقریباً پورے سوات بالا کے مالک تھے، میاں گلوں کے خلاف غزا کا اعلان کردیا۔ اس الزام پر کہ وہ لوگ انگریزوں کے ساتھ ساز باز کررہے ہیں۔ میاں گلوں کو بھاگ کر سیدو میں پناہ لینی پڑی۔ ان کے کچھ قلعے جلا دیئے گئے۔ تاہم پھر انہوں نے اس بات پر قبائل سے معاہدہ کرلیا کہ وہ سیدو اور ایک بانڈہ تک محدود رہیں گے۔

بادشاہ عبدالجبار شاہ اور سنڈاکئی بابا کو مکمل فتح حاصل ہوئی۔ سوات بالا کا پورا علاقہ دریا کے دونوں جانب ماسوائے ابا خیل اور موسیٰ خیل نے ان کی حکومت مان لی اور عشر دینے پر اتفاق کیا۔ میاں گل برادران جنہیں اس وقت بالکل کمزور کردیا گیا تھا، خاموشی اور دل جمعی سے اپنا ایک جتھا بنانے میں مصروف ہوگئے۔ اس میں انہیں جزوی کامیابی مل گئی۔ بائیں جانب اور دائیں جانب کے بھی کچھ اہم ملک ان کی حمایت پرآمادہ ہوگئے۔

میاں گلوں کی مدد کے لئے مانگی ملا نے اپنے کچھ شیخوں کو موسیٰ خیل اور ابا خیل قبائل کی طرف بھیجا کہ انہیں تلقین کرے کہ عبدالجبار شاہ کو عشر دینا حرام ہے۔ دونوں قبائل کے جرگے نے مانگی ملا سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ عبدالجبار شاہ نے اسے میاں گلوں کی سازش قرار دیا۔ اُس نے اور سنڈاکئی بابا نے میاں گل برادران کو بالکل دبانے کے جتن شروع کر دیئے اس لئے کہ ان کا خیال تھا کہ سوات کی مکمل محکومی میں یہ دونوں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔

لیکن ایسا کرنا آسان نہ تھا۔ دریا کے بائیں کنارے کے باشندوں میں سے کئی مقتدر گروہ اور سرسرداری کے میاں کان اپنے اپنے مقاصد کے لئے اُن کے حامی تھے۔ اکثریت عبدالجبار شاہ کے ساتھ تھی لیکن آبادی کا بڑا حصہ تو ہم پرست اور میاں گلوں کی اس دھمکی سے بے حد خوفزدہ تھا جو انہوں نے دے رکھی تھی کہ اگر انہیں کوئی زک پہنچا تو وہ سوات سے نکل جائیں گے اور اپنے ساتھ اپنے دادا سیدو بابا کی باقیات قبر سے نکال لے جائیں گے جس سے اس جگہ کا تقدس ختم ہو جائے گا۔ اس موقع پر ایک نوجوان جس کا نام امیر محمد تھا لیکن میاں گل خاندان اُسے شغلے میاں گل کے نام سے پکارتے تھے اور جس کا دعویٰ تھا کہ وہ مقتول میاں گل سید باچا کا بیٹا ہے، ایک بار پھر نمودار ہوا لیکن اس دفعہ بادشاہ کے ساتھ۔ عبدالجبار شاہ میاں گلوں کو نکال باہر کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ عبدالودود تو ملاکنڈ کے پولیٹیکل ایجنٹ سے ملنے چلا گیا۔ اُسے انگریز حکومت نے تھانہ یا چک درہ کے قریب واقع جگہ دربار میں رہنے کی اجازت دی جب کہ اُس کا دوسرا بھائی شیرین جان بونیر چلا گیا۔

میاں گلوں نے اپریل 1916ء میں نواب دیر، سرسرداری کے میاں گان اور ابا خیل و موسیٰ خیل سے اتحاد کر کے خود کو دوبارہ سیدو میں مستحکم کیا۔ سوات کے لوگ ایک بار پھر اپنے بادشاہ اور سنڈاکئی بابا کی قیادت میں نواب دیر کے خلاف صف آراء تھے۔ وہ اپنی آزاد حیثیت برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ میاں گلوں کی مدد کے لئے نواب نے پہلے تو ایک لشکر روانہ کیا اور پھر مانیار میں قائم اُن کے فوجی قلعہ کی حفاظت کے لئے چالیس محافظین کا ایک دستہ بھیجا۔ یہ اُس معاہدہ کی خلاف ورزی تھی جو ابا خیل و موسیٰ خیل اور بابوزئی اقوام کے درمیان طے پایا تھا بلکہ عبدالودود اس مقصد کے لئے دیر گیا تا کہ نواب کو عید کے بعد دوبارہ سوات پر حملوں کے لئے اکسا سکے۔

تینوں فریقوں، نواب، میاں گل برادران اور سید عبدالجبار شاہ کے درمیان کسی سمجھوتہ کے لئے کوششیں کی گئیں لیکن کامیابی نہیں ملی۔ تینوں انگریز حکومت کی وفاداری کا شدت سے دَم بھرتے تھے۔ عبدالجبار شاہ کی خواہش تھی کہ سوات بالا کا جرگہ اُس کے اور میاں گلوں کے درمیان امن معاہدہ کرادے۔ عبدالودود کا ارادہ تھا کہ

> ''وہ دنیوی اور روحانی دونوں لحاظ سے سوات کا بادشاہ بن جائے اور وہ جانتا تھا کہ سوات میں پاؤں جمانے کے لئے یا تو اُسے عبدالجبار شاہ کے ساتھ سمجھوتہ کرنا پڑے گا یا نواب کی مدد لینی پڑے گی۔ پھر اُسے یہ بھی اندازہ تھا کہ یہاں پاؤں جمانے کے بعد عبدالجبار شاہ نواب کے مقابلہ میں کہیں زیادہ خطرناک حریف ثابت ہوگا۔''

جس طرح عبدالجبار شاہ اور میاں گلوں کے درمیان اشتراک و اتفاق بعید از امکان تھا، اسی طرح میاں گلوں کو نواب دیر سے بھی جدا کرنا آسان نہیں تھا۔ جرگہ اور اُس کے حامیوں نے جو کہ خاصی بڑی تعداد میں تھے (شہید بابا کی زیارت میں) از سرِ نو نواب اور میاں گلوں کے خلاف اپنے حلفیہ معاہدہ کو تازہ کیا اور عبدالجبار سے وفاداری پر قائم رہنے کا اعلان کیا اور اُسے اس اجلاس میں شرکت کے لئے طلب کیا۔ عبدالودود نے ایک بار پھر نواب سے کمک کی درخواست کی۔ اُسے ڈر تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ سر سرداری کے میاں گان اور پورن چکیسر کے خلاف اکٹھا ہونے والا سواتیوں کا جم غفیر انہیں شکست دے کر میاں گلوں اور نواب کے خلاف کارروائی شروع کردے۔

کسی سمجھوتہ کے لئے کوششیں جاری رہیں۔ عبدالودود کو جب باندئی، نیک پی خیل کے زرین خان کے قتل کی خبر پہنچی تو وہ اُس وقت پچھ... رمتوزیزئی قبائل کے ساتھ مذاکرات میں مصروف تھا۔ اُس نے یہ بات چیت فی الفور معطل کردی لیکن بالآخر میاں گل برادران اور سواتیوں کے درمیان مندرجہ ذیل شرائط پر ایک معاہدہ طے پا گیا۔

(1) میاں گل سیدو میں قلعے اور اونچے حفاظتی برج تعمیر کر سکتے تھے۔

(2) عبدالجبار شاہ جس علاقہ میں سیدو واقع ہے اُس سے کوئی سروکار نہیں رکھے گا۔

(3) سید عبدالجبار شاہ ابا خیل اور موسیٰ خیل کے معاملات میں اُس وقت تک کوئی مداخلت نہیں کرے گا جب تک ... اُسے متفقہ طور پر فریقین کی جانب سے بلایا نہ جائے۔

(4) عبدالجبار شاہ میاں گلوں کے زیرِ قبضہ سیری قطعات اراضی کو نہیں چھیڑے گا۔

(5) میاں گل برادران اور ابا خیل و موسیٰ خیل نے عہد کیا کہ وہ سواتیوں اور نواب دیر کے درمیان ہونے والے جھگڑوں میں غیر جانبدار رہیں گے۔

(6) میاں گلوں کو اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے سر سرداری کے میاں گان کا سواتیوں سے سمجھوتہ کرائیں گے۔

(7) سوات کے باشندے میاں گلوں کو اس نقصان کے بدلہ میں جو انہیں اپنی جلاوطنی کے دوران اُٹھانا پڑا کل تیس ہزار روپے ادا کریں گے۔

اس امن معاہدہ کے بعد عبدالودود نے سواتیوں سے کہا کہ اب انہیں انگریز سرکار سے بھی امن معاہدہ کرنا چاہئے۔

زرین خان کی موت کے بعد عبدالودود نے اس قتل کے بارے میں لوگوں میں پیدا ہونے والے اس عمومی تاثر سے کہ یہ کام یقیناً عبدالجبار شاہ کا ہوگا، فائدہ اٹھاتے ہوئے اُس کے خلاف کچھ اقدامات کئے۔ اس دوران اُس کا بھائی اپنے مشترکہ مفادات کے تحفظ کے لئے دربار چلا گیا۔ عبدالودود نے عبدالجبار شاہ کے خلاف اپنی سازشیں جاری رکھیں۔ وہ بابوزئی اور دیگر کے ساتھ جرگے کر کے بونیر کا رختِ سفر باندھنے ہی والا تھا کہ عبدالجبار شاہ کی سنڈاکئی بابا

اور ماسم خان کے ساتھ اَن بن ہوگئی۔ لہٰذا عبدالودود نے عبدالجبار شاہ کی معزولی کی صورت میں حالات کو اپنے قابو میں کرنے کے لئے بونیر جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

عبدالجبار شاہ اور برطانوی حکومت

عبدالجبار شاہ میاں گل برادران اور دریا کے بائیں جانب کے قبائل کے معاملات ابھی تک طے نہیں ہوئے تھے کہ ادین زئی مسئلہ شدت اختیار کر گیا۔ دریا کے دائیں جانب سوات زیریں میں آباد ادین زئی قبائل یوسف زئی قبیلہ کی اُسی شاخ سے تعلق رکھتے ہیں جس سے کہ سوات بالا کے قبائل کا تعلق ہے۔ وہ اپنے سوات کے ہم قبیلہ قوتوں کی طرح نواب دیر کی رعیّت میں شامل تھے اور اپنے انہی بھائی بندوں کی طرح نواب کی حکومت سے نالاں اور ناخوش تھے۔ نواب کے محصولات جمع کرنے والے عملہ سے ناراض ہو کر ان میں سے کچھ نے سوات بالا کے اپنے رشتہ داروں سے مدد چاہی۔ سوات بالا کے لوگوں نے پہلے ہی پولیٹیکل ایجنٹ سے کہا تھا کہ وہ سوات اور دیر کی سرحد کا از سر نو تعین کرتے ہوئے ادین زئی علاقہ ان کے حوالہ کر دے اس لئے کہ یہ اُن کا ہے۔ عبدالجبار شاہ کے بھائی نے ان لوگوں کو خط کے ذریعے مشورہ دیا کہ محصول حکام کو اپنے علاقہ سے نکال دیں۔

اس علاقہ سے صرف چترال جانے والی سڑک ہی نہیں گزرتی تھی بلکہ چک درہ میں فوجیوں کی قیام گاہ بھی یہیں پہ تھی۔ یہ علاقہ چوں کہ ملاکنڈ سے بھی قریب تھا اس لئے یہاں سواتیوں کی کسی قسم کی کارروائی انگریز حکومت کے لئے بہت ہی پریشانی کا باعث بن سکتی تھی۔ چوں کہ جنگ عظیم برپا تھی جس میں ترک انگریز مخالف اتحاد کا حصہ تھے، اس لئے اس دوران مذہبی شخصیات کی اس علاقہ میں نقل وحرکت باعث تشویش تھی۔ اس سے 1897ء جیسی صورتِ حال پیدا ہو سکتی تھی جس کے لئے انگریز سرکار قطعاً تیار نہیں تھی۔ اس لئے اُس نے نواب دیر کو مشورہ دیا کہ وہ اپنا محصول جمع کرنے والا عملہ ادین زئی کے علاقہ میں نہ بھیجے، ادین زئی کے جرگہ کو پولیٹیکل ایجنٹ سے ملاقات کے لئے کہا اور تھانہ اور رانی زئی کے سرکردہ خوانین کے ذریعے سوات بالا کے جرگوں کو خطوط ارسال کئے جس میں انہیں ادین زئی سے دور رہنے کے لئے متنبہ کیا گیا تھا۔ خوانین یہ خطوط لے کر بنفسِ نفیس سوات بالا گئے تا کہ انہیں جلد بازی میں کوئی قدم اٹھانے سے روک سکیں۔

سوات بالا کے خوانین اور لوگ شاید یہ مشورہ مان لینے پر تیار ہو جاتے لیکن سنڈاکئی بابا صورتِ حال پر چھا گئے۔ وہ اُس وقت چنداخورہ (کبل) میں موجود نہیں تھے جب انگریز حکومت کے فرستادہ خوانین اور سوات بالا کے جرگہ کے درمیان بات چیت ہو رہی تھی لیکن انہیں اس میں شرکت کے لئے بلا بھیجا گیا۔ سوات بالا کے جرگہ کا

اصرار تھا کہ' اس میں سنڈاکئی بابا کی موجودگی ضروری ہے۔' وہ دوسرے دن صبح پہنچا۔ برطانوی حکومت کا پیغام جاننے اور اُن کے خطوط دیکھنے کے بعد اُس کا ردِّعمل شدید تھا۔ اُس نے وہ خطوط لے کر پھاڑ ڈالے اور ان ٹکڑوں کو پاؤں سے مسل ڈالا اور لوگوں کو انگریزوں کے خلاف جہاد کی تلقین کی۔ سرتور فقیر اور دیگر لوگوں کو بھی مدد کے لئے خطوط بھیجے گئے۔ لشکر بنانے کی تیاریاں شروع کی گئیں۔ مزہ کی بات یہ ہے کہ اس پورے معاملہ میں سید عبدالجبار شاہ (سوات کا بادشاہ) کو بالکل نظرانداز کر دیا گیا۔ ان سے مشورہ کرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔

17 جون 1915ء کو ملاکنڈ کے پولیٹیکل ایجنٹ نے کرنل لاکھ سے کہا کہ دو ڈبل کمپنی فوج چکدرہ بھیجی جائے۔ صوبہ کے چیف کمشنر نے صورت حال کو یوں بیان کیا۔

''طاقت کی نمائش ہی حملہ کو روکنے کا بہترین طریقہ ہے۔ چکدرہ کو بہر صورت مستحکم بنانا ہوگا۔ جنرل آفیسر کمانڈنگ فرسٹ ڈویژن سے میں نے کہہ دیا ہے کہ بغیر کوئی تاخیر کئے ملاکنڈ موو ایبل کالم کو چکدرہ روانہ کر دیا جائے۔ ممکن ہے کہ اس قدم سے سوات بالا کے لوگوں کی حوصلہ شکنی ہو لیکن اگر انہوں نے واقعتاً حملہ کر دیا اور انہیں اگر اس میں ذرا بھی کامیابی ملی تو پھر دریائے کابل سے دریائے سندھ تک کا پورا علاقہ اٹھ کھڑا ہوگا۔''

گائیڈز کا سوار دستہ درگئی پہنچا اور 19 جون کو شام چھ بجے چک درہ پہنچ گیا۔ 19 جون ہی کو نیک پی خیل اور سوات بالا کے جرگہ کی طرف سے پولیٹیکل ایجنٹ کو ایک خط ارسال کیا گیا جس میں ادین زئ مسئلہ کو موضوع بحث بناتے ہوئے کہا گیا کہ اگر ان کی بات مان لی جائے اور اس علاقہ کو نواب سے لے کر ان کے حوالہ کیا جائے تو انگریز سرکار کی سڑک، ٹیلی گراف، چھاؤنیوں اور چوکیوں کی حفاظت کو یقینی بنایا جائے گا لیکن ادین زئ کے لوگ خود علاقہ پر حکمرانی کریں گے یا عبدالجبار شاہ کو حکمران تسلیم کریں گے۔ انہوں نے مزید کہا کہ تھانہ اور الہ ڈھنڈ کے خوانین کی آمد اور پولیٹیکل ایجنٹ کے احکامات کی وجہ سے انہوں نے فی الوقت اپنی کارروائی روک دی ہے۔ انہوں نے اپنے معاملہ کو صوبہ کے چیف کمشنر کے سامنے بھی پیش کیا اور اُس سے کہا کہ سرتور فقیر ادین زئ کے لوگوں کی مدد کے لئے تیار تھا لیکن اُن کے کہنے پر رک گیا ہے۔ تاہم پولیٹیکل ایجنٹ نے انتہائی دھمکی آمیز لہجہ اختیار کرتے ہوئے ان سے کہا کہ برطانوی حکومت

''تمہیں ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دے گی کہ تمہارا جب جی چاہے اپنی تیاریوں کے ساتھ مداخلت پر آمادہ ہو جاؤ۔ اس لئے میں تم سے کہتا ہوں 'ادین زئ سے دور رہو۔' ذرا یاد کرو کہ جب تم نے ہوش و حواس کھو کر سرتور فقیر کا ساتھ دیا تو کیا ہوا۔ تمہارے اور تمہارے ملاؤں کے رویّہ نے مجھے فوج بھیجنے پر مجبور کر دیا ہے جو کہ اب چک درہ میں موجود ہے اور میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اگر تم میں سے کسی ایک نے بھی سرکاری سڑک پر قدم رکھا تو میں اسے تمہارے خلاف استعمال کروں گا اور قیامت کے دن اس کے نتائج کی ذمہ داری تمہاری ہوگی۔''

پولیٹیکل ایجنٹ نے 22 جون 1915ء کی اپنی رپورٹ میں لکھا کہ' سوات بالا میں موجود تناؤ میں لگتا ہے کمی

آئی ہے۔اور خیال ہے کہ کوئی جرگہ مجھ سے ملنے آئے لیکن چیف کمشنر اور مجھے ارسال کردہ خطوط کے جواب کا انتظار ہو رہا ہے۔'اس موقع پر عبدالجبار شاہ بیچ میں آتا ہے اور پولیٹیکل ایجنٹ کے نام اپنے ایک خط میں ادینزئی معاملہ کی وکالت کرتے ہوئے یہ بتانے کی کوشش کرتا ہے کہ یہ بات اتنی بڑھ کیوں گئی۔اس نے گلہ کیا کہ اسے کوئی خط نہیں بھیجا گیا اور انگریز حکومت کو اپنی وفاداری کی یقین دہانی کراتے ہوئے کہا کہ اس پر آزمائشی طور پر اعتماد کر کے پرکھا تو جائے۔مزید یہ کہ 'ایرے غیرے لوگوں کی سوچ کو حکومت کی (عبدالجبار شاہ کی) سوچ نہ سمجھا جائے۔'پولیٹیکل ایجنٹ نے جواب میں کہا کہ 'وہ صرف نمائندہ جرگہ سے بات کرے گا۔' تاہم چیف کمشنر نے پولیٹیکل ایجنٹ سے کہا' کہ ہمارا عبدالجبار شاہ سے کوئی جھگڑا نہیں۔اگر وہ ایک نمائندہ جرگہ لے کر آتا ہے تو تم ملنے سے انکار مت کرنا۔'

عبدالجبار شاہ نے چیف کمشنر کو ایک طویل خط لکھا جس میں نواب دیر کے خلاف سوات کے معاملات کو اٹھایا اور خود کو انگریز سرکار کا حامی قرار دیا۔9 جولائی 1915ء کو سوات بالا کے خوازوزئی شاخ کے قبائل کا جرگہ پولیٹیکل ایجنٹ سے ملاقات کے لئے آیا۔اس ملاقات کے نتیجہ کو 'مکمل طور پر اطمینان بخش قرار دیا گیا۔'اس مشکل وقت میں جن مختلف لوگوں نے برطانوی حکومت کا ساتھ دیا ان کی مدد اور خدمات کی تعریف کرتے ہوئے پولیٹیکل ایجنٹ نے میاں گل برادران کی بیش بہا خدمات کا خصوصی تذکرہ کیا۔

صورتِ حال بہتر ہوئی لیکن زیادہ لمبے عرصے کے لئے نہیں۔سنڈاکئی بابا، حاجی صاحب آف ترنگزئی اور دیگر انگریز مخالف عناصر سے رابطہ میں تھے۔بالآخر سرتور فقیر نے بھی سنڈاکئی بابا کی مخالفت ختم کر کے اگست 1915ء میں انگریزوں کے خلاف ایک دوسرے سے ہاتھ ملا لئے۔قبائل کا ردِعمل چوں کہ کوئی زیادہ گرم جوشانہ نہ تھا اس لئے 20 اگست کو سرتور فقیر نے اپنے گھر کی راہ لی اور 'سنڈاکئی بابا بھی کڑاکڑ کے راستے اپنے چند حامیوں کے ہمراہ بونیر روانہ ہوئے۔'

سنڈاکئی بابا کے رخصت ہونے سے لوگ اور بادشاہ (عبدالجبار شاہ) پریشان ہو گئے۔لوگ نواب دیر کے خوف کی وجہ سے اس کی حمایت کے خواہاں تھے اور بادشاہ کی پریشانی کا سبب یہ تھا کہ اس نے حال ہی میں ڈپٹی کمشنر ہزارہ کو اپنی وفاداری کا یقین دلایا تھا اور یہ وعدہ بھی کیا تھا کہ وہ سنڈاکئی بابا کو رام کرنے کے لئے اپنا اثر ورسوخ استعمال کرے گا۔پھر اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ اگر یہ ملا بیچ میں سے نکل جائے تو اس کی حکومت کا بڑا سہارا ختم ہو جائے گا۔

بادشاہ نے پہلے تو اپنے آدمی بھیج کر اسے بلانے کی کوشش کی۔ان کے ناکام ہونے پر وہ خود گیا اور اسے واپس آنے کے لئے کہا۔وہ اس شرط پر واپس آنے پر راضی ہوا کہ بادشاہ اور قبائل اس کے ساتھ مل کر ایک متحدہ اقدام کے لئے تیار ہوں۔چیف کمشنر نے، جو اس وقت ملاکنڈ کے دورہ پر آیا ہوا تھا، معاملات کی یوں تصویر کشی کی۔'میاں گل برادران اخوند آف سوات کے پوتے، جو کہ بادشاہ اور سنڈاکئی بابا سے حسد کرتے ہیں ان کے خلاف سازشوں میں

مصروف ہیں اور ہمارے ساتھ مسلسل رابطے میں ہیں'۔

سنڈاکئی بابا اپنے قبائلی حامیوں کے ساتھ دریائے سوات کے بائیں کنارے پر تھے جب کہ سوات کے بادشاہ عبدالجبار شاہ دریا کے دائیں کنارے والے لشکر کے ساتھ تھے۔ 28 و 29 اگست کی رات کو جنرل بیٹن کے ملاکنڈ موو ایبل کالم کے کیمپ پر حملہ کیا گیا۔ یہ خاصا شدید حملہ تھا جو چھ گھنٹے تک جاری رہا۔ جنرل بیٹن کی توپوں نے سواتیوں پر اتنی شدید گولہ باری کی کہ انہیں پسپا ہونے پر مجبور کردیا۔ 29 اگست کی سہ پہر سنڈاکئی بابا غائب ہو گئے لیکن انہیں ڈھونڈ کر چند اخورہ لایا گیا۔ اس لئے کہ دائیں جانب کے قبائل نواب دیر کے خلاف اُن کی مدد سے محروم نہیں ہونا چاہتے تھے۔

انگریز سرکار کے خلاف یہ اقدام ناکام ہوگیا۔ سنڈاکئی بابا بھی اس دوران سوات سے چلے گئے۔ لیکن اس معاملہ نے عبدالجبار شاہ کی کمزوری برطانوی حکومت پر عیاں کردی۔ اپنے لوگوں پر اُس کی کمزور گرفت نے اُس کی حیثیت کو مشکوک بنادیا۔ فرنٹیئر کرائمز ریگولیشن 1901ء کی شق 21 کی ذیلی شقوں ڈی اور ای کے تحت سوات بالا اور بونیر کا برطانوی حکومت نے بہ طور سزا 25 اگست 1915ء کو معاشی گھیراؤ کرلیا۔

عبدالجبار شاہ اور نواب دیر

نواب کی فوجوں کو سوات بالا سے نکال باہر کر کے ریاست سوات کے قیام کا اعلان کیا گیا تھا لیکن نواب اس علاقہ کے ہاتھ سے نکل جانے کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت کرنے والا نہیں تھا لیکن اُس کی پوزیشن دیر میں موجود بے چینی اور باجوڑ کی طرف سے اُس کی حکومت کی مخالفت کی وجہ سے غیر محفوظ تھی۔ اُسے اپنے خلاف ہونے والی ایک سازش کا قبل از وقت پتہ چلا۔ اس میں خان آف باڑوہ (سید احمد خان)، اُس کا سوتیلا بھائی (محمد عیسیٰ خان)، بانڈئی میدان کا سردار خان، سیند علاقہ کے کچھ خوانین اور عبدالجبار شاہ شامل تھے۔ منصوبہ یہ تھا کہ سب یک وقت اُس پر حملہ کردیں۔ اس وقت تو نواب اپنے تحفظ کے مسائل میں گھرا ہوا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ جیسے ہی اُس کی پوزیشن مضبوط ہوگی وہ سوات میں پھر قسمت آزمائی کرے گا۔ اپنے اندرونی مسائل کو حل کرنے کے لئے اُس نے اپنی بیوی کو پائندہ خیل اور سلطان خیل قبائل کے پاس بھیجا تا کہ اُن کو مفاہمت پر راضی کیا جا سکے۔ برطانوی حکومت نے نواب کے مسائل حل کرنے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انگریزوں کو خدشہ تھا کہ

''اگر دیر کے نواب کو دیر سے نکال باہر کردیا گیا تو دیر کی ریاست طوائف الملوکی کا شکار ہو جائے گی۔ اگر ایسا ہوگیا تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ یہ قبائل ایک غیر مذہبی حکومت کے منظر سے ہٹتے ہی سنڈاکئی ملا یا اسی طرح کے اور کسی ملا کی سربراہی میں جہاد پر نکل کھڑے ہوں گے اور سب مل کے چک درہ میں موجود انگریز فوج پر حملہ کردیں گے اور اگر ممکن ہوا تو ملاکنڈ پر بھی چڑھ دوڑیں

ئے۔

دوسری جانب عبدالجبار شاہ اور سواتیوں نے سوات زیریں میں واقع ادین زئی علاقہ پر اپنے دعویٰ کو جاری رکھا جو کہ نواب کے قبضہ میں تھا۔ انہیں اس بات کا خوف بھی دامن گیر تھا کہ نواب کہیں سوات بالا پر حملہ نہ کردے۔ اس لئے وہ سنڈاکئی بابا کی مدد کھونا نہیں چاہتے تھے۔ اس لئے کہ قبائل کی نظر میں اور کوئی ایسا شخص موجود نہیں تھا جس کی قیادت میں وہ متحد ہو کر نواب کا مقابلہ کرسکیں۔ ان کا نام نہاد بادشاہ تو 'تقریباً نہ ہونے کے برابر تھا۔' جہاں تک عبدالجبار شاہ کا تعلق ہے تو 'اُس کے لئے تو سنڈاکئی بابا سب سے بڑا سہارا تھا۔'

عبدالجبار شاہ نے تزویراتی اہمیت کے حامل دروں پر قلعے تعمیر کرکے نواب کے خلاف اپنی پوزیشن مضبوط بنانے کی کوششیں جاری رکھیں۔ اُس نے ایک بار پھر سوات کے چیدہ چیدہ نمائندہ لوگوں کو بلا کر اُن سے کہا کہ وہ صاف صاف الفاظ میں انہیں بتائیں کہ کیا وہ چاہتے ہیں کہ وہ سوات میں رہیں اور نواب کے خلاف اس جنگ میں ان کی قیادت کریں۔ اگر وہ ایسا چاہتے ہیں تو کیا وہ قسم کھا کر اُن کا ساتھ دینے کا عہد کریں گے۔ اگر وہ ایسا کرنے کے لئے تیار ہیں تو ٹھیک ہے پھر وہ یہاں رک کر ان کی رہنمائی کریں گے اور اگر اسے اس کی یقین دھانی نہیں کرائی جاتی تو وہ یہاں سے جانے کے لئے تیاری کرے۔ سب قبائل نے متفقہ طور پر اُس کی وفاداری کا عہد کیا۔ بلکہ عزی خیل اور جنکی خیل قبائل نے بھی سوات کے لئے جنگ میں اُس کا ساتھ دینے کا عزم ظاہر کیا جو ابھی تک اُسے عشر دینے پر تیار نہیں تھے۔

تقریباً ایک سال تک نواب دیر انگریز سرکار کی مدد سے اپنی پوزیشن کو برقرار رکھنے کی تگ و دو میں لگا رہا۔ مارچ 1916ء میں عبدالجبار شاہ نے ادین زئی علاقہ پر حملہ کرکے اسے شواتک اپنے قبضہ میں لے لیا۔ مارچ کے آخر تک نواب نے فیصلہ کیا کہ اب سوات کو دوبارہ فتح کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ میاں گل برادران نے بھی اپنا پورا وزن اُس کے پلڑے میں ڈال دیا۔ اور 30 مارچ 1916ء کو وہ ادین زئی پر چڑھ دوڑا۔ اس موقع پر برطانوی حکومت ایک طرف ہوگئی تا کہ وہ اپنی جنگ خود لڑ سکے۔ نواب نے شوا کے مقام پر ہونے والی دو روزہ جنگ میں سواتیوں کو شکست دی اور وہ اپنے بادشاہ کے ساتھ سوات بالا کی طرف دھکیل دیئے گئے اور شموزئی تک کا علاقہ پھر نواب دیر کے قبضہ میں آ گیا۔ اُس کے لشکر نے پیش قدمی کی اور نیک پی خیل میں گالوچ اور دیولئی کے مقامات پر غیر مربوط سی جنگیں ہوئیں۔ نواب نے مقامی لوگوں میں اپنا ایک حامی گروہ بنانے کی کوشش کی لیکن وہ ناکام رہا اور اُس کی افواج شکست کھا کر شموزئی اور ادین زئی کی طرف پسپا کر دی گئیں۔

صوبہ کی خفیہ ڈائری (سیاسی) سے پتہ چلتا ہے کہ عبدالجبار شاہ نے سوات کے لشکر کو اپنی اس فتح کو مزید مستحکم کرنے کے لئے پیش قدمی جاری رکھ کر نواب کو سوات زیریں کی سرزمین سے بھی نکال باہر کرنے پر آمادہ کرنے کی

کوشش کی لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ تاہم اُس وقت کی انتظامیہ کی رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ دراصل برطانوی حکومت نے انہیں مزید پیش قدمی سے روک دیا۔ دوسرے سال کچھ زیادہ اہم جھڑپیں نہیں ہوئیں۔ نواب سوات میں اپنا کوئی حامی گروہ بنانے کی تگ ودو کرتا رہا جب کہ عبدالجبار شاہ اور سواتی قبائل اندرونی سیاسی مسائل میں الجھے رہے۔ سنڈاکئی بابا تو مختلف قسم کے تنازعات کوحل کرنے میں مصروف رہے یا حاجی صاحب ترنگزئی، ہندوستانی مجاہدین اور ترک ایلچیوں کے ساتھ رابطوں میں لگے رہے تاکہ لوگوں کو انگریزوں کے خلاف جنگ کے لئے تیار کیا جا سکے۔

مئی 1917ء میں شموزئی کے مقام پر دوبارہ دونوں حریفوں میں پنجہ آزمائی شروع ہوئی۔ عبدالجبار شاہ کے خلاف سواتیوں میں پیدا ہونیوالی ممکنہ بے اطمینانی اور پھوٹ کو محسوس کرتے ہوئے اس بار میاں گل برادران نے سواتیوں کا ساتھ دیا تاکہ اُن کے دلوں میں اپنے لئے جگہ بنا سکیں۔ جنگ چھڑنے سے پہلے امن کے معاہدہ کے لئے سوات کی طرف سے عبدالودود اور دیر کی جانب سے اخونزادہ حضرت سید کے درمیان ہونے والی بات چیت ناکام ہوگئی۔ دونوں فوجیں ایک مہینے تک ایک دوسرے کے آمنے سامنے ٹھہری رہیں لیکن خوراک کی کمی کی وجہ سے 20 جون 1917ء کو واپس اپنے اپنے گھروں کی طرف لوٹ گئیں۔ عبدالجبار شاہ کے عہد کے بقیہ حصہ میں دونوں فریق جنگ سے باز رہے۔

عبدالجبار شاہ اور اندرونی صورتِ حال

عبدالجبار شاہ اپنی پوزیشن مستحکم کرنا چاہتا تھا۔ اس مقصد کے لئے اُس نے مینگورہ کے قریب ایک قلعہ بند گھر کی تعمیر شروع کی۔ سوات کے مضبوط خوانین اور گروہوں میں بٹے ہوئے معاشرہ کو اپنے قابو میں رکھنے کے لئے درکار حکمتِ عملی اور قوت کی عبدالجبار شاہ میں کمی تھی۔ اُس کی پوزیشن خاصی کمزور تھی۔ اس پر مستزاد یہ کہ اُسے کئی محاذوں پر لڑنا پڑ رہا تھا۔ اُسے ایک دوسرے کے مخالف عناصر کی ایک دوسرے سے متصادم اور مخالف خواہشات و مطالبات کو پورا کرنے کا ناممکن العمل کام سونپا گیا تھا۔ اکثر اوقات یہ مطالبات اُس کے اپنے نظریات اور منصوبوں کے بھی خلاف ہوتے تھے۔ پھر مسلسل بیرونی مسائل میں اُلجھے ہونے کی وجہ سے اُس کے پاس مفاد عامہ اور عوامی فلاح و بہبود کے لئے کچھ کرنے کی فرصت کہاں تھی تاکہ وہ عام لوگوں کے مسائل میں تھوڑی سی کمی لا سکے۔

فروری 1916ء میں سید حضرت جمال المعروف ناواگئی باچا کا انتقال ہوگیا جو کہ نظم حکومت چلانے میں اُس کا دستِ راست تھا۔ چند مہینے بعد ہی لوگ عبدالجبار شاہ کو ناپسند کرنے لگے۔ وہ ان سے صرف عشر ہی نہیں لیتا تھا بلکہ ہر

قبیلہ سے سرکاری فوج کے لئے 120 افراد کی فراہمی کا مطالبہ بھی تھا۔ ماسم خان المعروف تو تکے خان نے اُس سے کہا کہ سواتیوں کو امید تھی کہ وہ اپنے ساتھ باہر سے لوگ لائے گا جو اُن کے لئے لڑیں گے۔ جس پر جواباً اُس نے کہا کہ باہر سے لوگ مدد کے لئے تب آئیں گے جب وہ ایک مضبوط حکومت بنانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ اس پر ماسم خان نے اُس سے کہا کہ وہ ہندوستانی مجاہدین سے مدد لینے جائے گا۔ عبدالجبار شاہ نے فی گھرانہ ایک روپیہ ٹیکس بھی عائد کیا۔ یہ بھی لوگوں کی ناراضگی کا سبب بنا۔

عبدالجبار شاہ پر ایک اور الزام یہ بھی لگایا گیا کہ خزانہ میں جمع ہونے والا سارا پیسہ نواب دیر کے خلاف دفاعی نظام کو مضبوط بنانے پر نہیں لگایا جا رہا۔ دوسرا یہ کہ انصاف کی فراہمی نہیں۔ دیگر یہ کہ اُس کے زیر انتظام علاقہ میں قتل کے واقعات میں اضافہ ہو گیا ہے۔ انگریز سرکار کی جانب سے کیا جانے والا محاصرہ اور عائد کردہ پابندیوں کی وجہ سے لوگوں کی مشکلات میں بے حد اضافہ ہو گیا تھا اور وہ اس مسلسل تکلیف دہ کیفیت سے تنگ آ گئے تھے۔

نیک پی خیل کا زرین خان جو ایک طاقت ور اور با اثر شخصیت کا مالک تھا اور جو اُس پانچ رکنی کونسل کا رکن تھا جو عبدالجبار شاہ کی آمد سے پہلے نظم و نسق چلانے کے لئے بنائی گئی تھی۔ وہ عبدالجبار شاہ کی آمد کے وقت سے ہی اُس کے خلاف اور نواب دیر کا حامی تھا۔ وہ خود حکمران بننے کا بھی خواہش مند تھا۔ چوں کہ وہ ایک مضبوط حریف اور اُس کے ساتھ ساتھ دیر کے نواب کا حامی بھی تھا، اس لئے عبدالجبار شاہ نے اُس کے خلاف ایک سازش تیار کی۔ 15 نومبر 1916ء کی رات کو اُسے بانڈئ، نیک پی خیل میں قتل کر دیا گیا۔ اس قتل میں نیکپی خیل ہی کے کچھ زرین خان مخالف لوگوں نے عبدالجبار شاہ کے کچھ ملازمین کے ساتھ مل کر یہ کام کیا۔ اس قتل سے سوات میں غم و غصہ کی ایک کیفیت پیدا ہوگئی۔ حالات کو قابو میں کرنے کے لئے سنڈاکئی بابا کو بلا بھیجا گیا۔ وہ اس وقت سوات کوہستان کی سرحد پر تیرات نامی جگہ میں تھے۔

نیک پی خیل، بابوزئی اور متوڑیزئی کی آدھی آبادی نواب دیر کی حمایت پر آمادہ ہوگئی اور اُسے بلانے کے لئے پیغامات بھیجے گئے۔ ان حالات سے فائدہ اٹھانے کے لئے عبدالودود واپس سیدو چلا آیا تاکہ عبدالجبار شاہ کے خلاف موثر اقدامات کر سکے۔ عبدالجبار شاہ نواب دیر کے سوتیلے بھائی اور حریف محمد عیسیٰ خان کی معیت میں چندا خورہ آیا تاکہ سوات بالا کے لوگوں پر مشتمل ایک لشکر تشکیل دے سکے اور نیک پی خیل کے ساتھ اپنے معاملات ٹھیک کر سکے۔ بعد میں اُس نے پولیٹیکل ایجنٹ کو خط ارسال کرکے کہا کہ 'سوات کے مسئلہ کا بہترین حل یہ ہے کہ انگریز سرکار اس پر قبضہ کر لے۔'[1]

سنڈاکئی بابا سے (جو کہ عبدالجبار شاہ کی حکومت کے لئے ریڑھ کی ہڈی یا مضبوط ترین ستون کی حیثیت رکھتے

تھے) اشتراک عمل رفتہ رفتہ کمزور ہوگیا اور ان کے تعلقات خراب ہوگئے۔ اس کی بڑی وجہ سنڈاکئی بابا کی طرف سے مسلسل انگریزوں کے خلاف جہاد پر اصرار تھا جب کہ عبدالجبار شاہ کی پوری کوشش تھی کہ اُن کے ساتھ تعلق کو کسی طور خراب نہ ہونے دیا جائے۔ سنڈاکئی بابا نے عبدالجبار شاہ کے مخالفین سے خط و کتابت کرکے انہیں اس بات پر اکسایا کہ عبدالجبار شاہ قادیانی ہونے کی وجہ سے جہاد کے خلاف ہے اس لئے اُسے نکال باہر کرنا چاہئے۔ حاجی صاحب آف ترنگزئی کا بیٹا ایک خط لے کر چرکنڈ روانہ ہوا جس پر سنڈاکئی ملا، کچھ دیگر میاگان و ملاؤں اور سوات کے ملکوں کے دستخط تھے۔ جس کا نفس مضمون یہ تھا کہ عبدالجبار شاہ قادیانی ہے اس لئے سوات کا بادشاہ ہونے کا اہل نہیں ہے۔ عبدالجبار شاہ نے نیک پی خیل کا مسئلہ تو حل کرلیا لیکن سنڈاکئی بابا اور ماسم خان کے ساتھ اُس کا رشتہ منقطع ہوگیا۔

جغرافیائی سیاسی اور تزویراتی پہلو

شمال مغربی سرحد کی تصفیہ طلب صورتِ حال اور برطانوی حکومت کی جنگ عظیم اول کے دوران حالات کو جوں کا توں رکھنے کے لئے تشویش کو اس تناظر میں بآسانی سمجھا جاسکتا ہے کہ ملک میں موجود بہترین افواج کو پہلے ہی انڈیا سے باہر محاذوں پر بھیج دیا گیا تھا۔ بیرونی صورتِ حال اور اُس میں برطانیہ کے کردار کو سمجھے بغیر سوات کی پوزیشن ، واقعات اور حالات میں تغیرات کو ان کے حقیقی جغرافیائی، سیاسی اور تزویراتی سیاق و سباق میں نہیں سمجھا جاسکتا۔

نواب دیر کے خلاف سوات میں ہونے والی بغاوت، ریاست کا قیام، عبدالجبار شاہ کا تقرر اور اُس کے نتیجہ میں پیش آنے والے واقعات جنگ عظیم اول کے دوران ہی پیش آئے۔ ترکی جرمن اتحاد کا حصہ بن کر نومبر 1914ء کو جنگ میں شامل ہوا۔ ترکی کی شمولیت کی وجہ سے بڑی تبدیلی آئی اور اس قسم کی افواہیں ہر طرف پھیل گئیں کہ قیصر بلکہ پوری جرمن قوم نے اسلام قبول کرلیا ہے اور یہ کہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا ظہور ہوا ہی چاہتا ہے۔ اس سے مذہبی رہنماؤں کو زبردست تحریک ملی کہ وہ لوگوں کو جہاد پر ابھار سکیں۔

> ''برطانوی حکومت کے لئے اندرونی صورتِ حال اس وجہ سے اور بھی خطرناک ہوگئی تھی کہ حریت پسندوں نے مسلح کارروائیوں سے بنگال، مغربی ہندوستان اور پنجاب میں حالات کو خاصا مخدوش کردیا تھا۔ انہیں مسلمانوں کی طرف سے خصوصاً یہ خوف دامن گیر تھا کہ کہیں وہ ترکی کے ملت اسلامیہ کے پروپیگنڈے اور فرنٹیئر میں بغاوت کی ہوائیں چلنے سے حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے نہ ہوں۔''

چوں کہ زیادہ تر افواج جنگ میں شرکت کے لئے برصغیر سے جاچکی تھیں اور مزید قبائلی سازشیں برطانوی حکومت کے لئے مسائل پیدا کرسکتی تھیں، اس لیے اُس وقت کی صورتِ حال کو احاطہ تحریر میں لاتے ہوئے کہا گیا ہے کہ امیر افغانستان کی جانب سے غیر جانبدار بننے کا اعلان اور ترکی کی اس میں شرکت کو جنگ جو یانہ حماقت کہہ کر اس

کی مذمت بہت ہی بیش بہا بات ہے، تاہم اب بھی قبائلی علاقوں کی صورتِ حال انتہائی مخدوش ہے۔' اس وجہ سے برطانوی حکومت کے لئے سوات کے حالات و واقعات انتہائی حساس نوعیت کی چیز تھی۔

1915ء میں برطانوی مقبوضہ علاقہ میں کئی بار مذہبی رہنماؤں کی مسلسل جہاد کی ترغیب دینے پر حملے ہوئے۔ حاجی صاحب آف ترنگزئی نے سوات اور بونیر میں 'اسلام خطرے میں ہے' کا نعرہ لگایا جب کہ سوات اور بونیر کے 'سارے مولوی حضرات مسلسل لوگوں کو یہ کہہ کہہ کر بھڑکا رہے تھے اور جوش دلا رہے تھے کہ برطانیہ کے پاس اب مزید فوج نہیں رہی۔ یہ کہ جرمنی جنگ جیت رہا ہے۔ یہ کہ ترکی افغانستان میں داخل ہو چکا ہے۔ اور یہ کہ بالآخر وہ دن آپہنچا ہے۔'

جولائی 1915ء میں کچنر (Kichener) کی طرف سے مزید باقاعدہ برطانوی فوج کے مطالبہ کو یہ کہہ کر رد کر دیا گیا کہ 'اب صرف آٹھ انگریز بٹالین فوج رہ گئی ہے جو کہ ساری کی ساری سرحد میں متعین ہے۔ ہارڈنگ کے الفاظ میں سرحد کی صورتِ حال کے ساتھ مذاق نہیں کیا جا سکتا جہاں کہ امن کے نغمہ کو جنگ کا ترانہ بننے میں دیر نہیں لگے گی۔' شمال مغربی سرحد میں قیامِ امن اس لئے بھی زیادہ مشکل مسئلہ بن گیا تھا کہ ہندوستان اور باہر سے برطانیہ مخالف سارے عناصر یہاں اکٹھے ہو گئے تھے جیسے کہ ہندوستانی مجاہدین، ترک حکومت کے نمائندے اور حاجی صاحب آف ترنگزئی۔ اس طرح یہ علاقہ اُن کے لئے صرف ایک دوسرے سے ملاقات کی جگہ نہیں تھی بلکہ وہ یہیں سے اپنی کارروائیاں بھی کرتے تھے۔

سوات میں صورتِ حال زیادہ مخدوش اس وجہ سے تھی کہ یہاں سرتور فقیر اور سنڈاکئی بابا اپنے اثر و رسوخ کے ساتھ موجود تھے۔ سرتور فقیر 1897ء کی بغاوت کا ہیرو تھا۔ حالاں کہ اس کے بعد اُسے اپنے مقصد میں کوئی خاص کامیابی نہیں ملی تھی لیکن اب بھی وہ سرگرم تھا۔ اور سنڈاکئی بابا 'جو اس سے پہلے انگریز حکومت کے لئے کبھی کوئی خطرہ نہیں بنے اور جو کئی بار پولیٹیکل ایجنٹ کو اس بات کی یقین دھانی کرا چکے تھے کہ وہ کبھی بھی انگریز سرکار کے لئے کوئی مشکل پیدا نہیں کریں گے۔' لیکن جب اگست 1915ء میں برطانوی حکومت نے سواتیوں کو ادین زئی سے دور رہنے کے لئے کہا اس کے بعد سے وہ انگریزوں کی مخالفت میں پیش پیش رہے۔ حالاں کہ وہ دونوں لوگوں کو جہاد پر آمادہ کرنے میں ناکام رہے لیکن وہ اس منزل کی تلاش میں سرگرم ضرور رہے۔ وہ تمام برطانیہ مخالف عناصر سے رابطہ میں رہے جو کہ باجوڑ اور بونیر میں موجود تھے۔ سرتور فقیر کا جنوری 1917ء میں 90 سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ اُس کی وفات پر برطانوی سرکاری تبصرہ کے الفاظ یوں ہیں۔

''اس کی موت سے ملاکنڈ ایجنسی کے امن کو لگا ہوا مسلسل خطرہ ختم ہو گیا ہے اور یہ کہ اپنی زندگی کے آخری 20 سال اُس کے ذہن پہ کافروں سے جنگ کا خبط سوار رہا۔ اس دوران حالات کو خراب کرنے کا کوئی موقع اُس نے ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔

اگست 1915ء میں سرکاری افواج پر حملہ آور لشکر کے ساتھ تھا۔ اس کی موت سے ایجنسی اس خطرہ سے پاک ہوگئی ہے۔"

تاہم سنڈاکئی بابا تمام برطانیہ مخالف عناصر کے ساتھ مل کر جہاد کی ترغیب وتلقین کے کام میں مصروف رہا۔ عبدالجبار شاہ نے خود پولیٹیکل ایجنٹ کو اطلاع دی کہ دو ترک ایلچی سوات بالا میں اُس کے ساتھ ہیں۔ اسی طرح دو اور ایلچی ہندوستانی شدت پسندوں کے ساتھ بونیر (سمستہ) میں مقیم ہیں۔ یہ آخری انہیں بڑے بم بنانے کے طریقے سکھا رہے تھے اور یہ کہ اس کے بعد وہ سوات جانے والے ہیں۔ سنڈاکئی بابا نے ان ایلچیوں اور ہندوستانی مجاہدین کے ہمراہ سوات بالا کا دورہ کیا اور پورن چکیسر اور کوہستان کے جرگوں کو خطوط کے ذریعے اس بات کی ترغیب دی کہ "جب سوات کے لوگ شموزئی اور ادینزئی نواب سے واپس لینے کے لئے جنگ شروع کریں تو وہ لوگ آکر اس کی مدد کریں تا کہ وہ مل کر انگریز حکومت پر حملہ کریں اس لئے کہ سواتی تو اس کے لئے تیار نہیں ہیں۔"

برطانوی حکومت نے نجی طور پر سوات کے بارسوخ افراد کو پیغامات بھیجے کہ اگر وہ ادینزئی آئیں تو اس بات کا خاص خیال رکھیں کہ سنڈاکئی بابا حکومت کے لئے کوئی مسئلہ پیدا نہ کر سکے۔ پولیٹیکل ایجنٹ کو یقین دہانی کرائی گئی کہ سنڈاکئی بابا کو نیک پی خیل علاقہ سے آگے جانے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

مجاہدین اور دیگر برطانیہ مخالف عناصر کے دورے جاری رہے۔ باجوڑ ملا اور حاجی صاحب آف ترنگزئی نے سنڈاکئی بابا کو پانچ شیخوں کے ذریعے پیغام بھیجا کہ وہ کسی بھی وقت جہاد کے لئے اُس کی مدد کو تیار ہیں۔ سنڈاکئی بابا نے ان کو مجاہدین کے پاس بونیر بھیج دیا۔ جولائی 1917ء کو مولوی تاج محمد نے کابل سے ایک بڑی رقم لا کر باجوڑ، سوات اور اباسین کی وادی کے قبائل کو تیار کرنے کی کوشش کی۔ "پروویژنل گورنمنٹ آف انڈیا[2]" کے ارکان نے امیر افغانستان کو برطانیہ کے خلاف جہاد کا اعلان کرنے کی ترغیب دی۔ وہ لوگ کابل سے حاجی صاحب ترنگزئی کے ساتھ قریبی رابطے میں تھے اور وہ سوات میں سنڈاکئی بابا کے ساتھ رابطہ بنائے ہوئے تھے۔ افغانستان میں موجود برطانیہ مخالف عناصر ترک نمائندوں پر تکیہ کئے ہوئے تھے کہ وہ قبائل سے روابط کریں گے۔ ان کے اقدامات کو نصراللہ خان کی مالی امداد حاصل تھی۔

'جرمن مشن' اور 'ترک مشن' نے افغانستان کے دورے کئے۔ روس میں ابھی کیمونسٹ انقلاب تو نہیں آیا تھا لیکن 1917ء میں اُس کی ابتدائی ہلچل محسوس ہونے لگی تھی۔ اس خبر سے برطانیہ مخالف عناصر اور قبائلی علاقہ میں ایک نئی قوت محسوس ہونے لگی۔[3]

اکتوبر 1915ء میں جب میاں گل برادران کو سوات سے تقریباً بے دخل کر دیا گیا اور وہ بالکل پس منظر میں چلے گئے تو اس پر اُس وقت کے پولیٹیکل ایجنٹ نے ایک بہت ہی دل چسپ تجزیہ لکھا۔ اس سے آنے والے دنوں میں

سوات کی سیاسی صورتِ حال اور ستمبر 1917ء میں عبدالجبار شاہ کے زوال پر بھی اچھی روشنی پڑتی ہے۔ اس سے میاں گل برادران، عبدالجبار شاہ اور سنڈاکئی بابا کے بارے میں انگریزوں کے نقطہ نظر کا پتہ چلتا ہے۔ یہ برطانوی حکومت کے خدشات کے بارے میں بھی بتاتا ہے اور اس سے ہمیں یہ سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے کہ سوات میں حکمران کی اس تبدیلی کے عوامل میں برطانوی عنصر کو کسی طور نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ پولیٹیکل ایجنٹ نے صورتِ حال کا اس طرح تجزیہ کیا۔

''سوات میں فی الوقت (جولائی 1915ء) وہاں کا نیا بادشاہ، عبدالجبار شاہ، سنڈاکئی بابا کی مدد سے اپنی پوزیشن مستحکم کرنے میں مصروف ہے۔ وہ دریا کے دونوں کناروں کے قبائل پر اپنی حکومت قائم کرنے کی تگ ودو میں لگا ہوا ہے۔ دریا کے بائیں جانب اُس کے اصل حریف میاں گل برادران تھے جو مشہور اخوند آف سوات کے پوتے ہیں۔ جولائی (1915ء) میں ان کی جانب سے بائیں کنارے کے لوگوں پر اپنی حکومت قائم کرنے اور ان سے بزور ٹیکس وصولی کی کوشش نے لوگوں کو ان کے خلاف کر دیا۔ جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نئے بادشاہ نے دائیں کنارے سے ایک لشکر بھیج کر میاں گل برادران کو یہاں ان کی مقتدر حیثیت سے محروم کر دیا جو کہ ابھی تک انہیں اس جانب حاصل تھی۔ میاں گل برادران کے اقتدار کا اس طرح گھٹ جانا اور ان کی جگہ ایک اجنبی کا مقتدر ہو جانا ہماری حکومت کے لئے نیک فال نہیں ہے۔ اس لئے کہ میاں گل برادران ہمیشہ امن وامان اور ضابطہ وقانون کی حمایت کرتے رہے ہیں اور (انگریز) حکومت سے ان کے تعلقات بہت اچھے رہے ہیں۔ سوات میں 1849ء کی تاریخ دہرائی جارہی ہے۔ جیسے اُس وقت ایک برائے نام بادشاہ کو تخت پر بٹھا دیا گیا تھا لیکن حقیقت میں اختیارات اخوند آف سوات کے ہاتھ میں تھے۔ اس طرح اب عبدالجبار شاہ کو برائے نام بادشاہ بنالیا گیا ہے لیکن اختیار سنڈاکئی بابا کے ہاتھ میں ہے لیکن فرق یہ ہے کہ اخوند ایک مقامی شخص تھا اور یہاں سے اُس کا مفاد وابستہ تھا۔ پھر یہ کہ وہ اعتدال پسند تھا اور ہمیشہ حکومت کے جائز مطالبات ماننے کے لئے تیار رہتا تھا جب کہ سنڈاکئی ملا ایک اجنبی ہے جس کا یہاں سے کوئی مفاد وابستہ نہیں۔ پھر یہ کہ وہ حکومت کا کھلم کھلا دشمن ہے اور جو کہ اس وقت اپنی پوری طاقت کے ساتھ دیگر مذہبی رہنماؤں کی مدد سے سارے قبائل کو جمع کر کے جہاد کا اعلان کرنا چاہتا ہے۔ میاں گل برادران کے زوال اور سید عبدالجبار شاہ کی برائے نام حکومت کی شکل میں دراصل سنڈاکئی ملا کی پورے سوات پر دریا کے دونوں جانب حکومت قائم ہوگئی ہے۔''

عبدالجبار شاہ کی معزولی

سب عوامل، واقعات اور مجموعی تناظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ عبدالجبار شاہ کی پوزیشن بے حد کمزور تھی۔ چوں کہ اس کا اس مٹی سے تعلق نہیں تھا، اس لئے یہاں نہ تو اُس کا اپنا کوئی خاص گروہ تھا، نہ حمایت تھی۔ نہ تو اُس نے سواتی قیادت کے درمیان پائے جانے والے اختلافات کو ختم کرنے کی کوشش کی اور نہ اُن کے درمیان کوئی توازن برقرار رکھا بلکہ وہ تو مختلف جھگڑوں میں جانب داری سے کام لیتا رہا جیسے کہ زرین خان والے

معاملے میں۔ جہاں تک عام لوگوں کا تعلق ہے، تو وہ نہ تو انہیں انصاف فراہم کر سکا اور نہ ہی اُن کی حفاظت کا کوئی مناسب انتظام۔ ان کی غربت میں کسی طرح کی کوئی کمی لانے کے لئے نہ تو اُس کے پاس وقت تھا اور نہ ہی اُس کا کوئی ایسا لگاؤ تھا۔ وہ انہیں نواب دیر کے ظالم حکام کی دست درازی سے بچا سکا اور نہ ہی نواب دیر کے حملوں کے خوف کو کم کر سکا۔

دیر سے مستقبل کی ممکنہ جنگ کے نام پر اُس نے انتہائی غیر مقبول قسم کے ٹیکس لگائے اور اپنی فوج میں شامل ہونے کے لئے اُس نے ہر قبیلہ سے افراد مانگے جو لوگوں کی ناراضگی کا بڑا سبب بنا۔ میاں گل برادران اور اُن کے حامیوں کے خیال میں وہ غاصب تھا۔ حالانکہ ابتداء میں وہ سنڈاکئی بابا کی حمایت اور سرپرستی میں حکومت کرتا رہا لیکن انگریز سرکار کا حامی ہونے کی وجہ سے وہ سنڈاکئی بابا کی اس اہم ترین مدد و حمایت سے محروم ہو گیا۔ ان سب پر مستزاد یہ کہ اُس کے بارے میں اس بات کا علم ہوا کہ وہ قادیانی ہے۔[4] جنہیں عام مسلمان انتہائی قابل نفرت سمجھتے ہیں۔

عبدالجبار شاہ کے خیال میں سوات کے سب مسائل کا واحد حل یہ تھا کہ انگریز سرکار اسے اپنے قبضہ میں لے۔ وہ تو دل و جان سے برطانوی حکومت کا وفادار تھا لیکن وہ اُسے ہمیشہ 'سوات کا برائے نام بادشاہ'، 'سوات کا نام نہاد بادشاہ' اور 'خود ساختہ بادشاہ' کے نام سے پکارتے رہے۔ نہ تو انہوں نے اُسے صحیح بادشاہ تسلیم کیا اور نہ ہی اُس کی کوئی ایسی پوزیشن تھی کہ ان کے مطالبات پورے کرتا یا اُن کے مفادات کی حفاظت کرتا۔

چوں کہ اس بات سے کئی لوگوں کے مفادات وابستہ تھے اس لئے عبدالجبار شاہ کا تبادل لایا جانا ضروری تھا۔ 2 ستمبر 1917ء کو ڈل قلعہ شامیزئ میں سوات بالا کے نیک پی خیل، سیبوجنی، شامیزئی، متوڑیزئی اور بابوزئی قبائل کا ایک مشترکہ جرگہ منعقد ہوا[5] 'جس میں سوات بالا کے مستقبل کی حکومت کے مسئلہ پر غور کیا گیا'۔ انتہائی غور و خوض کے بعد عبدالجبار شاہ 'کو مطلع کر دیا گیا کہ اب لوگوں کو مزید اُس کی خدمات درکار نہیں ہیں'۔ اس لئے 'وہ 4 ستمبر کو فوراً سوات سے چل دیا'۔

نوٹس

1 کنفیڈنشل نارتھ ویسٹ فرنٹیر پراونشل (پولیٹیکل) ڈائری نمبر 1، 6 جنوری 1917 کو ختم ہونے والا ہفتہ، فائلز آف ڈپٹی کمشنر آفس، پشاور، بنڈل نمبر 4، سیریل نمبر 53، پراونشل ارکائیوز، پشاور۔ نارتھ ویسٹ فرنٹیر پروونس کی سرحدی ایڈمنسٹریشن کے بارے میں رپورٹ، برائے سال 17-1916ء، حصہ اول، صفحہ نمبر 3 بھی ملاحظہ کیجئے۔

اگر نوآبادیاتی حکومت نے عبدالجبار شاہ کی دعوت پر سوات پر قبضہ کر لیا ہوتا تو لگتا ہے کہ وہ شاید ایک بار اور نو

آبادیاتی حکام سے اپنی حکومت اور مفادات قربان کرنے کی بنیاد پر جاگیر اور پنشن کا طالب ہوتا۔ اس لئے کہ اس سے قبل 1914ء میں جب نوآبادیاتی حکام نے اُس سے اپنے سوات منصوبہ کو ترک کرنے کیلئے کہا تھا اور اُس نے ان کی بات مان لی تھی تو اس موقع پر بعد میں اُس نے صوبہ کے چیف کمشنر کو درخواست دی تھی کہ برطانوی حکومت کی خاطر اُس نے جو کچھ قربان کیا تھا اور جو نقصانات اُسے اُٹھانے پڑے تھے، اُس کا ازالہ کیا جائے۔ (دیکھیں عبدالجبار شاہ بنام چیف کمشنر، 2 اکتوبر 1914ء، ٹرائبل ریسرچ سیل ایجنسیوں کی فائیلیں۔ بنڈل نمبر 37، سیریل نمبر 1028 پراونشل ارکائیوز، پشاور)۔

مزے کی بات یہ ہے کہ نوآبادیاتی حکام نے ابتداء میں کوئی جواب نہیں دیا۔ تاہم اُس یاددہانی والی تحریر کا جس میں اُس نے کہا ہے کہ 'میرے رجسٹری شدہ خط 2 اکتوبر 1914ء کا ابھی تک مجھے کوئی جواب نہیں دیا گیا جو کہ سوات کے معاملات کے بارے میں تھا' (عبدالجبار شاہ بنام آئی ایس ڈونلڈ، سی ٹی ای۔ این ڈبلیو ایف پی، تاریخ ندارد، ایضاً) جواب یوں دیا گیا کہ 'زیر دستخطی کو ہدایت کی گئی ہے کہ عبدالجبار شاہ کو بتایا جائے کہ چیف کمشنر اُس کے 2 اکتوبر 1914ء کے خط کا کوئی جواب دینا ضروری نہیں سمجھتے۔' (سیکرٹری چیف کمشنر بنام عبدالجبار شاہ، 22 دسمبر 1914ء، ایضاً)۔

2. مشہور ہندوستانی انقلابیوں مولوی برکت اللہ، مہندر پرتاپ اور عبیداللہ سندھی نے 'عبوری حکومت ہند' افغانستان کی سرزمین پر قائم کی تھی جس کا صدر مہندر پرتاپ کو بنایا گیا تھا۔ انہوں نے برطانیہ کے خلاف ترکی سے اتحاد بھی قائم کرلیا تھا لعل بہا، *این ڈبلیو ایف پی ایڈمنسٹریشن انڈر برٹش رول، 1901-1919ء* (اسلام آباد: نیشنل کمیشن آن ہسٹاریکل اینڈ کلچرل ریسرچ، 1978ء)، صفحہ 93۔

3. دیکھیں محمد علی قصوری کی کتاب *مشاہداتِ کابل و یاغستان* (کراچی: انجمن ترقی اردو (پاکستان)، تاریخ ندارد)، صفحات 129 تا 130۔ اس کتاب کو افغانستان، باجوڑ، سوات، بونیر اور قبائلی پٹی میں جاری برطانیہ مخالف سرگرمیوں کی تفصیل جاننے کے لئے پڑھا جاسکتا ہے۔

4. مام ڈھیری ٹیک پی خیل کے ایک ملّا نے ہندستان سے واپسی پر یہ بات افشا کی کہ عبدالجبار شاہ قادیانی ہے۔ وہ قادیانیوں کے لاہوری گروہ سے تعلق رکھتا تھا۔ دیکھیں تاج محمد خان زیب سر کی *عروجِ افغان*، جلد 1 (منظور عام الیکٹرک پریس پشاور میں چھپی، 1360 ھجری)، صفحات 194 تا 195۔ ڈبلیو آر ہے (W.R.Hay) کی *مونوگراف آن سوات اسٹیٹ* (شملہ: گورنمنٹ آف انڈیا پریس، 1934ء)، صفحہ نمبر 6 اور محمد علی قصوری کے *مشاہداتِ کابل و یاغستان*، صفحات 75 تا 76 بھی دیکھیں۔

5. کنفیڈنشل، پراونشل (پولیٹیکل) ڈائری نمبر 36، 8 ستمبر 1917ء کو ختم ہونے والے ہفتہ کے مطابق عبدالجبار شاہ کو حکومت سے بے دخل کرنے کے لئے جس جرگہ میں فیصلہ کیا گیا تھا وہ شموزئی سوات میں منعقد ہوا تھا لیکن مقامی روایات اور تاج محمد خان زیب سر کے مطابق یہ جرگہ گل کے قلعہ شامیزئی علاقہ میں منعقد کیا گیا تھا۔ (اس کے لئے دیکھیں تاج محمد خان زیب سر، *عروجِ افغان*، جلد 1، صفحہ 196)۔ شموزئی طباعتی غلطی لگتی ہے۔

پانچواں باب

استحکام: دوسرا مرحلہ

1917ء تا1943ء

میاں گل عبدالودود کا تقرر

عبدالجبار شاہ کے رخصت ہونے سے میاں گل عبدالودود (1883ء تا1971ء) کو ایک سنہری موقع ہاتھ لگا کہ وہ سوات کی سرزمین پر اپنے دُنیوی اور روحانی بادشاہت کے دیرینہ خواب کی تعبیر کو عملی جامہ پہنا سکے۔ قسمت اُس کے ساتھ تھی اس لئے کہ اس وقت اس منصب کے لئے اُس کا حقیقی حریف صرف نواب دیر ہوسکتا تھا لیکن وہ اس دوران جندول کے مسائل میں اتنا الجھا ہوا تھا کہ سوات کی طرف توجہ کرنا اُس کے لئے ممکن نہیں تھا۔ اس مقصد کے لئے منعقدہ جرگوں میں اُس کی حمایت کی سب سے بڑی وجہ اُس کا سیدو بابا کا پوتا ہونا تھا۔ یہی اُس کا سب سے بڑا سرمایہ اور ہتھیار تھا۔ اس کو دیکھتے ہوئے بالآخر اُسے سوات کا بادشاہ بنالیا گیا۔

اُس کا یہ منصب سنبھالنے کی اصل تاریخ یقینی طور پر معلوم نہیں۔ شمال مغربی سرحد کی صوبائی خفیہ ڈائری نمبر 36 میں جس پر ہفتہ ختم ہونے کی تاریخ 8 ستمبر 1917ء درج ہے یہ تحریر ملتی ہے کہ عبدالجبار شاہ کی بے دخلی کے بعد لوگوں نے اُس کے آدمیوں سے قلعے لے لئے ہیں اور جرگوں کا انعقاد جاری ہے جہاں پر اس خواہش کا اظہار ہورہا ہے کہ انگریز سرکار کو مداخلت کرکے سوات کو اپنے قبضہ میں لے لینا چاہئے۔ اس کے بعد والی ڈائری بتاتی ہے کہ نیک پی خیل اور متوڑیزئی قبائل نے ممکنہ طور پر اُس کی حکومت کو تسلیم کرلیا ہے۔

اس کے بعد والی ڈائری نمبر 38 میں جس پر اُس ہفتہ کی اختتامی تاریخ 22 ستمبر 1917ء درج ہے لکھا ہے کہ سواتِ بالا کے پورے علاقہ نے ماسوائے ابا خیل، موسیٰ خیل، عزی خیل اور جنکی خیل کے میاں گل گل شہزادہ کو بادشاہ تسلیم کرکے اُسے محاصل دینے کی حامی بھری ہے۔ عزی خیل اور جنکی خیل اس ضمن میں اپنا لائحہ عمل طے کرنے

کے لئے جرگے کررہے ہیں۔ ستمبر 1917ء کا دوسرا ہفتہ تھا کہ چنداخورہ کے (جسے اب عموماً کبل کہا جاتا ہے) سبزہ زار پر اُس کے سر پر حکمرانی کی پگڑی رکھ دی گئی۔ عبدالجبار شاہ کی جائے قیام بھی یہی جگہ تھی۔ آہستہ آہستہ سارے قبائل نے اُس کی حیثیت تسلیم کرلی۔

ریاست سوات کی بنیاد

اس عمومی غلط فہمی کو دور کرنا انتہائی اہم ہے کہ ریاست سوات کی بنیاد میاں گل عبدالودود نے رکھی ہے یا یہ کہ وہ اس ریاست کا بانی تھا یا اس کا پہلا بادشاہ تھا یا اس کا پہلا حکمران تھا۔ یہ بات سمجھنی آسان ہے کہ کیوں، کیسے اور کب یہ ریاست وجود میں آئی اور یہ کہ اس کے بانی مبانی کون تھے۔ مارچ 1915ء میں نواب دیر کی حکومت ختم کرکے اپریل 1915ء میں اس نئی ریاست کا قیام کسی 'کرشمہ ساز رہنما' کا کارنامہ نہیں ہے بلکہ یہ سوات کے سیاسی قائدین کے ایک حصہ کی مربوط جدوجہد کا نتیجہ ہے۔ ان کی سیاسی تنظیم کی نمایاں خصوصیت اس بات پر مسلسل اصرار تھا کہ 'آزادانہ انتخاب و معاہدہ' اس طرح ایک بنی بنائی ریاست قائم کرکے 'کرشمہ ساز قائد' کو سونپ دی گئی۔

اکبر ایس احمد کا کہنا ہے کہ کرشمہ ساز قیادت بے عملی کے ساتھ حالات کا انتظار نہیں کرتی بلکہ وہ حالات کی تخلیق کرتی ہے۔ تاہم یہاں اُن کے اس کرشمہ ساز لیڈر میاں گل عبدالودود نے حالات و واقعات کی تخلیق نہیں کی بلکہ وہ تو دوسروں کے تخلیق کردہ حالات سے بھی فائدہ نہیں اٹھا سکا۔ یوں اس کرشمہ ساز قائد کی ملاکنڈ میں تعینات انگریز پولیٹیکل ایجنٹ سے مشورہ کئے بغیر اقتدار سنبھالنے سے لاتعلقی کا اظہار اور بروقت موقع سے فائدہ اٹھانے میں ناکامی ہی کا نتیجہ تھا کہ اپریل 1915ء میں سیاسی اقتدار میاں گل عبدالودود کی جگہ عبدالجبار شاہ کو سونپ دیا گیا۔

یہ 'سیاسی قیادت' کی طرف سے آزادانہ انتخاب اور معاہدہ' کے حق کا آزادانہ استعمال ہی تھا کہ اس ریاست کی حکمرانی کی پیش کش مختلف افراد، ہندوستانی مجاہدین کے امیر نعمت اللہ اور حاجی صاحب آف ترنگزئی کو بھی عبدالجبار شاہ کے عہد میں کی گئی تا کہ ایک مضبوط حکومت کی خواہش کو پورا کیا جاسکے بلکہ اس مقصد کے حصول کے لئے انگریز سرکار سے بھی کئی بار درخواست کی گئی کہ وہ اقتدار کو اپنے ہاتھ میں لے لے۔ 'سیاسی قیادت' کا یہ خاص حصہ تھا جس نے اپنے 'آزادانہ اختیار و معاہدہ' کی طاقت کا استعمال کرتے ہوئے عبدالجبار شاہ کو تخت سے اتار کر اس کی پیشکش ایک بار پھر اُس 'کرشمہ ساز قائد' کو کردی جو نہ صرف یہ کہ ماضی میں اس پیش کش کو ٹھکرانے پر پشیمان تھا بلکہ جسے باقاعدہ سرکاری سرپرستی بھی حاصل تھی۔ اپنی کرشمہ ساز شخصیت اور روحانی سلسلۂ نسب کے باوجود وہ ماضی میں دوبار اُن حالات و واقعات سے فائدہ اٹھانے میں ناکام رہا تھا جو دوسروں کے پیدا کردہ تھے لیکن ستمبر 1917ء میں اُسے بہرحال بادشاہ

مقرر کر دیا گیا۔

میاں گل عبدالودود نہ تو 'ریاست سوات کا بانی' تھا اور نہ ہی اس کا پہلا حکمران تھا۔ ریاست سوات کے دراصل بانی وہ لوگ تھے جنھوں نے فروری 1915ء میں سوات میں نواب دیر کے خلاف متحد ہو کر اُس کا اقتدار ختم کر دیا تھا۔ مارچ میں پانچ رکنی کونسل کا قیام اور 24 اپریل 1915ء کو عبدالجبار شاہ کو اس نوزائیدہ ریاست کا پہلا بادشاہ بنا دیا تھا۔ اس طرح اس ریاست کو قائم کرنے کا اعزاز سیاسی قیادت کے اُس حصہ کو حاصل ہے اور اس کا پہلا بادشاہ ہونے کا اعزاز عبدالجبار شاہ کے پاس ہے۔ اے ایچ دانی نے بھی اکبر ایس احمد کے اس دعویٰ کو غلط قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ 'اس تاریخی پس منظر میں اکبر ایس احمد کا کسی ٹوپی سازی کی تحریک کے نتیجہ میں اس ریاست کے ارتقاء کا نظریہ یہاں کسی طور ٹھیک نہیں بیٹھتا'

چارلس لنڈ ھامز نے فریڈرک بارتھ، اکبر ایس احمد، میاں گل عبدالودود اور میکر کے حوالہ سے یہ بات کہی ہے کہ 'بیسویں صدی کی ابتداء میں بدلتے اتحادوں کے ایک ڈھانچہ پر ایک قسم کی مرکزی حکومت مسلط کر دی گئی۔' اگرچہ یہ بعد میں مستحکم ہو گئی اور اس کے استحکام میں اضافہ ہوتا رہا لیکن یہ مرکزی حکومت مسلط کردہ نہیں تھی بلکہ یہاں کی قیادت کی کوششوں کا نتیجہ تھی۔ عبدالودود، بارتھ، لنڈ ھامز، اور اکبر ایس احمد کے ریاست کے آغاز کے بارے میں بیانات غلط بیانی پر مبنی ہونے کے ساتھ ساتھ گمراہ کن ہیں۔ تاہم یہ بات صحیح ہے کہ میاں گل عبدالودود وہ پہلا حکمران ہے جسے انگریزوں نے سرکاری طور پر تسلیم کیا لیکن ایسا بھی بہت بعد میں یعنی 1926ء میں ہوا اور وہ بھی والی (حاکم) کے لقب کے ساتھ، بادشاہ یا باچا کا لقب قبول نہیں کیا گیا۔

چیلنج اور رکاوٹیں

سوات کا حکمران مقرر ہونے پر عبدالجبار شاہ کے مقابلہ میں عبدالودود کی پوزیشن مقابلتاً بہتر تھی، چوں کہ اُس کا تعلق سوات سے ہی تھا اور اُس کا اپنا ڈلہ (دھڑا) موجود تھا۔ اُسے 1877ء میں وفات ہو جانے والے اخوند آف سوات کے (جو اُس کا دادا تھا) مریدوں کی حمایت حاصل تھی۔ علاوہ ازیں ایک تو اُس نے عبدالجبار شاہ کو درپیش مشکلات اور اس کی راہ میں حائل رکاوٹوں سے خاصا کچھ سیکھ لیا تھا، دوسرا یہ کہ اُسے حکومت اور انتظامیہ کا ایک بنیادی قسم کا ڈھانچہ سابقہ حکومت سے ورثہ میں مل گیا تھا، جس پر ایک عمارت تعمیر کی جا سکتی تھی۔

تاہم یہ کام آسان ہرگز نہیں تھا۔ اُسے اب بھی نواب دیر کی طاقت سے نمٹنا تھا۔ اسی طرح سنڈاکئی بابا کو بھی جو شہرت اور اثر و رسوخ حاصل تھا، وہ کسی بھی وقت مستقبل میں خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ پھر اُس کے اپنے بھائی میاں

گل شیرین جان سے بھی معاملات صاف نہیں ہوئے تھے۔ اُسے بھی دادا کے کئی مریدوں کی حمایت حاصل تھی۔ وہ بھی اقتدار کا خواہش مند تھا اور اس مقصد کے لئے پہلے بھی اُس سے لڑ چکا تھا۔ مزید برآں معزول بادشاہ عبدالجبار شاہ سب کچھ معاف کرکے آرام سے ایک جانب بیٹھ جانے کے لئے یقیناً تیار نہیں تھا۔ اس پر مستزاد وہ روایتی ہٹ دھرم طاقت ور قیادت تھی جو آسانی سے اپنا سب اختیار و اقتدار اور حیثیت ایک ایسے شخص کو سونپنے کے لئے تیار نہیں تھی جس کی وہ عزت تو کرتے تھے لیکن اطاعت کسر شان سمجھتے تھے۔ ایک ایسی منظم با اختیار حکومت کا قیام جو امن و امان قائم کرنے کے ساتھ ساتھ ریاست کو ترقی کی راہ پر بھی گامزن کرسکے، اب بھی دیوانے کا خواب لگتی تھی۔ انتظامی ڈھانچہ بالکل ابتدائی نوعیت کا تھا۔ افواج غیر منظم اور ناکافی تھیں۔ پیسہ کی قلت تھی۔ حالانکہ برطانوی حکومت سے وفاداری کا رشتہ آغاز ہی سے قائم تھا لیکن اس پر حکمران کی حیثیت سے اعتماد پیدا ہونے کے لئے ضروری تھا کہ سوات کے سیاسی حالات اور عالمی منظر کی بھی سے اُسے صحیح سلامت کندن ہو کے نکلنا تھا۔ جنگ عظیم اول جاری تھی اور برطانیہ مخالف عناصر کی سرگرمیاں ہندوستان کے باہر اور اندر اور خصوصاً جس علاقہ میں سوات واقع ہے، وہاں بہت بڑھ گئی تھیں۔ مزید برآں روس میں 1917ء کے انقلاب کے بعد آنے والے حکمرانوں کو زار سے ملنے والے ترکہ پر اب نظریہ کی طاقت کا پانی بھی چڑھ گیا۔ اور سوات کے محل وقوع کی تزویراتی اہمیت روس کی سرحد سے قریب ہونے اور 'فوجی ہلال' کا حصہ ہونے سے مزید بڑھ گئی۔ جس نے ترکی، ایران اور افغان پٹی کی شکل میں سوویت یونین کے ایک طرف کو گھیرا ہوا تھا۔

اپنے اقتدار اور پوزیشن کو مستحکم کرنے کے لئے اُس کو ان تمام مسائل سے نمٹنا تھا لیکن حقیقت میں اُسی کے عہد حکومت میں ریاستِ سوات کو صحیح معنوں میں استحکام اور توسیع نصیب ہوئی۔ ایک برطانوی سرکاری رپورٹ کے مطابق:

> ''میاں گل نے انتہائی زور دار طریقے سے اپنی سلطنت کو مستحکم کرنے کا آغاز کر دیا۔ سب سے پہلے اُس نے 3000 کی نفری پر مشتمل خاصی اچھی طرح سے مسلح باقاعدہ فوج بنائی۔ اُس نے گھوڑے خریدنے پر کافی رقم لگائی۔ اس بات کی حوصلہ افزائی کی کہ سوات اسلحہ کی درآمد تیز رفتاری سے ہو سکے۔ اسلحہ اور گولہ بارود بنانے کی فیکٹریاں لگائیں اور لنڈاکے اور گوزہ میں دریا کے دونوں جانب چنگی وصول کرنے کے لئے چوکیاں بنائیں۔''

عبدالودود اور شیرین جان

اپنے بیٹے میاں گل جہان زیب کے الفاظ میں میاں گل عبدالودود ریاست سے باہر والے کسی دشمن سے اتنا خوفزدہ نہیں تھا جتنا کہ ریاست کے اندر رہنے والے دشمن سے تھا۔ اُس کا بھائی میاں گل شیرین جان اُس کا ایسا حریف

تھا جو ریاست کیا خاندان کے اندر کا ایک فرد تھا۔ چچازاد بھائیوں کا پتا صاف کرنے کے بعد خاندان کے اندر یہی ایک حریف رہ گیا تھا۔ دونوں میں سے ہر ایک کے اپنے حمایت کرنے والے تھے اور دونوں کے اپنے اپنے بلند عزائم تھے۔ حالانکہ ماضی میں دونوں عبدالجبار شاہ کے خلاف متحد ہو گئے تھے لیکن اب جب ایک اقتدار کی کرسی پر بیٹھ گیا تو دوسرا ایسا امکانی حریف بن گیا جس کے اردگرد سارے غیر مطمئن و ناخوش عناصر اکٹھے ہو گئے۔ سوات کے گروہوں میں بٹے ہوئے معاشرہ میں یہ خلاف توقع بات نہیں تھی۔ اس طرح سال کے اندر بابوزئی کے بااثر جمروز خان اور اُس کے سارے اتحادیوں نے اپنی وفاداری شیرین جان کی طرف منتقل کردی۔ اس سے عبدالودود کی روزافزوں طاقت کو ایک جھٹکا لگا۔ اس کے علاوہ سرکاری معاملات میں بھائی کی مداخلت بھی عبدالودود کے لئے آزردگی کا باعث تھی۔ اس لئے اب وہ شیرین جان کو اپنی راہ میں ایک رکاوٹ کے طور پر دیکھنے لگا۔

اب وہ بہر طور اس رکاوٹ سے جان چھڑانے کا طالب تھا۔ اس لئے 80 افراد پر مشتمل دستہ کی قیادت شیرین جان کو سونپ کر شموزئی علاقہ کے گاؤں گڑھی خزانہ کے قلعہ میں تعینات کر دیا گیا جو کہ دیر کی سرحد پر واقع تھا۔ 11 اگست 1918ء کو دیر کی فوج اس علاقہ میں گھس آئی اور بار بار کمک طلب کرنے پر بھی سوات کی فوج کو وہاں جانے سے روکے رکھا گیا۔ نتیجتاً اس مقابلہ کے نتیجہ میں شیرین جان اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ اس طرح ایک ممکنہ حریف اور عبدالودود کی حکومت کی راہ میں بڑی رکاوٹ کا خاتمہ ہو گیا۔ اپنے بھائی کی موت کے اس موقع پر اُس کا یہ چشم کشا تبصرہ کہ شیرین جان مرگیا لیکن ریاست بچ گئی، عبدالودود کے پوشیدہ ارادوں اور خدشات سے اچھی طرح پردہ اٹھاتا ہے۔ ڈبلیو آر ہے (WR Hay) اس طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ گل شہزادہ کی پوزیشن کو مکمل طور پر محفوظ بنانے کے لئے شیرین جان کا منظر سے ہٹایا جانا اہم ترین واقعہ ہے۔

عبدالودود اور سنڈاکئی بابا

سوات کے معاملات میں سنڈاکئی بابا کو جو عمل دخل حاصل تھا وہ سب پر عیاں تھا۔ ان کی شخصیت اور حیثیت عبدالجبار شاہ کے عہد سے پہلے اور اُس کے دوران لوگوں کو یکجا کرنے کا بڑا ذریعہ تھی۔ لوگوں کے ذہنوں پر ان کا ایسا اثر تھا کہ اگر وہ مستقل طور پر سوات میں قیام کرتے تو یقیناً سید وبابا کی حیثیت مانند پڑ جاتی۔ میاں گل برادران اور سیدو بابا مزار کے نگران ابوبکر المعروف پائینٹی ملانے علی الاعلان اُن کی مذمت کی۔ اپنے اثر ورسوخ اور انگریز حکومت و میاں گل برادران کی مخالفت میں حاجی صاحب آف ترنگزئی کے ساتھ ہم کاری کی وجہ سے وہ ایک ناپسندیدہ شخصیت قرار پائے۔ میاں گل برادران نے الزام لگایا کہ سنڈاکئی بابا، حاجی صاحب آف ترنگزئی اور ان کے ہم کار لوگوں اور اسلام

کے لئے صرف مصیبتوں کا باعث بنے ہیں اور یہ کہ وہ جس قدر جلد بے اطمینانی پھیلانے سے باز آجائیں اتنا ہی بہتر ہے۔' پاسنی ملانے ان کو چیلنج کرتے ہوئے کہا کہ

''وہ حاجی صاحب آف ترنگزئی، سنڈاکئی ملا اور ان کی طرح کے دیگر ملاؤں کو چیلنج کرتے ہیں کہ وہ جب اور جہاں چاہیں اُن سے مناظرہ کر کے دیکھ لیں۔ وہ قرآن وحدیث کی روشنی میں ان پر ثابت کر دیں گے کہ انہوں نے جو کچھ کیا ہے اور کر رہے ہیں وہ اسلام کے اُصولوں کے خلاف ہے۔''

جب شامیزئی، سیبوجنی اور نیک پی خیل کے جرگوں نے میاں گل برادران سے نواب دیر کے خلاف تعاون مانگا اور اُس کے لئے انہیں باجوڑی علاقہ دینے کی پیش کش کی تو انہوں نے اصولاً تو یہ بات مان لی لیکن اُس وقت تک قرآن پر ہاتھ رکھ کر یہ حلف لینے سے انکار کیا جب تک کہ سنڈاکئی ملا سوات سے نکل نہ جائیں۔' لیکن اقتدار کی بھوک اور مایوسی نے انہیں بھی بالآخر سنڈاکئی بابا سے سلسلہ جنبانی پر مجبور کر دیا اس لئے کہ اُس کے تعاون و آمادگی کے بغیر انہیں اس تخت کا ملنا ممکن نہیں تھا۔ سنڈاکئی بابا سے مفاہمت کے بعد ہی عبدالودود کو اپنے مقصد میں کامیابی نصیب ہوئی۔ تاہم وہ سنڈاکئی بابا کے اثر ورسوخ سے حسد محسوس کرتا رہا اور جب اُس کی اپنی پوزیشن مستحکم ہوگئی تو اُس نے اس رسوخ کو کم کرنے پر کام شروع کر دیا۔ بالآخر سنڈاکئی بابا سوات کوہستان چلے گئے۔

18 مارچ 1918ء کو عبدالودود نے نواب دیر کے باجوڑ میں مصروف ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے نواب کے ایک قلعہ شوار پر حملہ کیا لیکن ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ سوات کا جرگہ سنڈاکئی بابا سے نواب کے خلاف مدد کی درخواست لے کر ان کی تلاش میں کوہستان گیا۔ وہ شامیزئی علاقہ میں آیا جہاں اُس کی عبدالودود سے مفاہمت کرائی گئی۔ اُس نے مختلف گروہوں کے درمیان موجود اختلافات ختم کرائے اور وہ قلعے اور برجل جو صرف قبائلی رقابتوں اور مناقشوں کی وجہ سے تعمیر ہوئے تھے انہیں گرادیا۔ اِن باتوں سے بالواسطہ عبدالودود کی پوزیشن مضبوط ہوئی۔ سنڈاکئی بابا قبائل کو نواب کے خلاف جنگ پر آمادہ کرنے میں کامیاب ہوئے لیکن نواب کی افواج کامیاب ہوئیں۔ اس کی وجہ عبدالودود میں جنگی وتزویراتی معاملات کے لئے مطلوبہ صلاحیت کا فقدان تھا۔

بہر حال سنڈاکئی بابا، حاجی صاحب آف ترنگزئی اور دیگر ملاؤں نے شیرین جان کی موت کے واقعہ کو سوات، دیر، جندول اور گندب میں نواب کے خلاف استعمال کیا۔ شیرین جان کی موت سے عبدالودود کو دوہرا فائدہ ہوا۔ ایک تو اس طرح ایک زبردست حریف کا خطرہ ختم ہوگیا اور دوسرا یہ کہ اسی چیز کو دشمن کی پوزیشن کمزور کرنے کے لئے استعمال کیا گیا۔

سنڈاکئی بابا ایک بار پھر باجوڑ سے سوات آئے اور یہاں سوات بالا میں ایک تطہیری مہم شروع کی۔ یہ بات کہی گئی ہے کہ 'میاں گل نے سنڈاکئی ملا کو یہ مہم چلانے پر مجبور کیا' تاکہ ممکنہ طور پر انہیں لوگوں میں غیر مقبول بنا دیں۔

انہوں نے سوات میں رہائش اختیار کی اور باجوڑ جانے کی دعوت قبول نہیں کی۔ تاہم انہوں نے عبدالودود کی طرف سے سوات پر سے انگریز جہازوں کی پرواز یں گزرنے کی اجازت دینے کی مخالفت کی اور پراسرار سرگرمیوں میں ملوث رسالدار روخان اللہ دین سے خفیہ بات چیت کی۔ وہ عبدالودود سے اس لئے بھی ناراض تھے کہ سیبوجنی علاقہ میں ان کے دیہات انہیں واپس نہیں کئے گئے۔ عبدالودود اس معاملہ میں اُن پر الزام لگاتا تھا کہ وہ سوات میں اُس کا اثر و رسوخ ختم کرنے کے لئے سیبوجنی کے امیر خان کا ساتھ دے رہے ہیں۔

عبدالودود نے محسوس کرلیا تھا کہ' ایک پیر اور ایک حاکم ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے۔ اس لئے حاکم صرف اور صرف ایک ہونا چاہئے۔ اور اگر آپ حاکم ہیں تو آپ کو پیر کا اثر ورسوخ کم کرنا چاہئے۔ اور اگر ایسا ممکن نہ ہوتو پھر پیر کو ہٹانا چاہئے۔' اس لئے وہ سنڈاکئی بابا کے دیر فرار کا سبب بنے۔ وہاں سے سنڈاکئی بابا نے قبائل اور نواب کو عبدالودود کے خلاف جنگ پر آمادہ کرنے کی حتی الامکان کوشش کی۔ نواب اُن سے کھلواڑ کرتا رہا لیکن سوات پر حملہ نہیں کیا۔ بہر حال نواب دیر میں ان کی موجودگی کو عبدالودود کے خلاف دباؤ بنائے رکھنے کے لئے ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کرتا رہا۔ بالآخر سنڈاکئی بابا کی مسلسل مخالفانہ سرگرمیوں کی وجہ سے عبدالودود نے انہیں 'کافر' قرار دے دیا۔ چھ فروری 1927ء کو پائندہ خیل علاقہ کے ایک علاقہ کوہان میں ان کی موت سے نواب دیر کی طرف سے سوات پر حملہ کے امکانات تقریباً معدوم ہوگئے۔

عبدالودود نے صرف سنڈاکئی بابا ہی کو فرار پر مجبور نہیں کیا بلکہ اُن دیگر تمام پیروں کو بھی سوات سے نکال باہر کیا جو لوگوں پر سیاسی اثر ورسوخ استعمال کرتے تھے۔

عبدالودود اور دیر، اَمب واندرونی صورتِ حال

عبدالجبار شاہ کے عہد میں ریاست سوات اور نواب دیر کے درمیان حالات کشیدہ رہے۔ عبدالودود کے برسر اقتدار آنے سے اس صورتِ حال میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ عبدالودود کے خلاف اتحاد قائم کرنے کے لئے نواب دیر، خان آف خار اور عبدالجبار شاہ کے درمیان تبادلۂ خیال ہوتا رہا۔ عبدالودود نے اس اتحاد کے خلاف عمرا خان آف جندول کے بیٹوں سے اتحاد کرلیا۔ آنے والے برسوں میں نواب دیر اور سوات کے باچا صاحب کے درمیان لڑائی جھگڑا چلتا رہا۔

نواب نے سوات میں اپنے کھوئے ہوئے علاقے واپس لینے کی کوشش کی۔ سوات بالا میں سیبوجنی کے تاج محمد خان اور شامیزئی کے ماسم خان کے گروہوں کے درمیان لڑائی چھڑ گئی جو نیک پی خیل اور شموزئی علاقہ تک پھیل گئی

نیئین عبدالودود ان کے درمیان معاہدہ کرانے میں کامیاب ہو گئے۔ اُس نے تاج محمد خان کو اپنے علاقہ میں قیام کی اجازت دی اور فریقین سے یکساں برتاؤ کا وعدہ کیا۔

عبدالودود کے زیرِ اثر علاقہ میں مسلسل تنازعات سر ابھارتے رہے۔ وہ بالواسطہ یا بلاواسطہ ان میں ملوث ہوتا رہا۔ چونکیوں کے قیام اور ہر گھر پر ایک روپیہ ٹیکس لگانے سے اُس کے خلاف شدید احتجاج ہوا اور اُسے غیر مقبول بنانے کا سبب بنا۔ دریا کے دائیں جانب کے قبائل میں بے چینی پھیل گئی اور ایک برطانوی سرکاری ڈائری کے مطابق 'وہ میاں گل کی حکومت میں تلملا رہے ہیں۔' جنکی خیل قبائل میں بھی بے چینی پھیل گئی۔ عبدالجبار شاہ نے چکیسر کی جانب سے آکر 'میاں دم کے مضبوط گڑھ' کو قبضہ کرنا چاہا جس کے بارے میں خیال تھا کہ وہ کارروائی کے لئے اچھا نقطۂ آغاز ثابت ہو سکتا ہے۔ تاہم عبدالودود نے حفظ ماتقدم کے طور پر اس پر حملہ کیا اور آسانی سے اس پر قبضہ کر لیا۔ حبیب اللہ خان المعروف میاں دم خان کو اپنے لوگوں اور اسلحہ کے ساتھ کوہستان جانے کی اجازت دے دی گئی۔ 'عبدالجبار شاہ ایک تماشائی کی طرح یہ سب دیکھتا رہا اور پھر بغیر کچھ کئے اس علاقہ سے نکل گیا۔ نواب دیر عبدالودود کی اس کامیابی پر بہت مضطرب ہوا اور عبدالجبار شاہ نے اپنی ناکامی کی ذمہ داری یہ کہہ کر نواب پر ڈال دی کہ اُس نے وعدہ کے مطابق اپنی کمک نہیں بھیجی۔ بہر کیف نواب دیر، عبدالجبار شاہ اور سوات کے کئی سرکردہ افراد کے درمیان خط و کتابت جاری رہی۔

اس دوران داخلی واقعات و بے چینی کی صورتِ حال نے سوات کے باچا کو پریشان کئے رکھا۔ 28 ستمبر 1921ء کو 'ادین زئی نے باقاعدہ طور پر اپنی آزادی کا اعلان کر دیا' اور اُس کی 'اطاعت سے انکار کر دیا'۔ اور سواتی لشکر اُس کی خواہش و فہمائش کو نظر انداز کر کے اس معاملہ سے الگ تھلگ رہا۔ اُسے لشکر بنانے میں بھی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور بالخصوص نیک پی خیل علاقہ اُسے متوقع حمایت دینے میں پس و پیش سے کام لیتا رہا۔ اس لئے اُس نے اُن کے کئی رہنماؤں کو ضیافت کے بہانہ بلا کر قید کر دیا۔ پھر اس نے نیک پی خیل، سیبوجنی اور شامیزئی قبائل کے برسرِ اقتدار گروہ کو الٹی میٹم بھیجا کہ جب تک نواب دیر خال میں قیام کرے وہ آ کر سیدو میں رہیں یا اپنے علاقے چھوڑ دیں۔ انہوں نے دوسری بات قبول کی اور نواب دیر کے پاس چلے گئے۔ اس طرح عبدالودود نے اپنے خلاف نواب دیر، عبدالجبار شاہ اور سواتی قبائل کے ناخوش حصوں کو اتحاد بنانے کا موقع دیا۔ نواب نے اپنے بھائی کو سوات کو ہستان بھیج کر حبیب اللہ خان المعروف میاں دم خان کے ساتھ مل جانے کے لئے کہا اور اس طرح میاں گل کے دائیں بازو کو خطرہ میں ڈال دیا۔ اسی دوران اُس نے نواب امب کے توسط سے عبدالجبار شاہ سے سلسلہ جنبانی کی کہ ''وہ میاں گل کے عقب میں طاقت کا مظاہرہ کرے۔''

سوات کے لوگوں پر اپنی بے اعتمادی کا مظاہرہ عبدالودود نے 5 نومبر 1921ء کے اہم موقع پر اس طرح

گیا کہ اُس نے انتہائی اہم فوجی عہدے غیر مقامی افراد کے حوالے کئے جس پر اُس کے خلاف چہ میگوئیاں شروع ہوگئیں۔ اُس نے فی الفور خان آف خار، سنڈاکئی بابا اور بابڑہ مُلا کو پیغامات بھیجے کہ وہ باجوڑ میں نواب دیر کے لئے مشکلات کھڑی کریں۔ سنڈاکئی بابا نے حتی الوسع کوشش کی کہ خان آف خار سوات کے باچا کا ساتھ دے لیکن یہ بات ماننے سے پہلے اُس نے اپنے آدمی کو پولیٹیکل ایجنٹ کے پاس مشورہ کے لئے بھیجا۔ عبدالودود کی پوزیشن انتہائی نازک تھی۔ اُس کے اپنے الفاظ میں:

''1921 میں ہمیں مجموعی طور پر جو مشکلات و خطرات درپیش تھیں ان کو سامنے رکھتے ہوئے میں اس صورت حال کا یوں تجزیہ کروں گا۔

1. نواب دیر تو پہلے سے ہی اپنی پوری طاقت کے ساتھ حملہ کے لئے پرتول رہا تھا۔
2. سوات کے سابقہ حکمران عبدالجبار شاہ نے ریاست امب کے نواب کی مدد سے حملہ کرنے کے انتظامات مکمل کر لئے تھے۔
3. انگریز پولیٹیکل ایجنٹ کے اکسانے پر سوات کے کئی طاقت ور خوانین میرا تختہ اُلٹنے کے لئے کسی مناسب موقع کا انتظار کر رہے تھے۔
4. کوہستانیوں کا ایک لشکر جرار سوات پر حملہ کے لئے تیار تھا۔

مجھے اس بحران کا بغیر کسی مخلص دوست کی امداد اور مشورہ کے تن تنہا مقابلہ کرنا تھا۔''

ادین زئی بغاوت کی ناکامی کے واقعات کو بیان کرتے ہوئے عبدالودود کہتا ہے کہ

''مجھے مندرجہ ذیل پانچ محاذوں پر لڑنا تھا۔

1. منجہ (نیک پی خیل) میں سوات کے باغی خوانین کو زیر کرنا تھا۔
2. مدین میں حملہ آور کوہستانی لشکر کو پیچھے دھکیلنا تھا۔
3. نواب امب کو کڑاکڑ سے مار بھگانا تھا۔
4. اپنے قدیم طاقت ور دشمن نواب دیر کی جمع افواج کو ادین زئی میں پیچھے ہٹنے پر مجبور کرنا تھا۔
5. برطانوی پولیٹیکل ایجنٹ کی باغیانہ کارروائیوں اور خفیہ روابط کا توڑ کرنا تھا۔

مجھے اکیلے ہی ان چاروں محاذوں کی نگرانی کرنی تھی، فوجی لڑاکا دستوں کا انتظام، ان تک اسلحہ اور خوراک کی بلا روک ٹوک رسد اور اُن کا حوصلہ بلند رکھنے کی تدابیر۔''

عبدالودود نے 'سوات بالا کی فوج کو ادین زئی سے واپس بلا کر منجہ میں پوزیشن سنبھالنے کے لئے کہا۔ جنکی خیل اور عزی خیل کے دستوں کو مدین بھیجا، اور ابا خیل اور موسیٰ خیل کے لشکر کو کڑاکڑ روانہ کیا۔' مخالفین کی طرف سے حملہ کرنے میں ناکامی نے عبدالودود کو ان سے سفارتی ذریعہ سے نمٹنے کا سنہری موقع فراہم کیا۔ پہلے اُس نے ابا خیل اور موسیٰ خیل کے جرگوں کی حمایت حاصل کی اور پھر بونیر کو بھی ساتھ ملا لیا۔ جس سے امب کی افواج واپس لوٹنے پر مجبور ہوگئیں۔ یکے بعد دیگرے دوسری فتوحات بھی آنا شروع ہوگئیں۔ نواب امب کے پسپا ہونے کے دن ہی سوات

کے خوانین کی بغاوت بھی کچل دی گئی۔ کچھ ہی دن بعد نواب دیر کے اوچ پر حملہ کو اس بُری طرح سے ناکام بنا دیا گیا کہ وہ جنگ بندی کے لئے بات چیت پر مجبور ہو گیا۔ جسے چھ مہینوں کے لئے مان لیا گیا۔ اس کے بعد مدین بھی کوہستانیوں سے واپس لے لیا گیا۔

عبدالودود اپنی ان ساری مشکلات اور عدم استحکام کو ملاکنڈ میں متعین پولیٹیکل ایجنٹ کی سازشوں کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔ چار دہائیوں کے بعد بھی اس بارے میں بیان کرتے ہوئے وہ کہتا ہے۔

''پولیٹیکل ایجنٹ کی سازشیں اس طرح دھواں بن کر تحلیل ہو گئیں۔ حالاں کہ ہمیں چاروں محاذوں پر کامیابی نصیب ہوئی لیکن میں آج تک 1921ء کے اُن پُرآشوب دنوں کی یاد کو نہیں بھلا سکا ہوں۔ اس پوری مہم میں ساڑھے پانچ مہینے لگ گئے اور اس کو سوات کی جنگ عظیم کا نام دینا بے جا نہیں ہوگا۔''

اتحادیوں کی ناکامی عبدالودود کے سارے دشمنوں کے لئے ایک کاری ضرب ثابت ہوئی، چاہے ان کا تعلق ریاست کے اندر سے ہو یا باہر سے۔ اس سے اُس کی پوزیشن بے حد مستحکم ہو گئی اور برطانوی حکام اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے چوکنا ہو گئے۔ 1922ء میں ادین زئی معاہدہ کے تحت انہوں نے نواب دیر اور باچا آف سوات سے اپنی شرائط منوائیں۔ اس کے تحت سوات کے باچا کو ادین زئی علاقہ نواب کو لوٹانا تھا اور نواب کو سوات کے معاملات میں مداخلت نہ کرنے کا پابند کر دیا گیا۔ متعلقہ علاقے میں اکثریت کی حمایت حاصل کرنے کی شرط پر وہ ایسا کر سکتا تھا لیکن اس کے لئے بھی انگریز حکومت کی پیشگی اجازت ضروری تھی۔

عبدالودود اور برطانوی حکومت

انگریز حکومت نے چیف کمشنر کے توسط سے سوات پر عبدالودود کی حکومت کی خاموش منظوری دے دی تھی لیکن وہ اس کی آزادی کو شک کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اس لئے انہوں نے اُسے باقاعدہ طور پر تسلیم کرنے میں کچھ وقت لیا۔ اُس نے اپنے طور پر ان کا اعتماد حاصل کرنے کی کوشش کی جس کے بغیر وہ اپنی پوزیشن مستحکم نہیں کر سکتا تھا۔

21 مئی 1923ء کو عبدالودود نے اپنے سب سے بڑے بیٹے کو اپنا ولی عہد مقرر کرنے کے لئے ایک دربار کا انعقاد کیا۔ دوسرے دن منعقد ہونے والے دربار میں اُس کی طرف سے اُس کے وزیر حضرت علی نے ایک لمبی تقریر سنائی جس میں اُس نے برطانوی حکومت کے لئے اپنی سچی دوستی اور وفاداری کا اعلان کیا اور سامعین کو بھی تلقین کی کہ وہ بھی اپنے قول و فعل سے اسی بات کی گواہی دیں۔ اُس نے کمیونسٹوں کو اسلام دشمن قرار دیتے ہوئے پُر زور الفاظ میں ان کے مقاصد اور پروپیگنڈے کی مذمت کی۔

پھر اُس نے تحریری طور پر پولیٹیکل ایجنٹ کو اپنے لئے 'فرمانروائے یوسف زئی' کا لقب اختیار کرنے کی اطلاع

دی۔ اس لقب کا انتخاب سیاسی اور سفارتی لحاظ سے خاصا معنی خیز اقدام تھا۔ نہ تو مستقبل میں ریاست کی حدود میں ہونے والی تبدیلی سے اس کو بدلنے کی ضرورت ہوگی اور اپنے سب سے بڑے دشمن نواب دیر کو بھی' اس سے زیادہ سے زیادہ ذہنی تکلیف پہنچائی جاسکتی تھی۔' تاہم برطانوی حکومت نے اسے ایک مناسب لقب نہیں سمجھا۔ مارچ 1926ء میں پولیٹیکل ایجنٹ کے دورہ اور جرگوں سے ملاقاتوں کے بعد انہوں نے صورتِ حال کا مختصر جائزہ یوں لیا۔

''بہ ظاہر سب کچھ ٹھیک ٹھاک نظر آتا ہے۔ بلاشک و شبہ میاں گل ایک مضبوط اور اہل حکمران لگتا ہے لیکن قبائلی معززین میں اُس کے خلاف جذبات پائے جاتے ہیں۔ جن سے اول تو وہ کوئی مشورہ لیتا ہی نہیں اور اگر لے بھی لیتا ہے تو اُس پر عمل بالکل نہیں کرتا۔ اور عوام الناس میں بیگار کی وجہ سے اُس کے خلاف ناراضگی پائی جاتی ہے لیکن وہ بیرونی جارحیت کے خوف کی وجہ سے اُس کی مستحکم حکومت کو پسند کرتے ہیں۔''

3 مئی 1926ء کو چیف کمشنر سیدو شریف گئے اور منعقدہ دربار میں' میاں گل کو والئی سوات کی حیثیت سے باقاعدہ تسلیم کرلیا گیا۔' لوگوں نے میاں گل عبدالودود کو باچا یا بادشاہ کا خطاب دیا اور انہیں باچا صاحب کہتے تھے لیکن برطانوی حکام اس لقب کو صرف اپنے بادشاہ کے لئے مختص گردانتے تھے۔ اس لیے ہندوستان کے کسی حکمران کو یہ خطاب نہیں دیا گیا۔ ان کی طرف سے نواب کے لقب کی پیش کش کی گئی لیکن عبدالودود نے بادشاہ سے نواب بنائے جانے کی تنزلی کو پسند نہیں کیا اور بالآخر والی کے لقب کو قبول کیا جس کا مطلب' حکمران' ہے۔

عبدالودود والی کہلائے جانے پر خوش نہیں تھے لیکن اس عظیم طاقت کے آگے سر جھکائے ہی بنی۔ دسمبر 1927ء میں انہوں نے ایک بار اور باچا کے لقب کے لئے برطانوی حکام سے رابطہ کیا لیکن قریبی افسران کی سفارش کے باوجود اس درخواست کو رد کردیا گیا۔ قسمت کی عجب ستم ظریفی ہے کہ عبدالجبار شاہ جسے برطانوی حکومت نے' نام نہاد'،' خود ساختہ' اور' برائے نام' بادشاہ قرار دیا تھا اُس کا سرکاری خط و کتابت میں اکثر و بیشتر بادشاہ یا سوات کا سابقہ بادشاہ کے نام سے حوالہ دیا گیا ہے لیکن میاں گل عبدالودود اپنی حیثیت کے باوجود انگریز حکومت سے اپنی اس خواہش کو نہیں منواسکا۔ تاہم،

''برطانوی حکومت کی جانب سے سوات میں عدم مداخلت یا اس کی علاقائی خود مختاری کے احترام کی پالیسی نے مقامی سیاسی توازن کو مستقلاً والی (عبدالودود) کے حق میں کردیا۔ انگریز سرکار کی اس تائید و حمایت نے والی کے اقتدار کو استحکام دلانے میں اپنا کردار ادا کیا۔''

انگریزوں کی طرف سے والئی سوات تسلیم کئے جانے کے بعد عبدالودود کی پوزیشن مضبوط ہوگئی اور اسے مزید مستحکم کرنے کے لئے اُس نے تگ و دو شروع کردی۔ اس ضمن میں اُس کا پہلا قدم اپنی رعایا کو غیر مسلح کرنا تھا۔ اس کے لئے اُس نے برطانوی حکومت سے یقین دھانی حاصل کرنی چاہی کہ لوگوں کی طرف سے بغاوت کی صورت میں

اُس کی مدد کی جائے گی لیکن برطانوی حکومت اُسے یہ یقین دہانی نہیں کرا سکتی تھی۔اس کی وجہ 3 مئی 1926 ,کو سیدو کے مقام پر طے پانے والے معاہدہ میں یہ اختتامی جملہ تھا جس میں کہا گیا تھا کہ "اس معاہدہ کے تحت برطانوی حکومت میاں گل کی حکومت کی مسلح امداد نہیں کرے گی۔"اور کچھ اور بھی عوامل تھے۔بہرحال اُس نے سفارتی ہنرمندی سے کام لے کر اپنا مقصد حاصل کرلیا جس سے اُس کی پوزیشن مزید مستحکم ہوگئی۔

عبدالودود اور سرسرداری کے میاں صاحبان

سرداری کے میاں حمزاللہ خان کو جو انتہائی معزز شخصیت کے حامل تھے اور جو عبدالودود کے دوست اور اتحادی تھے ،گرفتار کر کے جیل میں بند کر دیا گیا۔اس کی وجہ عبدالجبار شاہ سے وفاداری کا الزام تھا اور اُس کے ساتھ ساتھ مقامی طور پر اقتدار کے بارے میں عدم اتفاق تھا۔اس خودسرانہ اقدام سے سوات بالا کے معززین اور غوربند ،کانڑا ،چکیسر اور پورن میں غم وغصہ پھیل گیا۔میاں حمزاللہ خان کو آزاد کروانے کے لئے عبدالودود کے پاس وفود بھیجے گئے اور مطالبہ نہ ماننے کی صورت میں بغاوت کی دھمکی دی گئی۔لوگوں کا منہ بند کرنے کے لئے حمزاللہ خان کو چھوڑ دیا گیا۔تاہم اس کے اثر ورسوخ کو ختم کرنے کے لئے سر کے میاں شہزادگل کو سرسرداری میں مامور کیا گیا۔ایک برطانوی سرکاری رپورٹ کے مطابق "اگر یہ نیا انتظام کامیاب ہو جائے تو یہ برطانوی حکومت کے لئے بھی بہت فائدہ مند ثابت ہوگا۔اس لئے کہ ان میاں صاحبان کا مخالف گروہ تو ہمیشہ حاجی صاحب آف ترنگزئی اور دیگر انگریز دشمن لوگوں کے ساتھ سازباز کی کوشش کرنے میں مصروف رہتا ہے۔"

بالآخر سرسرداری کے جلاوطن میاں صاحبان کو اطاعت کا عہد کرنے پر دوبارہ اپنی جائیداد پر بحال کر دیا گیا اور فریقین کے درمیان مفاہمت ہوگئی۔میاں حمزہ اللہ کو بعد میں سر کے اُس کے چچازاد بھائیوں نے مار ڈالا جب کہ اُس کے بھتیجے شاہ مدار کو نائب سالار کے عہدہ سے ہٹا کر اُس کی جگہ شہزادگل آف سر کو یہ عہدہ دے دیا گیا۔

عبدالودود اور خوانین

اقتدار میں آنے کے بعد عبدالودود کو علاقہ سیبوجنی کے تاج محمد خان اور اُس کے حامیوں کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔رفتہ رفتہ اُس کی پوزیشن مستحکم ہوتی چلی گئی اور وہ چند سرکردہ خوانین جو اُس کی ہم سری کے اہل تھے یا تو گروہی تنازعات یا دوسرے طریقوں سے مغلوب کر لئے گئے۔1929ء کے اختتام تک عبدالودود اور ریاست دونوں اتنے مضبوط ہوگئے تھے کہ نمایاں مخالفین میں سے کچھ ہمیشہ کے لئے منظر سے غائب ہوگئے اور کچھ مختصر عرصہ

کے لیے سامنے سے ہٹ گئے۔

29 دسمبر 1927ء کو حبیب خان المعروف دارئی خان اُس وقت ایک چٹان سے گر کر ہلاک ہو گئے جب وہ والیٔ سوات (عبدالودود) کے ہمراہ مارخور کا شکار کرنے کی مہم پر نکلے ہوئے تھے۔[1] حبیب خان کے اُس سے دوستانہ مراسم اُس وقت سے کشیدہ ہو گئے تھے جب عبدالودود نے ایک دوسرے قبیلہ پر حملہ کرنے کی وجہ سے اُس کے قبیلہ پر چھ ہزار روپے جرمانہ اور اُن کے جلائے ہوئے گھروں کی ازسرِنو تعمیر کا حکم دیا تھا۔ یکم جنوری 1928ء کو ذرش خیلہ جا کر انہوں نے حبیب خان کے جانشین کے طور پر اُس کے سب سے بڑے بیٹے محمد رسول خان کی دستار بندی کی۔ خیر۔گائی کے اس اظہار سے وہ دراصل حبیب خان کی موت سے اپنی بریت ثابت کرنا چاہتا تھا' جس کے بارے میں عمومی تاثر یہ تھا کہ یہ موت حادثاتی نہیں تھی۔[2]

عبدالودود کی طرف سے اس اظہار بریت کے باوجود ستمبر 1928ء میں جب وہ پیٹئی (فتح پور) کے دورہ پر تھا، دارئی خان کے بیٹوں نے حبیب اللہ خان المعروف میاں دم خان کے ساتھ مل کر اُس پر شب خون مارا۔ یہ کوشش ناکام ہو گئی اور حملہ آور دیر فرار ہو گئے۔ اس سے عبدالودود کی پوزیشن مزید محفوظ ہو گئی اس لئے کہ اس طرح ایک نافرمان مضبوط مخالف گروہ ریاست سے نکل گیا اور ابتری کی کیفیت سے دوچار ہو گیا۔ نتیجتاً اس سے ان کا ڈلہ (دھڑا) کمزور ہو گیا اور عبدالودود مضبوط تر ہو گیا۔

1902-3ء میں کسی باہمی گروہی جھگڑے میں سوتیلے بھائی میرداد خان کی ہلاکت کے بعد جمروز خان بابوزئی قبیلہ میں مضبوط ترین شخص بن کر ابھرے تھے۔ اُس نے اپنے قبیلہ کے ہمراہ اقتدار کے پہلے ہی سال عبدالودود سے اپنی حمایت واپس لے لی اور اُس کے بھائی میاں گل شیرین جان کا ساتھ دینا شروع کیا۔ اُس نے عبدالودود کے لوگوں کو غیر مسلح کرنے کی بھی مخالفت کی۔ 23 ستمبر 1928ء کو وہ اپنے بھتیجے پیر محمد خان کے ہاتھوں مارا گیا۔ جمروز خان کے خاندان کی اہمیت مزید کم کرنے کے لئے عبدالودود نے قاتل کے باپ جانس خان کو جمروز خان کے ڈلہ (دھڑا) کا سربراہ بنا دیا۔ اسی مہینے میں شموزئی علاقہ کے ایک ممتاز اور بااثر شخص کامران خان کو سیدو بلا کر قید کر دیا گیا۔

سیوجنی کے امیر خان اور اُس کے بھائی محمد سید خان (المعروف شنگوائی خوانین) کا تعلق دارئی خان کے بیٹوں کے ڈلہ (دھڑا) سے تھا۔ انہوں نے اپنے ڈلہ (دھڑا) کے ہمراہ دوستی کا حلف لیا۔ محمد سید خان کو عبدالودود نے سیدو بلایا۔ وہ اپنے ساتھ جو چالیس عدد رائفلیں لایا تھا، وہ ضبط کر لی گئیں۔ 7 اکتوبر 1928ء کو وہ سیدو سے تھانہ فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ اس اطلاع کے ملتے ہی اُس کا بھائی امیر خان 160 رائفل بردار حامیوں کے ساتھ دیر چلا گیا۔ فروری 1929ء میں حبیب خان اور میاں دم خان کے ایک رشتہ دار خوشحال خان کو جو بیدرہ میں رہتے تھے' سوات سے جلاوطن کر کے اُس کی جائیداد ضبط کر لی گئی۔[3]

اس طرح وہ طاقت ور خوانین جن کی وفاداریاں مشکوک تھیں یا تو بزور منظر سے ہٹا دیئے گئے یا انہیں مجبور کر گیا کہ وہ خود ہی چلے جائیں یا اثر و رسوخ چھین کر انہیں گم نامی میں دھکیل دیا گیا اور ان کی جگہ ان کے حریفوں کو آگے لایا گیا یا انہیں مفاہمت پر مجبور کر دیا گیا۔

عبدالودود اور ولی عہد

عبدالودود نے اپنے بڑے بیٹے جہان زیب کو ولی عہد مقرر کرنے کے لئے 21 مئی 1923ء کو ایک دربار کا انعقاد کیا۔ چوں کہ ہر جرگہ اس دستار بندی میں سب سے آگے ہونے کا خواہش مند تھا، اس لئے فیصلہ کیا گیا کہ چند منتخب علماء اور ملاقابل کی جانب سے یہ فریضہ سرانجام دیں۔ دستار بندی سے قبل عبدالودود نے ایک تقریر کی:

"آپ سب لوگوں کی خواہش تھی کہ میں اپنے سب سے بڑے بیٹے کو ولی عہد مقرر کروں۔ آپ کی موجودگی میں آپ کی خواہش کے مطابق میں اپنے بڑے بیٹے کو اس منصب کے لئے پیش کرتا ہوں۔ اور آپ کی موجودگی میں اپنے بیٹے کو اس بات کی تلقین کرتا ہوں کہ وہ میری طرح آپ کے ساتھ شرافت، نرمی اور مساوات کے اصول کو مدنظر رکھ کر برتاؤ کرے۔ اُسے کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دینی چاہیے اور وہ تمام وعدے پورے کرنے چاہئیں جو میں نے آپ میں سے کسی ایک فرد یا سب سے کئے ہیں۔ مجھے پوری امید ہے کہ انتظامی معاملات میں آپ لوگ اُس کا ایسا ہی ساتھ دیں گے جیسا کہ آپ میرا ساتھ دیتے رہے ہیں۔"

مندرجہ ذیل افراد نے درج شدہ ترتیب کے ساتھ دستار بندی کے اس عمل میں حصہ لیا۔ پاسنئی ملا (ابوبکر)، صاحب زادہ صاحب آف چنڈاخورہ، سنڈاکئی ملا، پاچا ملا آف بونیر، کاکا میاں آف تل کوٹ، سید حمزاللہ میاں آف سرداری، صاحبزادہ آف قلاگئی، اور مشر (بڑے) صاحبزادہ آف اوڈیگرام۔

سوات کی روایتی سیاسی قیادت کو جائز یا ناجائز طریقے اپنا کر زیر کرنے کے بعد عبدالودود نے ریاست کے اندر اپنی پوزیشن مستحکم کر لی۔ انگریز سرکار نے 15 مئی 1933ء کو میاں گل جہان زیب کو ان کے ولی عہد مقرر کئے جانے کے واقعہ کے ٹھیک دس سال بعد سرکاری طور پر ولی عہد تسلیم کر لیا۔ باچا صاحب اس کے فوراً بعد ولی عہد سے بدظن ہو گئے اور اُس کے اثر و رسوخ سے حسد کرنے لگے۔ 1935ء میں اُسے اختیارات سے محروم کر دیا گیا اور اُسے کہہ دیا گیا کہ وہ ریاست میں نہ آئے۔ پانچ سال بعد اُسے دوبارہ بحال کیا گیا۔ صوبائی گورنر نے بیچ میں پڑ کر باچا صاحب اور ولی عہد کے درمیان مفاہمت کرائی۔ میاں گل جہان زیب اس کشیدگی کی وجہ وزیر برادران کی سازش کو قرار دیتے ہیں لیکن اس کے اپنے بیانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ نہ صرف باپ کے خدشات اور حسد اس کا سبب تھا بلکہ ڈلہ (دھڑا) کے معاملات اور اقتدار کے لئے رسہ کشی کا بھی اس میں ہاتھ تھا۔ وزیر برادران ان معاملات میں اپنے

مفادات کا تحفظ کرنے میں ناکام رہے اور اکتوبر 1943ء میں سوات سے چلے گئے۔ 12 دسمبر 1949ء کو باچا صاحب اپنے بیٹے کے حق میں تاج و تخت سے دستبردار ہو گئے، جس کے نتیجہ میں وہ سوات کے نئے حکمران بن گئے۔ اور ریاست کے آخری والی ثابت ہوئے۔ بیٹے کے حق میں باچا صاحب نے تاج و تخت کو کیوں تج دیا؟ کیا یہ فیصلہ رضا کارانہ تھا؟ اس ضمن میں اُن کا اپنا بیان یہ بتا تا ہے:

''1949ء میں نیں نے یہ محسوس کیا کہ وہ عظیم کام جو میں نے اپنے ذمہ لیا تھا تقریباً مکمل ہو چکا ہے۔ ریاست مستحکم بنیادوں پر قائم ہو چکی تھی۔ حکومت ٹھیک ٹھاک چل رہی تھی اور مستقبل بھی ہر لحاظ سے تابناک نظر آتا تھا۔ بڑھاپے کے اثرات بھی مجھ پر اسی طرح طاری ہونے لگے تھے کہ انہیں نظر انداز کرنا ممکن نہیں تھا۔ مسلسل ذہنی اور جسمانی دباؤ نے صحت کو خاصا خراب کرنا شروع کر دیا تھا۔ خوش ہونے کے باوجود میں مکمل طور پر تھک گیا تھا اور حکمرانی کی ذمہ داریاں نبھانا ممکن نہیں رہا تھا۔ علاوہ ازیں میرے دو خواب ابھی تشنۂ تکمیل تھے۔ ایک تو یہ تھا کہ میری ہمیشہ سے یہ خواہش رہی تھی کہ میں علم حاصل کروں۔ بالخصوص میں اپنے آپ کو قرآن وسنت کی تعلیمات سے مکمل طور پر آگاہ کرنا چاہتا تھا۔ میرا دوسرا خواب یہ تھا کہ میں سوات کے لوگوں کی روحانی اور اخلاقی تربیت بھی کرنا چاہتا تھا۔ اس کے لئے میرا خیال تھا کہ میں کچھ روشن فکر مخلص اطبع اہل علم کے ایک گروہ کے ساتھ اس مقصد کے حصول کے لئے گاؤں گاؤں جاؤں اور اسلامی تعلیمات کے مطابق لوگوں کی کردار سازی کی کوشش کروں تا کہ وہ اچھے مسلمان بن سکیں۔ اس لئے میں نے یہ فیصلہ کیا کہ تاج و تخت سے دست بردار ہو جاؤں اور ریاست کے سارے انتظامی معاملات اپنے بیٹے میاں گل جہان زیب کو سونپ دوں۔''

دست برداری کے بارے میں باچا صاحب کے بیان کا پشتو متن بھی کم و بیش یہی وجوہات بتاتا ہے جب کہ اس سلسلہ میں میاں گل جہان زیب کا بیان یہ ہے۔

''میرے والد نے تاج و تخت سے دست برداری کا فیصلہ کیوں کیا؟ وہ مجھ سے بے پناہ محبت کرتے تھے اور وہ مجھے حکمرانی کی اہلیت ثابت کرنے کا پورا موقع دینا چاہتے تھے۔ انہوں نے ایک بار مجھ سے کہا تھا کہ جب وہ حکمران بن گئے تو وہ اس وقت کا انتظار کرنے لگے جب میں اتنا بڑا ہو جاؤں کہ وہ حکومت میرے حوالے کر دیں۔ میں 1935ء ہی میں حکومت تمہیں دینا چاہتا تھا لیکن پھر یہ افسوس ناک حالات پیدا ہو گئے۔ اس لئے اس کام میں تاخیر ہوگئی۔ حکمرانی سے دست برداری کا خیال اُن کے لئے بھی اسی طرح باعث افسوس نہیں تھا جیسا کہ مجھے بھی اوغام کے بعد اس بات کا کوئی رنج نہیں کہ حکومت پاکستان نے ریاست مجھ سے لے لی ہے۔ اصل بات تو یہی تھی۔ اس کے علاوہ ایک ضمنی بات اور بھی ہے۔ اس سے ایک ایسے انسانی جذبہ کا اظہار ہوتا ہے جس کا تجربہ کسی کو بھی ہو سکتا ہے۔ وہ یہ محسوس کرتے تھے۔ مجھے اس بات کا اس لئے پتہ ہے کہ انہوں نے ایک بار خود مجھے اس بارے میں بتایا تھا۔ یہ کہ اس ریاست کو انہوں نے بنایا تھا اور اگر کسی وجہ سے یہ جیسے ادغام وغیرہ سے اُن کے عہد میں ختم ہو جائے تو یہ اُن کے لئے باعث ندامت ہوگا۔ وہ چاہتے تھے کہ یہ صحیح صورت میں اُن کے وارث کو منتقل ہو جائے تا کہ اُن کا نام ریاست کی بنیاد رکھنے اور اُسے بنانے والے کی حیثیت سے باقی رہے۔''

باپ اور بیٹے کے بیانات ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں اور کسی ایسی بنیادی غلطی کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس کے لئے وضاحتیں دینے کی ضرورت ہو۔ دست برداری کی جو وجوہات دونوں نے بیان کی ہیں، ان پر یقین

کرنا خاصا مشکل ہے۔ لگتا ہے کہ یہ باتیں یوں ہی بھرم رکھنے کے لئے کی جا رہی ہیں۔ باچا صاحب کی پوزیشن بہت مضبوط تھی اور وہ تخت پر بیٹھ کر لوگوں کی اخلاقی اور روحانی تربیت کا کام زیادہ موثر طور پر کر سکتے تھے۔ یہ بات بھی شک میں ڈالنے والی ہے کہ تخت سے دست برداری کے بعد وہ اپنے اس تبلیغی مہم پر کبھی نہیں نکلے اور نہ ہی انہوں نے گاؤں گاؤں کا دورہ کیا۔

مختلف شواہد اور بیانات سے بآسانی یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ تخت سے دست برداری دراصل اقتدار کے حصول کی طویل کش مکش میں ولی عہد کی فتح تھی۔ یہ اور پرسے سیاسی قوتوں کے دباؤ کا نتیجہ تھا۔ اس مقصد کے لئے بیٹے نے ریشہ دوانی کی ایک طویل مہم چلائی اور بالآخر باپ کو تخت چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ میاں گل جہان زیب نجی طور پر (اپنے ولی عہد کا حقارت سے ذکر کرتے ہوئے) عموماً اعتراف کرتے تھے کہ '' میں نے یہ (حکومت) بزور بازو حاصل کی ہے۔'' اور باپ اپنی بقیہ زندگی اقتدار چھن جانے پر مغموم اور کبیدہ خاطر رہے۔

عبدالودود اور وزیر برادران

حضرت علی اور احمد علی میاں گل عبدالودود کے دو بہت ہی وفادار ملازم تھے بلکہ اگر انہیں ساتھی کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ عام طور پر انہیں 'وزیران' یا وزیر برادران کہا جاتا ہے۔ حضرت علی نے مختلف عہدوں پر کام کیا، جیسے وزیر، وزیر اعظم وغیرہ۔ اسی طرح احمد علی نے کئی طرح کی اہم ذمہ داریاں نبھائیں۔ جیسے سپہ سالار اور وزیر وغیرہ۔ دونوں نے ہر حال میں ان کا ساتھ دیا۔ یہ بات بھی خاصی مشکل ہے کہ عبدالودود نے اپنی سوانح عمری میں بہت سے ایسے افراد کی خدمات وامداد کا بہ مشکل ہی اعتراف کیا ہے، جنہوں نے ریاست کی تشکیل وقیام اور استحکام وتوسیع میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔

یہ بات ماننے کی ہے کہ ساری کامیابی وکامرانی کا حتمی طور پر سہرا عبدالودود ہی کے سر جاتا ہے لیکن کچھ افراد نے مختلف مشکل مراحل میں ان کی بہت مدد کی۔ وزیر برادران انہی لوگوں میں سے تھے جن کی سمجھ بوجھ، تعاون اور خدمات کے بغیر وہ کبھی بھی کامیاب نہیں ہو سکتے تھے۔ چاہے باچا صاحب مانتے ہوں یا نہ اپنی بہت سی کامیابیوں کے لئے وہ وزیر برادران اور دیگر کئی لوگوں کے مرہون منت رہیں گے۔ 22 مئی 1923ء کو سیدو کے مقام پر منعقدہ معززین کے اجتماع کے موقع پر، اپنی اُس تقریر میں جوان کی طرف سے وزیر نے سنائی، وزیر حضرت علی اور سپہ سالار احمد علی کی اعلیٰ خدمات کا اعتراف کیا گیا اور اس کے لئے ان کی خوب ستائش کی گئی۔ اسی طرح یہ بات بھی بیان ہوئی ہے کہ بونیر میں وزیر کی خدمات وکارناموں کے اعتراف وستائش کے طور پر سیدو پہنچنے پر اُسے، پندرہ توپوں کی سلامی

دی جائے گی۔ اُس کے بھائی سپہ سالار کو چکیسر اور کانڑا میں کامیابیوں پر دو رائفلیں ،ایک مائیکرواسکوپ (نیئی سکوپ؟) اور ایک کتا انعام میں دیا گیا۔

وزیر برادران کو ریاست کے استحکام اور توسیع کے کام میں اتنی اہمیت حاصل تھی کہ عبدالودود نے حضرت علی کی بیوی کی وفات کے بعد اپنی ایک بیٹی نجیہ بی بی کی اُس سے خفیہ طور پر منگنی کی۔ اس بات پر بہت انضطراب پھیل گیا اس لئے کہ یہ کہا گیا کہ وزیر کی مرحومہ بیوی اس لڑکی کی رضاعی ماں ہے جس کی وجہ سے یہ رشتہ ناجائز ہے۔ لڑکی کی عمر اس منگنی کے وقت صرف نو سال تھی۔

ذرائع اور طریقِ کار

1929ء کے آخر تک عبدالودود نے خود کو اور ریاست کو کسی نہ کسی طرح بیرونی اور اندرونی خطرات سے صحیح سلامت رکھا۔ مخالفین یا تو کچل دیئے گئے ،اطاعت پر مجبور کر دیئے گئے یا انہیں مفاہمت کرنی پڑی۔ 1929ء کے بعد کی صورتِ حال میں باپ بیٹے کے درمیان سر اُٹھانے والے معاملات حاوی رہے جس میں وزیر برادران بھی ملوث تھے۔ باچا صاحب خود ستائی کے موڈ میں آ کر اکثر کہا کرتے تھے کہ انہوں نے ریاست کو اتنا مستحکم کر دیا ہے کہ اب اُن کی کوئی اندھی بیٹی بھی اس پر تیس سال تک حکومت کر سکتی ہے۔ ایک اَن پڑھ قبائلی معاشرہ میں ایک اَن پڑھ شخص کس طرح ایک ایسی ریاست قائم کرنے میں کامیاب ہوا جہاں مکمل نظم و نسق کے ساتھ حکومت کا نظام چلایا جاتا رہا اس اَمر کی تفصیل نیچے بیان کی جاتی ہے۔

دیر کے از سرِ نو قبضہ کا خوف اور قلعے

سواتی علاقوں پر نواب دیر کے دوبارہ قبضہ کے خوف سے خوب خوب فائدہ اٹھایا گیا اور اس بہانہ سے تمام سرحدی علاقوں میں قلعے تعمیر کئے گئے۔ یہ کسی حد تک دفاع کے نقطۂ نظر سے ضروری تھا لیکن پوری ریاست میں قلعوں کی بھرمار کی کوئی منطق نہیں تھی۔ یہاں تک کہ باچا صاحب نے نیک پی خیل کے کچھ سرکردہ افراد کو 2400 روپے رشوت دے کر دُرُوشی ارکوٹ میں قلعہ تعمیر کروایا۔ ان کا اصل مقصد اور اہمیت مرکزی حکومت کے اقتدار و اختیار کے لئے ایک زندہ علامت بن کر ہر جگہ اُس کے ہونے کا احساس دلانا تھا۔ ان کو اندرونی بغاوتیں کچلنے ،سرکاری ضوابط اور حکمران کے فرامین پر عمل درآمد کے لئے بھی استعمال کیا جا سکتا تھا۔

قلعہ کے کمانڈر کے لئے لازمی شرط تھی کہ وہ ایک قابل بھروسہ شخص ہو جس کا تقرر مرکز سے کیا گیا ہو۔ جب

کہ سپاہی اُسی علاقہ کے غریب افراد ہوں۔ تزویراتی مراکز ہونے کی وجہ سے حکمران کا انتہائی مفاد اس بات سے وابستہ تھا کہ یہ قلعے ان افراد کے ماتحت ہوں جن کی وفاداری شک وشبہ سے پاک ہو۔ خصوصاً کوہستانیوں اور کانخواغور بند کے لوگوں پر اس سلسلہ میں اعتماد نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس پالیسی کو اس لئے اپنایا گیا تا کہ افسران بیرونی اور اندرونی دشمنوں سے ساز باز نہ کرسکیں اور سپاہی اندرونی بغاوت کی صورت میں روایتی ڈلہ (دھڑا) معاملات سے لا تعلق ہونے کی وجہ سے مرکزی حکومت کے وفادار رہیں۔

طلائی کلیدیں

عبدالودود کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ تھی کہ ایک نیم وحشیانہ زندگی گزارنے والے لوگوں کو قانون و ضابطہ کا پابند بنا کر حکومتی نظم ونسق کے تحت کیسے لایا جائے۔ اس مشکل مقصد کو سونے کی چابیاں استعمال کر کے حاصل کیا گیا۔ جیسے کہ وہ خود بیان کرتا ہے۔

"کچھ عرصہ تک حالات جوں کے توں رہے۔ آخر مجھ پر یہ بات اچھی طرح عیاں ہوگئی کہ حکومت اس طرح نہیں چلائی جاسکتی۔ سوائیں کو نظم وضبط کا احترام سکھانا ہوگا یا یہ سارا تانا بانا بکھر جائے گا۔ مجھے ایک بہت اچھی ترکیب سوجھی جو یہ تھی کہ جب کسی پر کوئی جرمانہ عائد کیا جاتا تو میں اُس علاقہ کے خان (اور ملک) سے کہتا کہ اسے وصول کر کے وہ خود خرچ کرے۔ یہ ترکیب بے حد کامیاب رہی اور میں یہ دیکھ کر خوب محظوظ ہوتا کہ خان (اور ملک) جرمانہ کی یہ رقم اس شدومد سے تقاضا کر کے وصول کرتے جیسے یہ ان کا کوئی واجب الادا قرضہ ہو۔ جب لوگوں کو میرے عائد کردہ جرمانوں کی ادائیگی کی عادت ہوگئی تو میں نے حکم دیا کہ جرمانہ کی آدھی رقم سرکاری خزانہ میں جمع کرائی جائے۔ کچھ عرصہ بعد خان (اور ملک) کے حصہ کو گھٹا کر ایک تہائی کردیا گیا۔ دو تہائی سرکاری خزانہ میں جمع کیا جانے لگا۔ یہ طریقہ اختیار کر کے ایک طرف تو حکومت کے لئے اُس رقم کے بڑے حصہ کا حصول ممکن بنایا گیا جو بہ صورت دیگر صرف خسارہ کا سودا تھا۔ دوسری طرف خان اور ملک قانون وضابطہ کو لاگو کرنے کی اہمیت سے واقف ہوگئے۔"

وہ مزید بتاتے ہیں۔

"1. خوانین اور دیگر اہم شخصیات کی تائید اور وفاداری حاصل کرنے کے لئے پوری ریاست میں ان کو وظائف دیئے جانے لگے۔

2. خان (اور ملک) کو جرمانہ سے ایک تہائی دیئے جانے کی توثیق کردی گئی۔ اس طرح ریاست اور خان (اور ملک) کا مفاد ایک ہوگیا اور یہ لوگ مجرم کی طرف داری کرنے سے باز آگئے۔

3. تقویٰ اور خاندانی نجابت کا لحاظ کرتے ہوئے معزز سید اور میاں خاندانوں کے افراد کے لئے بھی وظائف مقرر ہوئے۔

4. اُن مولویوں کے لئے جو کہ مساجد میں پیش امام تھے اور دینی علوم سکھاتے تھے تنخواہیں مقرر کی گئیں تا کہ وہ پرخلوص انداز سے اپنا کام کرسکیں۔ دیگر مولویوں کو تنخواہ دار قاضی مقرر کیا گیا۔"

وہ سارے مولوی جو کہ پیش امام تھے انہیں حکومت سے تنخواہ نہیں ملتی تھی بلکہ اُن میں سے بہت سوں کو لوگ بڑی فصلوں کے موقع پر جنس کی صورت میں تنخواہ دیا کرتے تھے۔ یہ طریقہ ریاست کے قیام سے پہلے سے چلا آ رہا تھا۔ ریاست کے دوران اور ادغام کے بعد بھی جاری رہا ہے۔ تنخواہیں شاید بہت بااثر مولویوں کو ملتی ہوں گی۔

اس طرح مذہبی اور غیر مذہبی قیادت کو خرید لیا گیا اور وہ اپنے مفادات کے ہاتھوں یرغمال ہو گئے۔ حکومت کی مخالفت اور غداری کو محض خسارہ کا سودا بنا دیا گیا۔ یوں وہ پوری تن دہی سے حکومت کی خدمت میں جُت گئے۔ دونوں طرح کی قیادت کو اس طرح سے رام کر لیا گیا۔

جرگہ

صدیوں سے رائج جرگہ نظام سے بھی بھرپور فائدہ اٹھایا گیا۔ اس کے لئے صورتِ حال کی ضرورت کے مطابق طریقے اپنائے گئے۔ مثال کے طور پر 1921ء کے بحران کے دوران جب نواب امب کی افواج کو کڑا کڑ سے ڈگر پسپا ہونے پر مجبور کیا گیا۔ اس دوران باچا صاحب نے بونیر کے بااثر افراد پر مشتمل ایک نمائندہ جرگہ طلب کیا۔ انہیں اُن کا وہ وعدہ یاد دلایا گیا کہ جب بھی نواب امب جارحانہ عزائم کے ساتھ ان کے علاقہ میں داخل ہوگا تو وہ اُس کی فوج کو اپنے علاقہ سے نکال باہر کریں گے۔ علاوہ ازیں اُن سے کہا گیا کہ اب وقت آ گیا ہے۔ اگر وہ پامردی سے حملہ آوروں کو اپنی سرزمین سے باہر نہ نکالیں گے تو ان کا قومی وقار خاک میں مل جائے گا۔ یہ تیر نشانہ پر لگا اور وہ اس بات پر راضی ہو گئے کہ نواب کو باقاعدہ طور پر کہیں کہ وہ ان کے علاقہ سے نکل جائے۔ اگر اُس نے انکار کر دیا تو پھر وہ سوات کے حکمران کے ساتھ مل کر اُس سے لڑیں گے۔ نواب کو جیسے ہی اس اتحاد کی اطلاع پہنچی وہ کڑا کڑ سے پیچھے ہٹ کر ڈگر (بونیر) چلا گیا۔

عبدالودود کو اُس بات پر یقین تھا کہ جب تک لوگوں کو غیر مسلح نہ کر دیا جائے اُس وقت تک ریاست میں امن وامان کا قیام ایک خواب ہی رہے گا۔ یہ آسان کام نہیں تھا۔ خصوصاً خوانین اور دوسرے اہم لوگ اس بات پر ہرگز تیار نہ ہوتے۔ مسئلہ اصل میں یہ تھا کہ یہ کام کس طرح کیا جائے۔

اس مشکل کا حل بھی جرگہ کے ذریعے نکالا گیا۔ عبدالودود نے اپنے سارے دوستوں کو جمع کیا اور انہیں یقین دھانی کرائی کہ ان کی املاک اور زندگیوں کو ریاستی ملیشیا اور پولیس تحفظ فراہم کرے گی۔ ان کی تائید حاصل کرنے کے بعد ایک جرگہ طلب کیا گیا جس میں سارے سرکردہ خوانین اور دیگر ممتاز شخصیات شریک ہوئیں۔ اُن سے مطالبہ کیا گیا کہ ریاست کی فلاح و بہبود کے لئے انہیں اپنا اسلحہ سرکاری اسلحہ خانہ میں جمع کرنا ہوگا۔ اُس کے دوستوں نے سب سے

پہلے اس پر عمل کیا۔ اس کے بعد دوسروں نے بھی اس کی پیروی کی۔ حالاں کہ بابوزئی کے جمروز خان کی طرح کچھ لوگوں نے اس پر ناک بھوں چڑھائی لیکن انکار کوئی نہیں کر سکا اور عام لوگ بھی اس کام میں شامل ہو گئے۔

ایسے لوگوں کو قوانین اور ضابطوں کا پابند بنانا جو ابھی تک آزادروی کے ساتھ زندگی گزارتے آئے تھے، آسان ہرگز نہیں تھا۔ اس کا بھی علاج جرگہ کے ذریعہ کرلیا گیا۔ جب کوئی نیا علاقہ ریاست میں شامل ہوتا، چاہے اُسے فتح کیا گیا ہو یا اپنی مرضی سے شامل ہوا ہو، عبدالودود وہاں کے لوگوں کا ایک جرگہ بلاتا اور اُن سے کہتا کہ وہ علاقہ میں ہونے والے جرائم کے لئے خود قوانین وضع کریں۔ اس طرح جو قوانین بنائے جاتے اُس پر جرگہ کے سارے ارکان دستخط کرتے اور وہاں کے مجرموں کو پھر انہی قوانین کے تحت سزائیں دی جاتیں۔ اس طرح لوگ ان قوانین کو اوپر سے نافذ کردہ نہ سمجھتے بلکہ انہیں اپنے قوانین گردانتے ہوئے ان پر عمل درآمد کو اپنا فرض سمجھتے اور سزاؤں پر برا نہ مناتے۔

فوج اور اسلحہ کے استعمال کی جگہ ریاست کی توسیع اور اس کی سرحدوں کو پھیلانے میں جرگہ کو ایک بہت ہی موثر اور کارگر ہتھیار کے طور پر استعمال کیا گیا۔ چاہے 1921ء میں بیرونی اور اندرونی دشمنوں کا پیدا کردہ بحران ہو، قوانین سازی ہو یا لوگوں سے اسلحہ اکٹھا کرنے کی کامیاب مہم ہو ہر جگہ جرگہ ہی کامیابی کی چابی ثابت ہوا۔

نفسیات کا خیال

لوگوں کی نفسیات اور قبائلی ماحول کی مخصوص صورتِ حال کو نظرانداز نہیں کیا گیا بلکہ ریاست کے استحکام کے حصول کے لیے ان سے کماحقہ کام لیا گیا۔ باچا صاحب کہتے تھے کہ وہ لوگوں کی ذہنیت سے اتنے واقف تھے کہ انہیں کسی ضابطہ کے تحت لانے کے لئے زبردستی کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ انہیں معلوم تھا کہ کس حد تک آزادمنشی ان کی فطرت کا حصہ ہے، جس کی وجہ سے وہ احکام کے جواب میں بعض اوقات ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اسی لئے قوانین وضوابط اُس نے آہستہ آہستہ مرحلہ وار نافذ کئے۔ جو کامیابی پر منتج ہوئے۔

ریاست کی توسیع

بونیر، کانڑا اور غوربند کی طرف ریاست کی توسیع اسے مزید مستحکم اور محفوظ بنانے کی غرض سے عمل میں لائی گئی۔ اس لئے کہ 1922ء میں ادین زئی علاقہ کے چلے جانے سے باچا صاحب نے محسوس کرلیا تھا کہ بونیر، کانڑا اور غوربند کو شامل کئے بغیر ریاست کے استحکام کو ہر وقت خدشات لاحق رہیں گے۔

سرکاری ملازمتیں

بڑے سرکاری عہدوں پر ہمیشہ متمول اور وفادار خاندانوں کے افراد کا تقرر کیا جاتا تھا تاکہ بغاوت اور دشمنی پر آمادہ لوگوں کا بروقت توڑ ہوتا رہے۔ نچلے سرکاری ملازمین ہمیشہ نچلے طبقات سے لئے جاتے تھے جس سے صرف یہ نہیں کہ وہ حکمران کے لئے احسان مندی کے جذبات رکھتے تھے بلکہ اُس کے اور اپنے مفاد کو ایک سمجھتے تھے، اور سوچتے تھے کہ ان کا مستقبل اُس کے ہاتھ میں ہے۔

نیا نظام

باچا صاحب نے حکومت کا ایک بالکل نیا نظام متعارف کرایا جس کے اپنے قوانین وضوابط، محاصل، فوج، پولیس، انتظامیہ اور نظام عدل تھا۔ پرانے قبائلی نظام کی جگہ اس نے لے لی۔ قوت اور اختیار کے ارتکاز سے حکمران بہت مضبوط ہوگیا۔ ریاست کی طرف سے خان اور ملک کی سرپرستی کا نیا طریقہ اختیار کیا گیا۔ ان لوگوں کو نہ صرف یہ کہ وظائف دیئے جانے لگے بلکہ ہر جرمانہ میں سے ان کو ایک خاص حصہ دیا جانے لگا۔ اس سے معاشرہ میں تقسیم نے ایک نئی شکل اختیار کر لی۔ ریاستی سرپرستی سے فائدہ اٹھانے والے خان، ملک اور مذہبی قیادت نے حکمران کے محافظ و سرپرست کا کردار ادا کرنا شروع کیا اس لئے کہ اسی میں ان کا بھی بھلا تھا۔ دونوں کا مفاد اسی میں تھا۔

نظام مواصلات

عبدالودود کو اس بات کا بخوبی علم تھا کہ جب تک ریاست کا ہر علاقہ مرکز کے دسترس میں نہ ہو مؤثر طریقہ سے حکومت نہیں چلائی جاسکتی۔ اس لئے اُس نے سارے اہم قصبات اور نئے مفتوحہ والحاق شدہ علاقوں تک سڑکوں کا ایک جال بچھا دیا۔ سڑکوں کی تعمیر کا یہ کام بیگار اور ریاستی ملیشیا کے ذریعہ کیا جاتا تھا۔ تمام قلعے اور انتظامی دفاتر ٹیلی فون کے ذریعے ایک دوسرے سے مربوط تھے جس کی وجہ سے ریاستی افواج کو فی الفور حرکت میں لایا جاسکتا تھا، حسب ضرورت اور بروقت کمک کی ترسیل ہوسکتی تھی اور تعزیری مہموں کے لئے فوج بآسانی بھیجی جاسکتی تھی۔ مرکز اور دور دراز علاقوں کا آپس میں رابطہ رہتا تھا۔

جیمز ڈبلیو سپین کا مندرجہ ذیل اقتباس اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ قلعے اور ٹیلی فون استحکام کے حصول کے کارگر ذرائع تھے۔ کسی قلعہ میں تعینات ایک معمر سب انسپکٹر کے بارے میں اپنے بیان میں وہ کہتے ہیں۔

''عمر رسیدہ سب انسپکٹر نے دیوار پر لٹکے ہوئے ایک قدیم ٹیلی فون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ان کے ذریعہ ہمارے

میاں گل نے اس ریاست کو فتح کیا۔ اُس نے اعلان کیا کہ اُس نے اس قسم کے قلعے ہر جگہ تعمیر کیے۔ ان میں ٹیلی فون رکھوائے۔ جب بھی پہاڑی بھکاری گڑبڑ پر آمادہ ہوتے ہیں ہم اُسے فون پر بتا دیتے ہیں۔ وہ یا تو اور آدمی بھیج دیتا ہے یا خود ہی آ جاتا ہے یا ہم اُس کے بیٹے والی صاحب کو جو کہ اب ہمارا بادشاہ ہے سب کچھ بتا دیتے ہیں دیکھو۔"

پرانے سماجی نظام میں تبدیلیاں

سوات کے معاشرہ اور سماجی تنظیم کی ایک خاصیت 'آزادانہ اختیار و انتخاب' کے اصول کا استعمال تھا۔ لوگ اپنی مرضی استعمال کر کے کسی سربراہ یا حکمران کو بنانے جیسا انتہائی قدم اٹھا سکتے تھے جیسا کہ عبدالجبار شاہ کے معاملہ میں دیکھا جا سکتا ہے۔

عبدالجبار شاہ کے انجام سے بچنے کے لئے یا شائد ہندوستان کی انگریز حکومت کی پالیسی سے سبق حاصل کرتے ہوئے عبدالودود اس نتیجہ تک پہنچ گیا تھا کہ موجودہ سماجی تنظیم میں بنیادی تبدیلیاں لائے بغیر سیاسی استحکام کا حصول ممکن نہیں۔ اس لئے اُس نے سوات کے سماجی ڈھانچہ کو بدل ڈالا جس سے ریاست بھی مستحکم ہوگئی اور اُس کی اپنی پوزیشن بھی مضبوط ہوگئی۔

ڈلہ (دھڑا) نظام

روایتی ڈلہ (دھڑا) نظام سے بھی حتی الوسع فائدہ اٹھایا گیا۔ جرگہ کی طرح اسے بھی اہم مواقع پر استعمال کیا گیا جیسے کہ عوام کو غیر مسلح کرنے کے معاملہ میں۔ چوں کہ حکمران کا ڈلہ (دھڑا) مضبوط تھا اس لئے مخالفین کا اثر و رسوخ اس سے کمزور پڑ گیا۔ اس کے سامنے ان کی حیثیت ماند پڑ گئی۔ اس طرح حکمران کے مفادات کا تحفظ کر لیا گیا۔ آخری والئی سوات نے بھی ڈلہ (دھڑا) کو بہ طور ہتھیار استعمال کرنے کے بارے میں بتایا ہے، جیسے کہ مندرجہ ذیل اقتباس سے ظاہر ہے۔

"میرے والد ہمیشہ دو ہرا ڈلہ (دھڑا) نظام قائم رکھتے تھے۔ اپنی طاقت کو ان میں توازن رکھنے کے لئے استعمال کرتے تھے۔ ایک ڈلہ ذرا سا کمزور ہوتا۔ دوسرا ان کا تھا۔ جب مضبوط یا حمایت یافتہ ڈلہ کے مطالبات حد سے بڑھ جاتے یا میرے والد کے مفاد و مرضی کے خلاف ہوتے یا ان کو پورا کرنا ممکن نہ ہوتا تو پھر وہ اپنا وزن دوسرے پلڑہ میں ڈال کر اُسے کچھ عرصہ کے لیے بھاری کر دیتے۔"

گروہی سیاست، دریادلی اور حسد

ایک طرف گروہی سیاست اور رقابتیں اور دوسری جانب دریادلی اور حسد سواتی معاشرہ کی دو اہم ترین خصوصیات تھیں۔ عبدالودود نے ان کو بھی ریاست کو سہارا دینے اور اپنے مفادات کے حصول کے لئے استعمال کیا۔ سوات کی ریاست کو ایک مستحکم مرکزی ریاست بنانے میں باچا صاحب کا سب سے مؤثر کارگر ہتھیار یقیناً تمام قابلِ عمل سیاسی اُمور پر اُن کی مکمل مدبرانہ گرفت ہی کو قرار دیا جا سکتا ہے۔

نوٹس

1. کنفیڈنشل این ڈبلیو ایف پی (پولیٹیکل) ڈائری نمبر 1، 7 جنوری 1928 ختم ہونیوالا ہفتہ، ڈپٹی کمشنر پشاور کی فائلیں، بنڈل نمبر 5، سیریل نمبر 65، پراونشل ارکائیوز، پشاور۔

میاں گل جہان زیب کے مطابق حبیب خان 'بہت ذہین، پیش بینی پر قادر، بلکہ غیر معمولی قابلیت والا انسان تھا'۔ (فریڈرک بارتھ، دی لاسٹ والی آف سوات: این آٹو بیاگرفی ایز ٹولڈ ٹو فریڈرک بارتھ، ریپرنٹ (بنکاک: وائٹ ارچڈ پریس، 1995)، صفحہ 67)۔ تاہم سرن زیب سواتی نے اُس کی ذہانت و قابلیت کے بارے میں بالکل مختلف رائے دی ہے۔ (دیکھیں سرن زیب سواتی کی کتاب *تاریخِ ریاستِ سوات* (پشاور: عظیم پبلشنگ ہاؤس، 1984)، صفحات 116 تا 120)۔

چھٹا باب

توسیع

(1917ء تا 1947ء)

اپنی پوزیشن کو یقینی طور پر مضبوط بنانے کے لئے عبدالودود پر لازم تھا کہ وہ اپنے زیرِ نگیں علاقہ میں توسیع کرے۔ وہ ایک بلند حوصلہ، بے چین طبع، بے حد توانا اور زبردست صلاحیتوں کا مالک شخص تھا۔ سوات کے اردگرد واقع علاقوں اور پڑوسی ریاستوں کی غیر واضح سیاسی صورتِ حال نے اُس کی توسیع پسندی کی بڑی مدد کی۔

وادیٔ سوات کے اندر توسیع

ستمبر 1917ء میں میاں گل عبدالودود کو صرف نیک پی خیل، سیبوجنی، شامیزیٔ، بابوزئی اور متوڑیزئی قبائل نے بادشاہ تسلیم کیا۔ اب سب سے پہلے اُسے اپنی توجہ شموزئی علاقہ کی طرف کرنی تھی جو کہ 4 ستمبر کو عبدالجبار شاہ کے سوات سے چلے جانے اور سواتی لشکر کے گھروں کو لوٹنے سے مکمل طور پر نواب دیر کے قبضہ میں چلا گیا تھا۔ عبدالودود یقیناً اس علاقہ کو اپنے ایک ایسے مضبوط حریف کے قبضہ میں نہیں چھوڑ سکتا تھا جو پورے سوات پر اپنا دعویٰ رکھتا تھا۔

نواب دیر اور باجوڑ کے عبدالمتین خان کے درمیان لڑائی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے سوات کے حکمران نے نومبر 1917ء کو میاں گل شیرین جان کی قیادت میں اپنے لشکر کو شموزئی علاقہ پر حملہ کا حکم دیا۔ دیر کی افواج اس پورے علاقہ کو سواتیوں کے قبضہ میں چھوڑ کر ادین زئی علاقہ کی طرف پسپا ہوگئیں۔ اس کامیابی کے بعد ابا خیل اور موسیٰ خیل علاقے بھی اپنے جرگوں کے توسط سے ریاستِ سوات کا حصہ بن گئے۔ اس طرح ریاست میں عزی خیل اور جنکی خیل کے علاوہ پورا سوات شامل ہوگیا۔

شموزئی میں اپنی پوزیشن مستحکم کرنے کے بعد باچا صاحب مارچ 1918ء میں ادین زئی علاقہ کو نواب دیر کے قبضہ سے چھڑانے کا عزم کئے اُس پر حملہ آور ہوا۔ یہ نواب کے قبضہ میں سوات کا آخری علاقہ تھا۔ وہ 24 مارچ کو

قریباً دو ہزار افراد پر مشتمل فوج لے کر اس علاقہ میں داخل ہوا۔ چوں کہ دیر کی افواج کی طرف سے قلاؤں کی حفاظت کا کوئی خاص انتظام نہیں تھا، اس لئے اُس نے جلد ہی اس پورے علاقہ پر قابو حاصل کر لیا لیکن جب 28 مارچ کو اُس نے شوا کا قلعہ نواب کی افواج سے چھیننے کی کوشش کی تو اس میں وہ ناکام رہا۔ اس لئے کہ نواب کی فوج نے عقب سے حملہ کر دیا اور سواتیوں کو شموزئی کی طرف پسپا ہونا پڑا۔

جولائی 1918ء میں نواب نے اپنے کھوئے ہوئے سواتی علاقے دوبارہ قبضہ کرنا چاہے۔ اُس کی فوج کو دیر کے کئی خوانین کے لشکروں کی مدد حاصل تھی۔ اُس نے 11 اگست کو شموزئی پر حملہ کر کے اُسے بالآخر فتح کر لیا۔ ستمبر کے دوسرے ہفتہ میں کچھ سواتی لشکر نواب کے لوگوں کو وہاں سے نکال باہر کرنے کے لئے آئے لیکن حملہ کئے بغیر ہی واپس لوٹ گئے۔ لیکن باجوڑ پر عبدالمتین خان کا حملہ ایک غیبی امداد ثابت ہوا۔ سواتیوں نے صرف شموزئی کو نواب سے واپس نہیں لیا بلکہ ادین زئی کو بھی اُس کے قبضہ سے چھڑا لیا۔ اپنا قبضہ برقرار رکھنے کے لئے شوا اور راموڑہ میں 400 کی نفری پر مشتمل باقاعدہ فوج تعینات کر دی گئی۔ جب کہ قبائلی لشکر گھروں کو لوٹ گئے۔

شموزئی اور ادین زئی دوبارہ فتح ہونے کے بعد عزی خیل اور جنکی خیل کے جرگوں نے اپنے اپنے علاقے ریاست کا حصہ بنانے پر صاد کر لی۔ اس طرح 1920ء کے ختم ہونے سے پہلے ہی یہ علاقے بھی اس میں شامل کر لئے گئے۔ اب ریاست کی حدود میں سوات بالا کی پوری وادی دریا کے دونوں جانب اور زیریں سوات میں دریا کے دائیں جانب ادین زئی علاقہ کے آخری حد تک کا سارا علاقہ شامل تھا۔ جون 1918ء میں باچا صاحب نے جنکی خیل کی ایک کالونی تیرات [1] کی طرف بھی عشر جمع کرنے کے لئے اپنے آدمی بھیجے، جہاں سے اس سے پہلے کسی نے بھی عشر نہیں لیا تھا۔ عشر کو دراصل اطاعت قبول کرنے کی ایک علامت کے طور پر دیکھا جاتا تھا۔

نواب دیر نے اپنے کھوئے ہوئے علاقے دوبارہ قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ اس مقصد کے لئے اُس نے 1921ء میں عبدالجبار شاہ اور سوات کے کچھ خوانین کے ساتھ ایک معاہدہ بھی کیا۔ تاہم شموزئی سے آگے کے دائیں جانب کے علاقے 1922ء کے ادین زئی معاہدہ کے تحت نواب کو لوٹانے پڑے۔ یہ معاہدہ برطانوی حکومت کی ایما اور مداخلت پر کیا گیا۔

سوات کوہستان اور بونیر کی جانب توسیع

جب نواب امب نے چکیسر اور کزا کڑ کی اطراف سے دو بار حملوں کی کوشش کی تو میاں گل عبدالودود کو یقین ہو گیا کہ جب تک بونیر، کانڑا اور غوربند پر قبضہ نہ کر لیا جائے، ریاست کے استحکام کو خدشات لاحق رہیں گے۔

ادین زئی معاہدہ نے مغربی سرحد کو محفوظ کردیا۔ اب مشرق اور جنوب کی طرف توسیع کے راستے کھل گئے۔
اس سے عبدالودود کو بونیر، غوربند، کانڑا، چکیسر اور اباسین کوہستان کا کچھ علاقہ قبضہ کرنے کا موقع مل گیا۔ ان علاقوں کی جانب سے کئے گئے گزشتہ حملوں نے عبدالودود کو اُس کی کمزوری کا احساس دلا دیا تھا۔ اس لئے ریاست کو محفوظ بنانے کے لئے اُس نے ان پر قبضہ کا پختہ عزم کرلیا تھا۔ بونیر کے جلا وطن خوانین نے، جو سیدو میں رہتے تھے اور جو اُس کے ڈلہ (دھڑا) سے تعلق رکھتے تھے، عبدالودود سے ملاقات کی اور اُس کو ترغیب دی کہ وہ ان کی ہمراہی میں بونیر پر حملہ کردے لیکن اُس نے انہیں نواب امب کی فوج کو بونیر سے نکال باہر کرنے کے لئے بھیج دیا۔

1922ء میں سوات کوہستان کے معززین نے باچا صاحب سے ملاقات کر کے درخواست کی کہ اُن کے علاقہ کو بھی ریاست میں شامل کر دیا جائے۔ اس طرح کے رضا کارانہ ادغام کے لئے بھی طاقت کے مظاہرہ کی ضرورت تھی اس لئے کہ بعض اوقات اس قسم کے جرگوں یا وفود میں صرف ایک ڈلہ کی نمائندگی ہوتی تھی۔ باچا صاحب نے، جو اُس وقت بونیر مہم کی تیاری میں مصروف تھے، ان کی دل جوئی کے لئے اپنے کمانڈر انچیف کو ایک دستہ دے کر اُن کے ساتھ بھیج دیا اور اُسے بتادیا کہ وہ کوئی بہانہ کرکے وہاں سے لوٹ آئے۔ بحرین پہنچ کر کمانڈر انچیف نے قصبہ پر از خود قبضہ کی ٹھان لی۔ حملہ ناکام ہوا اور کمک طلب کی گئی۔ سواتی دستہ کی حالت خاصی کمزور ہو چکی تھی کہ اتنے میں کمک پہنچ گئی اور کوہستانی بھاگنے پر مجبور ہوگئے۔ اس طرح کوہستان کا تزویراتی لحاظ سے انتہائی اہم قصبہ قبضہ میں آگیا۔ وادی چیل کے کوہستانیوں نے مارچ 1921ء ہی میں اطاعت قبول کرلی تھی۔

نومبر 1922ء میں سوات کوہستان کے ایک ڈلہ (دھڑے) نے باچا صاحب کو دعوت دی کہ وہ آ کر ان کے علاقہ کا سوات کے ساتھ الحاق کرلیں۔ انہوں نے جرگہ کو ایک لشکر کے ساتھ بھیجا۔ وہ پشمال تک بغیر کسی مزاحمت کے آگے بڑھتا رہا۔ نواب دیر نے دیر کے کوہستانیوں کو غیرت دلائی کہ وہ نکل کر اس پر حملہ کردیں۔ نواب کا چھوٹا لشکر بعد میں بغیر لڑے اپنے علاقہ میں لوٹ گیا اور باچا صاحب کے لشکر سوات کوہستان میں چاڈ گرام (بالاکوٹ) کی چوکی پر قبضہ کر کے سیدو آگئے۔ باچا صاحب کا حامی 150 افراد پر مشتمل کوہستانیوں کا ایک جرگہ بھی سیدو آیا۔ البتہ کالام کے لوگوں نے ان سے کسی قسم کا کوئی تعلق رکھنے سے انکار کردیا۔

1923ء میں بونیر فتح کرنے کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ اس کی اطلاع ملاکنڈ پہنچ گئی۔ عبدالودود کے مطابق پولیٹیکل ایجنٹ نے سیاسی تحصیل دار بھیج کر اس کی تصدیق چاہی لیکن برطانوی سرکاری رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ اُس نے خود ہی ہندوستانی اسسٹنٹ کو قریباً 10 مارچ 1923ء کو سوات بلا کر ملنے کے لئے کہا۔ باچا صاحب نے کالا ڈھاکہ کے آزاد قبائل سے سلسلہ جنبانی کی اور وہاں کے سواتی قبائل اور حسن زئی قبائل کا سو افراد پر مشتمل وفد سیدو شریف آیا اور نواب امب کے خلاف اتحاد کی درخواست کی۔ 5 مارچ 1923ء کو سلار زئی قبیلہ کا 60 ارکان پر

مشتمل جرگہ بونیر سے سیدو آیا اور نواب امب کے خلاف مدد مانگی۔ دس مارچ کو خدوخیل کے ایک جرگہ نے بھی آ کر یہی استدعا کی۔

پولیٹیکل تحصیلدار سیدو آیا لیکن باچا صاحب نے مبہم سا جواب دے کر اُسے ٹال دیا۔ اس طرح پولیٹیکل ایجنٹ کو مکمل طور پر چکمہ دے دیا گیا۔ پھر اپنی حکمت عملی پر عمل کرتے ہوئے اُس نے 4 اپریل 1923ء کو بونیر اپنی فوج بھیج دی۔ پورا بونیر بغیر کسی خاص مزاحمت کے زیرنگیں آ گیا۔ برطانوی حکام نے اس کا اس طرح سے جائزہ لیا۔

"یہ بات پوری طرح ماننے کی ہے کہ اگر عبدالجبار شاہ اور نواب امب نے گزشتہ سال بونیر پر ناکام حملے نہ کئے ہوتے تو میاں گل یہ تازہ کارروائی نہ کرتا۔ اس سے اُس کا مقصد انتقام اور اپنی عظمت کا قیام نظر آتا ہے۔"

اسی دوران چغرزئی علاقہ کے نمائندوں نے آ کر سواتی حکمران سے سیدو شریف میں ملاقات کی اور اپنے علاقہ کو بھی ریاست کا حصہ بنانے کی پیش کش کی جسے قبول کرلیا گیا۔ عبدالودود نے ملاکنڈ کے دورہ میں چیف کمشنر کو بونیر پر برطانوی حکومت کو اعتماد میں لئے بغیر قبضہ کا جواز پیش کیا۔ بہر حال برطانوی حکام ریاست سوات میں توسیع کے اس تیز رفتار سے خطرہ محسوس کرنے لگے تھے۔ وہ سوچتے تھے کہ جانے یہ سلسلہ کہاں جاکر رکے گا۔

حالاں کہ بونیر پر سواتی فوج نے وہاں کے اپنے حامی ڈلہ کی رفاقت میں 'بغیر کوئی گولی چلائے' قبضہ کیا، علاقہ کے کچھ لوگ اس سے خوش نہیں تھے۔ مختلف رپورٹوں سے پتہ چلتا ہے کہ 'میاں گل کی حکومت سے وہاں کے کچھ لوگوں میں بے چینی پھیل رہی تھی۔' اطلاع ملتے ہی کہ نواب امب جملہ عبور کرتے ہوئے ناوا گئی قلعہ پر حملہ کرنے والا ہے، باچا صاحب نے اپنے وزیر احمد علی کی قیادت میں نظامی لشکر کو ڈگر کی طرف بھیجا۔ اس لشکر کو مزید تقویت دینے کے لئے ابا خیل، موسیٰ خیل اور بابوزئی کے قبائلی لشکر کو کڑاکڑ کے راستے بھیجا۔ ان کی تعداد تین سو سے چار سو تک بتائی جاتی ہے۔ وہ رات گزارنے کے لئے سلارزئی علاقہ کے حجروں میں ٹھہر گئے۔ ان پر بے خبری میں حملہ کیا گیا۔ کہتے ہیں کہ ایسا شائد عبدالجبار شاہ کی تحریک پر کیا گیا ہو۔ کچھ جانی نقصان کے بعد سواتی لشکر نے ہتھیار ڈال دیئے اور انہیں سوات لوٹنے کی اجازت دے دی گئی۔ 'واپسی کے دوران ان پر سلارزئی قبائل نے شب خون مارا۔ میاں گل عبدالودود کے بیان کے مطابق پچاس یا ساٹھ افراد مارے گئے۔ دوسرے ذرائع جانی نقصان کی تعداد سو یا ایک سو پچاس بتاتے ہیں۔' عبدالودود نے اب ایک اور بڑا لشکر نیک پی خیل علاقہ سے اکٹھا کیا اور سلارزئی پر ہر طرف سے حملہ کر دیا۔ ان میں سے ایک بڑی تعداد ماری گئی۔ ان کی کچھ عورتیں اور مال مویشی سوات لائے گئے۔ بہت سے مردان بھاگ کر مہاجر بن گئے۔ تین دن تک ان کا قتل عام کرنے کے بعد یہ لشکر وزیر کی فوج کی مدد کے لئے ڈگر کی طرف بڑھا۔

کانزا،غوربند،چکیسر اور چغرزئی کی طرف توسیع

بونیر کے بعد اُس نے اپنی توجہ کانزا،غوربند،چکیسر اور چغرزئی علاقہ کی طرف مبذول کی۔ جون 1923ء میں یہ رپورٹ پہنچی کہ پورن،غوربند،لیلونی،چکیسر اور غیر مصدقہ طور پر چغرزئی کے باشندوں نے پرامن طور پر میاں گل کی حکمرانی کو تسلیم کرلیا ہے اور آپس میں ایک دفاعی معاہدہ کرلیا ہے لیکن حقیقت میں یہ بات صرف پورن کی حد تک صحیح تھی اس لئے کہ غوربند اور لیلونی پر جون کے اواخر میں قبضہ کیا گیا اور نومبر 1923ء میں عبدالودود نے کانزا اور چکیسر پر قبضہ کا عزم کیا۔

علاقہ کی ایک باا ثر شخصیت پیر داد خان کے دوستانہ مشورہ پر عمل کرتے ہوئے سوات کے حکمران نے بہ ظاہر تو کانزا کی طرف فوج روانہ کی لیکن فوج کی اصل منزل چکیسر تھا۔اس کے لئے غوربند کا راستہ استعمال کیا گیا۔سپہ سالار کے قیادت میں قریباً 4ہزار افراد پر مشتمل یہ فوج بہ ظاہر کانزا فتح کرنے کے لئے نکلی لیکن دراصل اسے چکیسر جانا تھا۔یہ حکمت عملی کارگر ثابت ہوئی۔اچانک سواتی فوج اپنے سامنے پاکر یہ لوگ ششدر رہ گئے اور بغیر لڑے ہتھیار ڈال دیے۔

کانزا نے بھی سوائے نویکلی کے جو کہ حکیم خان کا مرکز تھا اطاعت قبول کرلی لیکن اس علاقہ پر مکمل فتح آسانی سے حاصل نہیں ہوسکی۔اس کے لئے عبدالحکیم خان اور عبدالجلیل خان آف کانزا نے متحد ہوکر مزاحمت کی ٹھان لی۔سپہ سالار 14 نومبر کو چکیسر سے کانزا روانہ ہوا اور اَپل کے مقام پر ایک سخت لڑائی کے بعد بالآخر سوات کی فوج کامیاب ہوگئی۔کانزا اور چکیسر کے جرگوں نے سیدو جاکر باچا صاحب کی وفاداری کا حلف لیا۔اس طرح دیر اور امب کی حملہ آور افواج کو نکال باہر کرکے سوات کے حکمران نے اپنی حکومت 'کو سوات خاص سے باہر بونیر،سوات کوہستان کے نچلے حصہ، اور غوربند،کانزا چکیسر اور پورن تک پھیلا لیا جو کہ سوات واٹر شیڈ اور اباسین کے درمیان واقع ہے۔'

دسمبر 1923ء میں مارتونگ پر دوبارہ قبضہ کرنے کے لئے ایک لشکر روانہ کیا جس پر بسی خیل اور نصرت خیل چغرزئی قبائل نے حملہ کرکے قبضہ کرلیا تھا۔لشکر نے صرف مارتونگ پر دوبارہ قبضہ نہیں کیا بلکہ اباسین کے کنارے تک کا پورا علاقہ تاراج کردیا۔1923ء میں عبدالودود' فقط بونیر اور حملہ پر قابض نہیں ہوا بلکہ سوات اور بونیر کے قبائل کے قبضہ میں وادئ سوات سے اباسین تک کا پورا علاقہ اُس کے زیر نگیں آ گیا۔'

میاں گل عبدالودود اپنی کامیابی پر نازاں تھا۔اُس نے چکیسر اور کانزا کی فتح پر اپنے سپہ سالار کو انعامات دیئے اور اپنی فوج کی خدمات اور بہادری کی تعریف کی۔8 فروری 1924ء کو سیدو میں منعقدہ ایک پارٹی میں اُس نے پانچ میجروں کو کمانڈنگ افسر،اور نو دیگر فوجیوں کو میجر بنادیا اور تمام فوجی افسران کو تمغے اور انعامات دیئے گئے۔ مارچ

1924ء میں چکیسر کے دو چھوٹے قلعے گزمی جبہ اور گزمی دار یال سفارت کاری کے ذریعہ برادر خان آف تاکوٹ سے باچا آف سوات اسٹیٹ کو منتقل ہوئے۔

اُس سمت میں مزید توسیع 1930ء تک معطل رہی جب سوات کے حکمران نے اباسین کے دائیں جانب چغرزئی علاقہ کے ایک چھوٹے سے کونے کو روندڈالا، جو کہ اب تک آزاد چلا آرہا تھا، اور برطانوی حکومت سے کئے جانے والے معاہدہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے حسن زئی علاقہ کے ایک حصہ پر بھی قبضہ کرلیا۔

اباسین کی دوسری جانب توسیع

میاں گل عبدالودود نے پولیٹیکل ایجنٹ کو یقین دھانی کرائی کہ اُس کا اباسین کو عبور کرنے کا کوئی ارادہ نہیں لیکن پولیٹیکل ایجنٹ نے اُسے یاد دھانی کرانے کے لئے اس موضوع پر ایک اور خط بھیجا۔ اُسے 27 دسمبر 1923ء کو جواب آیا جس میں بیان کیا گیا تھا کہ عبدالودود کی فوج نے بسی خیل اور دیگر دشمن عناصر کو اباسین کے اُس طرف دھکیل دیا ہے۔ اباسین کے اُس پار وہ صرف تاکوٹ خان برادر خان اور کانزا سے بھاگے ہوئے مخالف گروہ کی موجودگی کی وجہ سے کچھ قدم لینے پر مجبور ہوا۔ برطانوی حکومت نے خطرہ محسوس کیا اور پولیٹیکل ایجنٹ نے سوات کے وزیر سے کہا کہ 'ہماری حکومت اپنے شمال میں ایک اور افغانستان بنانے کی اجازت نہیں دے گی۔ تمہیں اباسین کو عبور نہیں کرنا چاہئے اور واپس جانا چاہئے۔ اس طرح عبدالودود کو برطانوی حکومت نے صاف صاف متنبہ کردیا تھا کہ 'اگر اُس نے اباسین کو عبور کیا تو دوسری طرف اُسے برطانوی حکومت کے مقابل آنا پڑے گا۔' اس طرح یہ بات پوری طرح واضح ہوگئی کہ اس سمت اباسین ریاست سوات کی آخری حد ہے۔

خدوخیل اور امازئی کی طرف توسیع

اگست 1924ء کو سوات کی افواج خدوخیل، گدون اور امازئی کی طرف بڑھیں۔ بہت سے خدوخیل ضلع پشاور فرار ہوگئے اور جو باقی رہ گئے انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے اور سوات کا وزیر خدوخیل سے اپنا لشکر مبارک خیل کی طرف لے گیا۔ اُس نے اسسٹنٹ کمشنر مردان کو پیشگی اطلاع دیتے ہوئے خط لکھا اور اُسے اپنی مجوزہ کارروائی اور اُس کے مقاصد کے بارے میں آگاہ کیا اور اُسے یقین دھانی کرائی کہ لشکر بہت جلد واپس لوٹ آئے گا بشرطیکہ تناولی لشکر اس کے خلاف کوئی اقدام نہ کرے اور یہ کہ سواتی لشکر تناول علاقہ کی حد عبور نہیں کرے گا۔

اس طرح خدوخیل اور سورے امازئی کو سوات کے قبضہ میں لایا گیا۔ 1926ء میں عبدالودود نے برطانوی

حکومت سے ہونے والے معاہدہ میں یہ مان لیا کہ

''مندرجہ ذیل علاقے اُس کے اور نواب صب کے درمیان قدرتی سرحد کے طور پر رہیں گے۔ سارا الیسوزئی علاقہ (مداخیل، حسن زئی، اکازئی، چاڑ ماز ئی۔ گدون اور اتمان زئی (کیا۔ گنیل)۔ اس طرح عبدالودود کی حکومت کی سرحد یں جنوب اور جنوب مشرق میں برطانوی سلطنت اور مندرجہ بالا غیر جانب دار علاقہ سے جا لگیں اور ان سمتوں میں اُس کی توسیعی سرگرمیاں خود بخود رک گئیں۔''

اباسین کوہستان کی جانب توسیع

کانڑا پر قبضہ کے بعد سوات کے حکمران کا اباسین کوہستان کے کوہستانیوں سے آمنا سامنا ہو گیا۔ مئی 1925ء میں اُس نے وادئ کورمنگ کے نقطہ آغاز پر حملہ کر کے اُسے قبضہ کر لیا۔ 1926ء کے موسم گرما میں کوہستانی پھر پریشان کرنے لگے تھے۔ 31 اگست کو عبدالودود پولیٹیکل ایجنٹ سے ملنے ملاکنڈ گیا۔ اُس نے بتایا کہ اُس نے کوہستانیوں کے خلاف فوج بھیجنی اس لئے ضروری سمجھی، جو کہ کانڑا اور غوربند کے قریب شمال میں رہتے ہیں، تاکہ انہیں مسلسل ان علاقوں پر حملوں کی سزا دیں۔

اُس کی فوج نے سخت لڑائی کے بعد بشام اور لاہور پر قبضہ کر لیا۔ یہ مہم اُسے بہت مہنگی پڑی۔ ''اُس کارروائی کے دوران اُس کی افواج کو خاصا نقصان اٹھانا پڑا۔ تقریباً 150 افراد ہلاک یا زخمی ہوئے۔ اس پر 20000 روپے سے زیادہ خرچ آیا اور تقریباً ایک لاکھ کارتوس بھی استعمال ہوئے۔'' جب کہ معتبر ذرائع کے مطابق سواتیوں کا جانی نقصان تقریباً 500 ہلاک وزخمی افراد پر مشتمل تھا۔ بہت سے لوگ اُن بھاری پتھروں اور لکڑی کے تنوں کے نیچے آ کر زخمی اور ہلاک ہوئے جو کہ اُن کے اوپر گرائے گئے۔

چوں کہ اس کوہستانی علاقہ میں بہت نقصان اٹھانا پڑا، اس لئے مزید توسیع بہت احتیاط اور سفارتی ذرائع سے کی گئی۔ عبدالودود نے کوہستان کے اہم اور معزز ترین افراد کو مہمانوں کی حیثیت سے اپنے ہاں بلانا شروع کیا۔ اُن کا اچھا استقبال کیا جاتا تھا اور قیمتی تحائف و لباس سے اُن کو نوازا جاتا تھا۔ اس دریا دلی سے کچھ لوگوں کی حمایت حاصل کر لی گئی لیکن بہت سے ایسے خدشات میں مبتلا تھے کہ کہیں الحاق سے اُن کی عزت و وقار میں کمی نہ آ جائے۔ ان لوگوں نے اپنے مفادات کے تحفظ کی ضمانت چاہتے ہوئے الحاق کی درخواست کی۔ باچا صاحب نے وہاں موجود اپنے کوہستانی دوستوں سے اس کی تصدیق کروائی اور پھر ایک مضبوط فوج بھیج کر دبیر، رانولیا اور بنکوٹ پر قبضہ کر لیا گیا۔

لیکن کوہستانیوں کا اصل مرکز، دارالحکومت اور سب سے مضبوط قصبہ پٹن ابھی تک فتح نہیں کیا جا سکا تھا اور جب تک یہ نہ ہو جاتا تو کوہستان پر قبضہ کی ضمانت نہیں دی جا سکتی تھی۔ یہ ایک مشکل کام تھا لیکن عبدالودود نے عزم

کرلیا تھا کہ ایسا کرنا ضروری ہے۔ اُس نے پٹن کے معدودے چند دستوں کے ہمراہ ایک زبردست فوج روانہ کی۔ یہ فوج اتنی تیزی سے منزل کی طرف بڑھی کہ اُس نے ڈیڑھ سو میل کا فاصلہ انتہائی دشوار گزار پہاڑی راستوں سے چلتے ہوئے صرف تین دنوں میں پیدل طے کیا۔ ایک بھرپور حملہ کر کے اسے جلد ہی فتح کر لیا گیا۔ پٹن کی فتح کو ہستانیوں کی طاقت کا اختتام ثابت ہوئی اور اس کے زیرِ نگیں آتے ہی دیگر علاقے رضا کارانہ طور پر مدغم ہونے لگے۔ پہلے سیو شامل ہوا، پھر کندیا جس پر 1939ء میں قبضہ ہوا۔ اس طرح اباسین کے دائیں کنارے والا کوہستان ریاست سوات کا حصہ بن گیا۔

تانگیر اور الائی کی طرف توسیع

تانگیر اور الائی کے لوگوں نے بھی الحاق کی درخواست کی لیکن انگریز حکومت نے اس کی اجازت نہیں دی۔ بعد میں گلگت میں تعینات پولیٹیکل ایجنٹ نے اس بات کی وکالت کی کہ تانگیر اور الائی کا سوات سے الحاق برطانوی حکومت کے مفاد میں ہے لیکن اعلیٰ حکام نے اس بات سے اتفاق نہیں کیا۔ اس طرح اس سمت میں بھی ریاست سوات کی توسیعی حد قائم ہوگئی جس سے آگے جانا ممکن نہیں تھا۔

کالام کی طرف توسیع

کالام کے معاملات بالکل مختلف ہیں۔ اوشو، اُتروڑ، کالام، اور ارنائی یا گاؤری علاقہ کو سرکاری کاغذات میں کالام کا مشترک نام دیا گیا ہے۔ یہ علاقہ دریائے سوات کے بالائی تسلسل میں واقع ہے اور اس پر مہتر چترال، نواب دیر اور ریاستِ سوات کے باچا کا دعویٰ تھا۔ یہاں کے باشندے آزاد تھے، کسی کو عُشر نہیں دیتے تھے اور آزاد رہنا چاہتے تھے لیکن اُن کے باہمی جھگڑوں کی وجہ سے بعض اوقات کمزور فریق مندرجہ بالا تینوں دعوے داروں میں سے کسی ایک سے مدد کا طالب ہوتا جس سے اُس کو سازش کر کے اپنا اثر ورسوخ بڑھانے کا موقع مل جاتا۔ ارادہ یہ ہوتا کہ کسی طرح اس پورے علاقہ کو زیرِ نگین کرے۔ اصل دلچسپی سب کو یہاں کے ابھی تک محفوظ گھنے جنگلات سے تھی۔

چترال علاقہ پر اپنی ملکیت کا دعویٰ اس بنیاد پر کرتا تھا کہ چترالی حکمران یہاں پناہ لینے آتے تھے اور یہاں کے تقریباً چار سو گھرانے چترالی زبان بولتے تھے۔ دیگر یہ کہ چترالی ان سے سالانہ کچھ خچر بطور خراج وصول کرتے تھے۔ نواب دیر کے دعویٰ کی بنیاد دیر کوہستان اور یہاں کے لوگوں کی زبان کا ایک ہونا تھا جب کہ سوات کا دعویٰ صرف جغرافیائی بنیادوں پر تھا۔

ساتواں باب

اُمورِ خارجہ

برطانوی راج کے دوران ہندوستانی مقامی ریاستوں کی حیثیت کا دارومدار اس بات پر تھا کہ اُن کے حکمران برطانوی شہنشاہ کی بالادستی قبول کرلیں۔ یہ دراصل برطانوی قبضہ میں توسیع کے لئے ایک ایسی سیاسی حکمت عملی تھی جس کے تحت انتظامی اختیارات ریاستی حکمرانوں کے پاس رہتے تھے۔ 1857ء کی بغاوت کے بعد، جس کے اسباب میں سے ایک بڑا سبب ایسٹ انڈیا کمپنی کی توسیع پسندانہ پالیسی اور مقامی ریاستوں کا انگریز حکومت میں الحاق کا عمل تھا، ملکہ وکٹوریہ نے یہ مشہور و معروف عہد کیا تھا کہ 'مقامی شہزادوں کے حقوق اور عزت و وقار کا خیال رکھا جائے گا'۔

عبدالجبار شاہ کے عہد میں ریاستِ سوات اور برطانوی حکومت کے درمیان تعلقات کا احاطہ چوتھے باب میں کرلیا گیا ہے۔ عبدالودود کے عہد میں اس تعلق کو اُس کے خاندانی رویوں اور حکمران بننے سے قبل برطانوی حکومت سے اُس کے روابط اور رفاقت کے تناظر میں جانچنے کی ضرورت ہے۔

سید بابا اور اُس کے بیٹوں کے انگریز حکومت سے خاصے بہتر تعلقات تھے اور اُس کے چاروں پوتوں نے ان سے پہلے رابطہ کی کوشش اُس وقت کی جب 1895ء کی ملاکنڈ غزا کے بعد انہوں نے ملاکنڈ کے پولیٹیکل ایجنٹ سے خط و کتابت شروع کی لیکن انگریز حکومت نے ان کو یہ کڑا سا جواب دے کر اس سلسلہ کو ختم کر دیا کہ وہ اُس وقت تک اُن سے کوئی سروکار نہیں رکھے گی جب تک مقامی قبیلے انہیں حکمران نہ تسلیم کرلے۔

میاں گل خاندان نے جولائی 1897ء میں سرتور فقیر کو لنڈاکے سے ہٹانے کی کوشش کی تاکہ انگریز حکومت کے لئے سوات کی سرزمین پر کوئی مصیبت کھڑی نہ ہو لیکن وہ اس کوشش میں ناکام رہے۔ نتیجتاً عبدالودود اپنے چچیرے بھائیوں کے ساتھ 1897ء کے جہاد میں شرکت پر مجبور ہوا 'ورنہ تو اُسے کافر قرار دیا جاتا'۔ لیکن وہ اس جہاد میں تاخیر سے یعنی 29 جولائی 1897ء کو شامل ہوا اور اصل میدان جنگ سے دور ہی رہا بلکہ حقیقت میں اُس نے لڑائی میں شرکت نہیں کی لیکن اتنی بات بھی انگریز حکومت کو شک میں مبتلا کرنے کیلئے کافی تھی۔ اس سے میاں گل خاندان کو

انہوں نے اپنے لئے نا قابلِ اعتماد قرار دیا جس پر اس خاندان نے اُن کو خطوط لکھ کر امن کی خواہش اور اطاعت قبول کرنے کے لئے اپنی استدعا پیش کی۔ اس لئے جب اگست 1897ء میں انگریز حکومت کی طرف سے وادیٔ سوات کے خلاف تعزیری مہم شروع کی گئی تو ان سے ہتھیار چھیننے کے لئے خصوصی طور پر کہنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ 24 ستمبر 1897ء کو برطانوی حکومت سے مفاہمت کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے عبدالودود سوات بالا کے ایک جرگہ کے ساتھ پولیٹیکل ایجنٹ سے ملاقات کے لئے چک درہ گیا۔ وہ اپنے ساتھ دو سرکاری بندوقیں اور لیفٹیننٹ گریوز کی تلوار لے گیا جو کہ نواں کلی (موسیٰ خیل علاقہ) سوات میں دورانِ جنگ مارا گیا تھا۔

اس کے بعد والے مہینے وہ میاں گل خاندان کے دیگر افراد کو لے کر ملاکنڈ گیا اور سرتور فقیر کو نہ روک سکنے اور بعض لوگوں کی جانب سے ان کے مہر کے غلط استعمال کی صفائی پیش کی۔ انہوں نے پولیٹیکل ایجنٹ کو اپنی طرف سے خیر خواہی کے جذبات کی یقین دھانی کرائی اور اعتماد کی بحالی کی خاطر بونیر کو مطیع فرمان بنانے کی پیش کش کی۔ ملاکنڈ سے واپسی پر وہ اس مہم پر بونیر گئے تا کہ وہاں کے لوگوں کو انگریز حکومت کی طرف سے عائد کردہ اس جرمانہ کی ادائیگی پر قائل کریں جو جہاد میں شرکت کی وجہ سے ان پر عائد کیا گیا تھا لیکن لوگوں نے انکار کردیا۔

1902ء کے بعد سے میاں گل خاندان کے افراد کو کسی سالانہ پانچ سو روپے کی رقم انگریز حکومت کی طرف سے خفیہ طور پر وقفہ وقفہ سے دی جاتی رہی۔ 1903ء میں عبدالودود نے چک درہ سے چرائی گئی ایک رائفل انگریز حکومت کو بلا معاوضہ واپس کی۔ اپریل 1905ء میں میاں گل خاندان کے ارکان نے باجا خان کو نواب دیر مقرر کرنے کے لئے چیف کمشنر کے دربار منعقدہ بہ مقام چک درہ میں شرکت کی۔ اپنے خاندانی اور قبائلی جھگڑوں کو سلجھانے کے لئے مختلف مواقع پر پولیٹیکل ایجنٹ کے پاس آنے جانے سے میاں گل خاندان کے بارے میں انگریز حکام کے جذبات آہستہ آہستہ دوستانہ ہوتے چلے گئے۔

مارچ 1906ء میں عبدالودود نے ایک موٹر گاڑی خریدنے اور مینگورہ تک سڑک کی توسیع کے موضوع پر بات چیت کے لئے پولیٹیکل ایجنٹ سے ملاقات کی۔ اسی سال مئی کے مہینہ میں پولیٹیکل ایجنٹ اپنی بیوی کے ہمراہ سوات کے دورہ پر گیا اور سیدو میں بہ طور مہمان اُس کے ہاں قیام کیا۔ 1908ء میں سرتور فقیر نے ایک بار پھر قبائل کو ملاکنڈ پر حملہ کے لئے اُکسایا۔ عبدالودود نے سوات میں سے اس کے گزرنے کی مخالفت کی۔ اس پر اُسے اور اُس کے بھائی کو انگریز حکومت کی طرف سے 20 ہزار روپے دیئے گئے۔ پولیٹیکل ایجنٹ نے عبدالودود اور اُس کے بھائی شیرین جان کے درمیان ثالثی کرا کے معاہدہ کروایا۔ معاہدہ ٹوٹنے پر ملاکنڈ میں ان کی ملاقات کا انتظام کیا گیا جہاں پر تنازعہ عارضی طور پر حل ہوا۔

جولائی 1913ء میں عبدالودود اور اُس کے بھائی نے انگریز حکومت کو اپنی طرف سے یہ پیغام پہنچایا کہ وہ

اپنے اثر ورسوخ کو اُن کی مرضی کے مطابق استعمال کرنے کے لئے تیار ہیں۔ فروری 1914ء میں انہوں نے مزید باور کرایا کہ وہ بونیر میں بھی انگریز حکومت کے حق میں اپنا رسوخ استعمال کرنے کے لئے تیار ہیں۔ انہوں نے بونیر اور صوابی میں انگریز حکومت کے مفاد کے لئے اثر و رسوخ استعمال کیا۔ جب پہلی جنگ عظیم چھڑی تو انہوں نے انگریز حکومت کی حمایت کا اظہار کیا اور انڈین ریلیف فنڈ میں چندہ دیا۔ جون 1915ء میں سوات بالا کے لوگوں نے سنڈاکئی بابا کے زیر اثر ادین زئی علاقہ پر قبضہ کی کوشش کی۔ انگریز حکومت نے اس کارروائی کی مخالفت کی۔ صورتِ حال نے نازک رخ اختیار کیا۔ اس موقع پر میاں گل برادران نے انگریز حکومت کو بیش بہا امداد فراہم کی۔

جنگِ عظیم اول کے دوران حاجی صاحب آف ترنگزئی اور سنڈاکئی بابا سوات اور ملحقہ علاقوں میں انگریز مخالف کارروائیوں میں اضافہ کی کوشش میں سرگرم رہے۔ جب کہ میاں گل برادران اور اُن کے ہم خیال پاسینئی ملا (ابوبکر) نے انہیں ایسا کرنے سے روکا اور ان کے ایسے اقدامات کو اسلامی تعلیمات کے خلاف قرار دیا۔ سید دبابا کی اولاد میں سے ہونے کی وجہ سے بہت سے لوگ ان کی اس بات کو اہمیت دیتے تھے۔

جب نومبر 1915ء میں عبدالجبار شاہ نے میاں گل برادران کو سوات سے نکال باہر کیا تو عبدالودود پولیٹیکل ایجنٹ سے ملاقات کے لئے ملاکنڈ گیا۔ اُسے تھانہ یا درباب چک درہ میں اپنی سریٰ اراضی پر قیام کی اجازت دے دی گئی۔ جب نومبر 1916ء میں میاں گل برادران اور سواتیوں کے درمیان معاہدہ امن کے لئے گفت گو جاری تھی تو عبدالودود نے سواتیوں سے کہا کہ وہ برطانوی حکومت سے بھی معاہدہ امن کر لیں۔

عبدالودود کی حکومت کے بالکل ابتدائی دنوں میں گائیڈز کیولری چک درہ کے دوسوار اپنی بندوقیں اور گولیاں لے کر فوج سے بھاگ گئے۔ عبدالودود نے ان میں سے ایک کو صرف گرفتار کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اُس کی بندوق اور گولہ بارود کو بھی ملاکنڈ میں انگریز حکام کے پاس بھیج دیا۔ مارچ 1918ء میں عبدالودود اپنے دو ہزار آدمیوں کے ساتھ ادین زئی میں نمودار ہوا لیکن انگریز حکومت نے عبدالجبار شاہ کی طرح اُسے ملاکنڈ چترال روڈ کی طرف آگے بڑھنے سے نہیں روکا۔ البتہ جب اُس نے لنڈاکے کے مقام پر ایک چوکی بنانی چاہی تو اُسے بتایا گیا کہ انگریز حکومت اس بات کی اجازت نہیں دے گی۔

جون 1918ء میں سنڈاکئی بابا سے ملنے کے لئے دو آدمی جو خود کو ترک کہتے تھے اور حاجی صاحب ترنگزئی کی طرف سے کچھ لوگ سوات کوہستان آئے تا کہ انہیں اس بات پر آمادہ کریں کہ لوگوں کو ایک بار پھر انگریزوں کے خلاف جہاد کے لئے تیار کریں۔ عبدالودود نے کہا کہ سوات انگریز حکومت سے لڑنے کا متحمل نہیں ہوسکتا بلکہ وہ تو انگریزوں کے ممنون ہیں کہ انہوں نے اقتصادی گھیراؤ ختم کر کے نقل وحمل کی اجازت دے دی ہے، جسے عبدالجبار شاہ کے عہد حکومت میں سواتیوں کی جانب سے انگریز حکومت کے خلاف یورش کی کوشش کے بعد 25 اگست 1915ء کو

1901ء کے ریگولیشن III کے تحت لاگو کیا گیا تھا۔ انگریزوں اور افغانستان کے درمیان لڑی جانے والی تیسری جنگ کے دوران سوات کے حکمران کی کاوشوں کے نتیجہ میں یہاں کے لوگ اُس سے لاتعلق رہے۔

جون 1921ء میں جب عبدالودود کے ایک وزیر نے سوات کے جنگلات کے باب میں بات چیت کے لئے پولیٹیکل ایجنٹ سے ملاقات کی تو برطانوی حکومت نے اچھی طرح اُس پر یہ بات واضح کر دی کہ چترال اور دیر سڑک، جس کا دس میل کا حصہ ریاست سوات کے حدود میں سے گزرتا تھا، پر چلنے والی ٹریفک سے چاہے وہ نجی ہو یا سرکاری کسی قسم کی چھیڑ چھاڑ کو ہرگز برداشت نہیں کیا جائے گا۔ اسی سال اکتوبر میں پولیٹیکل ایجنٹ ادین زئی کے ...رہ پر گیا اور وہاں موجود سوات کے کمانڈر کو صرف چترال روڈ اور چکدرہ کے قلعہ کے گرد و نواح کے تحفظ کو یقینی بنانے کے لئے زور دیا۔ عبدالودود نے پولیٹیکل ایجنٹ کو صرف اس بات کی تحریری یقین دھانی نہیں کرائی بلکہ بذاتِ خود اُس کو باور کرایا کہ انگریز حکومت کے خلاف منشا کوئی کام نہیں کیا جائے گا۔

1921ء ہی میں عبدالودود نے الزام لگایا کہ پولیٹیکل ایجنٹ نے سازش کرکے اُس کے مخالفین کا ایک اتحاد بنوالیا ہے۔ یہ اُس کا یہ الزام کسی حد تک مبنی بر حقیقت لگتا ہے اس لئے کہ نیک پی خیل میں اپنے جن مخالفین کو عبدالودود نے قید کیا ہوا تھا انہیں تھانہ کے خان صاحب بہرام خان کی مداخلت پر آزاد کر دیا گیا جو انگریز حکومت کا اتحادی اور دست راست تھا۔ تاہم انگریز حکومت نے ادین زئی میں سوات اور دیر کی ریاستوں کے درمیان چھڑی طویل (1918ء تا 1922ء) جنگ میں بہ ظاہر دونوں میں سے کسی کا بھی ساتھ نہیں دیا۔ اُس وقت ان کی حکمت عملی سے لگتا ہے، یہ تھی کہ مقامی حکمران اپنے تنازعات خود حل کریں۔ اور شاید وہ باچا صاحب کی طاقت کا اندازہ بھی لگانا چاہتے تھے۔ انہوں نے مداخلت اس وقت کی جب دونوں فریق طویل عرصہ تک اپنی افواج میدان جنگ میں رکھنے کی اہلیت نہ ہونے کی وجہ سے اس مہم کی مکمل ناکامی کی آخری حد تک پہنچ گئے تھے۔ اگر ایسا ہو جاتا تو باچا صاحب کا ادین زئی علاقہ پر قبضہ برقرار رہتا۔ چترال سڑک دس میل تک اسی علاقہ میں سے گزرتی تھی۔ چوں کہ برطانوی حکومت اس سڑک کی حفاظت کی مد میں نواب دیر کو پہلے سے ایک رقم دیتی تھی صورت حال میں تبدیلی اُس انتظام میں بے ربطی کا باعث ہو سکتی تھی۔

20 جون 1922ء کو برطانوی حکام نے دونوں فریقوں کے لئے ایک فرمان جاری کیا جسے ادین زئی معاہدہ کہا جاتا ہے۔ عبدالودود نے صوبہ سرحد اور سیاسی شعبہ کے اعلیٰ حکام کی مرضی کو مدنظر رکھتے ہوئے اس فرمان پر پوری طرح سے عمل درآمد کیا۔ اس سے اس پر برطانوی حکومت کے اعتماد میں اضافہ ہوا اور اُس کی حکمرانی کو رسمی طور پر تسلیم کرنے کی راہ ہموار ہوئی۔ گیارہ جنوری 1923ء کو چیف کمشنر سے ملاقات کے لئے وہ پشاور گیا اور اُس کے ملاکنڈ کے دورہ کے موقع پر دوبارہ اُس سے ملاقات کی جس کے دوران بونیر کے بارے میں اُس سے گفت گو ہوئی اور

برطانوی حکومت کی منشا معلوم کئے بغیر وہاں اپنے داخل ہونے کے معاملہ کی وضاحت پیش کی۔ اُس نے انہیں یقین دلایا کہ وہ بونیر سے برطانوی حکومت کے علاقہ پر کسی حملہ کی اجازت نہیں دے گا اور اُن کے خلاف افغان سازشوں کو بھی روکے گا۔

22 مئی 1923ء کو سیدو میں عبدالودود کے ولی عہد کی دستار بندی کی تقریب کے ایک دن بعد ایک اجلاس منعقد کیا گیا۔ اس اجلاس میں وزیر حضرت علی نے عبدالودود کی جانب سے ایک تقریر پڑھ کر سنائی جس میں شمال مغربی سرحدی صوبہ کے چیف کمشنر اور ملاکنڈ کے پولیٹیکل ایجنٹ کی طرف سے بونیر کی مہم کے دوران بالواسطہ امداد اور مہربانی کا انتہائی گرم جوشی سے شکریہ ادا کیا گیا۔ اُس نے تقریر میں مزید کہا کہ وہ برطانوی حکومت کا وفادار رہے گا اور حاضرین سے بھی کہا کہ وہ بھی انگریز حکومت کے وفادار ہیں، اُس کے خلاف کوئی سازش نہ کریں اور اُسے اپنا دوست گردانیں۔ اُس نے بالشویکوں اور ان کے پروپیگنڈے کی مذمت کی اور اسے اسلام کے خلاف قرار دیا۔ اس موقع پر موجود شرکاء نے وعدہ کیا کہ وہ برطانوی حکومت کے وفادار رہیں گے۔

بالشوزم کے ایک مشتبہ ایجنٹ مولوی عبدالعزیز نے وضاحت کی کہ

> ''بالشوزم اور اس کے مقاصد کیا ہیں۔ اُس نے کہا کہ اس کا انکار خدا کی منشا کے مطابق ہے۔ اس تحریک کا مقصد یہ ہے کہ دنیا کے سارے بادشاہوں، دولت مندوں، حکمرانوں اور مذہبی پیشواؤں کو تباہ و برباد کر دیا جائے۔ ان سے اور عام لوگوں سے اُن کی ساری جائیداد چھین لی جائے اور پھر اسے غلط طریقہ سے استعمال کیا جائے۔ اُس نے اس تحریک سے تعلق رکھنے سے انکار کیا اور دوسروں کو بھی نصیحت کی کہ وہ خود کو اس غلط تحریک سے دور رکھیں۔''

لیکن برطانوی حکام اب بھی عبدالودود اور سوات کے دیگر ممتاز لوگوں کو شک کی نظر سے دیکھ رہے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ وفاداری کے تمام تر اعلانات کے باوجود وہ بالشویکوں سے کسی نہ کسی حد تک ربط وضبط برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ پولیٹیکل ایجنٹ نے عبدالودود کے نام اپنی ایک تحریر میں مولوی عبدالعزیز کے بارے میں اپنی بدگمانی کا اظہار کیا۔ جواب میں اُس نے اس اُمر کی پرزور الفاظ میں تردید کرتے ہوئے پولیٹیکل ایجنٹ کو یقین دلایا کہ مولوی عبدالعزیز کا بالشویکوں سے کوئی رابطہ نہیں ہے۔

جولائی 1923ء میں عبدالودود اپنے اور نواب امب کے درمیان ہونے والے واقعات کی رپورٹ روزانہ کی بنیاد پر پولیٹیکل ایجنٹ کو بھیجتا رہا اور اُس سے اس بات کا عہد کیا کہ' کامیاب ہونے کی صورت میں وہ اباسین کو عبور کر کے تناول کی جاگیر میں داخل نہیں ہوگا، کسی بھی صورت حاجی صاحب آف ترنگ زئی یا باجوڑ سے امداد طلب نہیں کرے گا اور سختی سے ادین زئی معاہدہ کا پابند رہے گا۔'

جب 26 جولائی کو وہ بونیر کے مسئلہ پر بات کرنے کے لئے پولیٹیکل ایجنٹ کے پاس گیا تو اُس نے اس شرط

پر بونیر سے انخلاء پر رضامندی ظاہر کی کہ برطانوی حکومت اُس کے دیگر مقبوضہ علاقوں کی ضمانت دے۔ 27 جولائی کو برطانوی ہند کے کمانڈر انچیف نے اُسے ملاقات کی اجازت دی اور اُس نے 18 ستمبر 1923ء کو مل رانی زئی میں واقع کیمپ میں پولیٹیکل ایجنٹ سے ملاقات کی اور ملاکنڈ اور رانی زئی پر اپنے مجوزہ حملہ کے الزام کو اپنے دشمنوں کی نفرت اور دوستوں کے حسد کا نتیجہ قرار دیا۔' اُس کی بار بار کی یقین دھانی کے باوجود اُس کے چکیسر اور کانڑا کی مہموں کے دوران پولیٹیکل ایجنٹ نے اُسے اپنے معاہدوں کا پاس کرنے کے بارے میں لکھا۔ پولیٹیکل ایجنٹ کی خوشنودی کی خاطر اُس نے سیدوشریف کے اسکول میں تعینات ادینہ مردان کے ایک اسکول ہیڈماسٹر شمس الحق کو اس الزام میں سوات بدر کر دیا کہ اُس کا رویہ انگریز حکومت سے غیر مفاہمانہ ہے۔

برطانوی حکومت سے اپنے تعلق کو مزید مستحکم کرنے کے لئے عبدالودود نے 9 فروری 1924ء کو اپنے وزیر کے ہم راہ ملاکنڈ میں جا کر پولیٹیکل ایجنٹ سے ملاقات کی اور پھر پشاور گیا۔ اُس نے انگریز حکام کے ہم راہ سوات اور بونیر کے علاقہ کا ہوائی جائزہ لیا۔ اُس کے دوستوں نے تو اسے ایک اعزاز مان کر اس پر خوشی کا اظہار کیا لیکن دوسروں نے اُسے انگریز حکومت کی ایک چال ق. یا اور کہا کہ اُس کی خودنمائی کے جذبہ کو اس طرح تسکین دینے کی آڑ میں یہ لوگ دراصل اس علاقہ کی تازہ تصاویر اور نقشے بنانا چاہتے ہیں۔ اس وقت کی سیاسی ڈائری میں یہ تحریر ملتی ہے کہ' جو لوگ ہوائی جہاز پر اعتراض کرتے ہیں وہ درحقیقت دل میں انگریز حکومت کے دشمن ہیں۔ یہ اس بات کو جانچنے کا ایک اچھا پیمانہ ہے۔' اس بات کا اندراج کیا گیا ہے کہ

''میاں گل نے انگریز حکومت سے اپنے دوستانہ تعلقات کو برقرار رکھا ہے اور ایک سے زیادہ مواقع پر برطانوی پالیسی کا لحاظ کرتے ہوئے اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہنانے سے احتراز کیا ہے جیسے کہ ناکوٹ کے برادر خان کی سرزنش کے لئے اباسین کو عبور کرنے کی خواہش اور اسی طرح چھنے ہوئے ادین زئی علاقہ کو دوبارہ حاصل کرنے کی جستجو جس کا قبضہ 1922ء میں اُس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔''

عبدالودود نے بونیر کا سروے کرنے میں برطانوی حکومت سے مکمل تعاون کیا۔ پولیٹیکل ایجنٹ 10 مارچ 1926ء کو سیدوشریف آیا اور یہاں دورات قیام کیا۔ اُس نے اورل سٹائن کے تحفظ کے لئے بھی انتظامات کئے جو سوات کا سروے کرنے کے لئے یہاں کا دورہ کرنا چاہتا تھا۔ 16 مئی 1926ء کو ملاکنڈ واپسی پر اُس نے اپنے اس دورہ کو ہر لحاظ سے کامیاب قرار دیا۔

مئی 1926ء کو اینگلو۔ سوات تعلقات میں ایک اہم سنگ میل گردانا جاسکتا ہے جب برطانوی حکومت نے ریاست سوات اور میاں گل عبدالودود کو وہاں کا باقاعدہ حکمران تسلیم کرلیا۔ 3 مئی 1926ء کو کرنل کیمن، چیف کمشنر، شمال مغربی سرحدی صوبہ، جنرل آفیسر کمانڈنگ، ضلع پشاور، اور دیگر دس افسروں کے ہم راہ سیدوشریف آئے جہاں

ایک دربار کا انعقاد ہوا جس میں عبدالودود کو رسمی طور پر والئی سوات تسلیم کر لیا گیا۔ انعقاد دربار کے دوران ہی سوات بالا پر پرواز کرتے ہوئے پانچ جہازوں سے اُسے مبارکباد کے پیغامات گرائے گئے۔

''برطانوی ہند کی حکومت اور والی (عبدالودود) کے درمیان ایک باقاعدہ معاہدہ طے پایا جس کی رو سے مبلغ دس ہزار روپے سالانہ کی امدادی رقم کے عوض والی نے برطانوی حکومت کا وفادار رہنے، اپنی رعایا کو برطانوی علاقوں پر حملہ نہ کرنے، انگریز علاقوں سے آئے ہوئے مجرموں کو پناہ نہ دینے، ہزارہ کی سرحد پر آباد قبائل کے معاملات میں دخل نہ دینے اور سوات کے جنگلات کے لئے انگریز حکومت کے لئے قابل قبول انتظامات کرنے پر رضامندی ظاہر کی۔''

انتظامی رپورٹ اس ضمن میں رقم طراز ہے کہ اس معاہدہ پر عمل درآمد کے سلسلہ میں والئی سوات کا رویہ انتہائی اطمینان بخش رہا اور معاہدہ کی شرائط پر پوری طرح سے عمل پیرا ہونے کے لئے اُس نے بے حد معقولیت پسندی کا مظاہرہ کیا۔

31 اگست 1926ء کو والی نے پولیٹیکل ایجنٹ سے جا کر ملاقات کی اور کانڑا غوربند کے شمال میں آباد کوہستانیوں کے خلاف اپنی تعزیری مہمات کی وضاحت پیش کی۔ اُسے متنبہ کیا گیا کہ وہ اپنی اس قسم کی کارروائی کو نہایت ضروری تعزیری مہموں تک محدود کر دے۔ 15 اکتوبر 1926ء کو ایک بار اور اُس نے بذات خود پولیٹیکل ایجنٹ کو اباسین کوہستان کے حالات سے آگاہ کیا۔ وائسرائے لارڈ اِروِن نے اپنی بیگم کے ہمراہ 27 اکتوبر 1926ء کو ملاکنڈ کا دورہ کیا جہاں اُس کی سوات کے حکمران سے ملاقات ہوئی۔ 6 فروری 1927ء کو شمال مغربی سرحدی صوبہ کے چیف کمشنر نے عبدالودود کے مہمان کی حیثیت سے سوات بالا کا دورہ کیا۔

فروری 1927ء کو بونیر اور سُدم کے درمیان کے انتظامی سرحد کا باجا سے امیلہ کنڈؤ تک کا تعین کیا گیا۔ اس میں سوات کی طرف سے وزیر جب کہ انگریز حکومت کی طرف سے اسسٹنٹ کمشنر مردان کے علاوہ سلارزئی اور نوریزئی کے قبائلی جرگوں نے بھی حصہ لیا۔ اس میں عبدالودود کو بونیر کے کچھ حصہ (ملندرئی علاقہ) سے اپنی مرضی کے خلاف دست بردار ہونا پڑا۔ سرحدی علاقہ میں حدِ فاصل کو ہموار رکھنے کے لئے ایسا لازم تھا۔

14 نومبر 1927ء کو عبدالودود ملاکنڈ گئے اور 15 اور 16 نومبر کو پولیٹیکل ایجنٹ سے ملاقات کی۔ سوات میں جنگلات کے انتظامات کے بارے میں بات کی اور کچھ بندوقیں خریدنے کی اجازت کی اپنی درخواست کو دھرایا۔ اپنی رعایا کو غیر مسلح کرنے کی اپنی مہم کے خلاف بغاوت کی صورت میں انگریز حکومت کی تائید وحمایت کی یقین دھانی چاہی۔ گفت گو کا ایک اور موضوع، جسے اٹڈین اسسٹنٹ کو ان کے سوات رخصت ہونے کے بعد ان کی جانب سے زیر بحث لانا تھا، والی کی جگہ باچا یا بادشاہ کہلوانے کا اُس کے دیرینہ مطالبہ کو منوانا تھا۔ لگتا ہے کہ اس دورہ کا اصل مقصد یہی تھا۔

1927ء کے ماہ دسمبر کے دوران بٹ خیلہ کے قاضی عرفان الدین کو گاڑی میں جاتے ہوئے سوات کے علاقہ میں قتل کر دیا گیا اور قاتل بھاگ کر برطانوی زیر انتظام علاقہ میں چلا گیا۔ عبدالودود نے پولیٹیکل ایجنٹ کو ملزم قاتل کی حوالگی کے لئے کہا تا کہ اُس پر مقدمہ چلایا جاسکے۔ اُس نے اپنی تحریر میں کہا کہ 'مرحوم تمہاری رعایا میں سے تھا اور بہ وقت قتل وہ میرا مہمان تھا۔ اگر قاتل اس طرح فرار ہوکر آزاد گھومتا پھرے تو مجھے اس کا بہت افسوس ہوگا۔' پولیٹیکل ایجنٹ نے قاتل کی گرفتاری اور مقدمہ چلانے کے لئے مختلف اقدامات اور طریقے انگریز حکومت کو پیش کئے اور یہ بھی بتایا کہ سواتی حکمران 'اپنی سڑک پر اس جرم کے ارتکاب پر انتہائی برہم ہے (چوں کہ مقتول اُس کے زیر حفاظت محوسفر تھا)' لیکن اُس نے بہرحال مجرم کی والئی سوات کو حوالہ کردینے کی سفارش نہیں کی ایک اس لئے' تا کہ اس طرح ایک غلط مثال قائم نہ ہوجائے' اور دوسری بات یہ کہ' آج تک والئی سوات نے بھی برطانوی علاقوں سے فرار ہونے والوں کو پکڑ کر حوالہ کرنے کی کبھی کوئی کامیاب کوشش نہیں کی تھی'۔

میاں گل عبدالودود نے ہر موقع پر برطانوی حکومت سے تعاون پر آمادگی کے اظہار کو کبھی چھپایا نہیں۔ 1930ء میں پشاور میں ہونے والی گڑبڑ کی اطلاع ملتے ہی اُس نے فوراً برطانوی ہند کی حکومت سے رابطہ کر کے مدد کی پیش کش کی اور اپنے علاقے میں اس قسم کے واقعات کی روک تھام کے لئے ضروری اقدامات کئے۔ اُس وقت کی سیاسی ڈائری میں اس بات کی طرف اشارہ کرکے کہا گیا ہے' شکر ہے کہ والئی سوات کے مناسب اقدامات کی وجہ سے بونیر، چملہ اور خدوخیل کا علاقہ ابھی تک کسی قسم کے سیاسی احتجاج سے محفوظ رہا ہے۔' 1930ء کی ایک اور سرکاری رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ عبدالودود نے برطانوی مفادات سے اپنی مکمل وفاداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے علاقہ میں احتجاج کی کوشش کرنے والوں کو سختی سے دبا دیا ہے۔

1931ء کے اگست اور ستمبر کے مہینوں میں گدون اور خدوخیل قبائل کے بارے میں یہ شک پیدا ہوا کہ وہ سرخ پوش تحریک میں حصہ لے رہے ہیں بلکہ ان کے بہت سے افراد کے بارے میں کہا گیا کہ وہ اس تحریک کے اجلاسوں میں شریک ہوتے ہیں۔ عبدالودود نے ان کو انگریز حکومت مخالف سرگرمیوں میں حصہ لینے سے روکنے کے لئے سخت اقدامات کئے اور تحریک کے ہمدردوں اور اس میں حصہ لینے والوں کے ساتھ انتہائی سخت رویہ اپنایا۔ طوطالئی (ریاست سوات) کے ایک رہائشی حضرت اللہ کو جسے زردالله خان کے نام سے بھی پہچانا جاتا ہے، صوابی میں تحریک کے اجلاس میں شرکت کرنے کے الزام میں گرفتار کیا گیا۔ اُس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اُس کے جسم کے ساتھ پتھر باندھ کر اُسے دنڈئ کے مقام پر دریائے سندھ میں پھینک دیا گیا۔ اُس کی لاش پھر کبھی نہ مل سکی۔

اسی طرح چکیسر کے چھوٹے سے گاؤں کے ایک مذہبی شخص سُنڈ بابا کو پہلے قید میں ڈالا گیا اور پھر اُسے 1931ء میں ایک خشک کنوئیں میں پھینک دیا گیا۔ اُس پر عبدالودود کے خلاف سازش کا الزام لگا گیا۔ ذبلیو آر ہے

(W.R.Hay) پولیٹیکل ایجنٹ، اس متوقعہ بغاوت کو سرخ پوش تحریک سے جوڑ کر عبدالودود کے اقدامات کو لاشعوری طور پر انگریز حکومت کے سرخ پوش تحریک کے خلاف مہم سے مربوط قرار دیتا ہے۔ میاں گل جہان زیب بہر حال پولیٹیکل ایجنٹ ہے (Hay) کی اس بات سے اتفاق نہیں کرتے۔

ایک انتہائی شائستہ، مقبول اور سوات کے سب سے تعلیم یافتہ اشخاص میں سے ایک، ریفول استاد کو غالباً 1932ء میں نواب دیر سے خفیہ رابطوں کے جھوٹے الزامات لگا کر گولی ماردی گئی۔ دراصل اُس کی دُکان میں سُرخ پوشوں کا شائع کردہ رسالہ ''پختون'' ملا تھا۔ اُس کی لاش کو سیدو۔ بیگورہ روڈ پر تین دن کے لئے لٹکایا گیا۔

برطانوی حکومت کی طرف سے ریاست سوات کو باضابطہ تسلیم کئے جانے کے بعد پولیٹیکل ایجنٹ اور میاں گل عبدالودود نے باہمی ملاقاتوں کا تواتر سے ایک سلسلہ شروع کیا۔ یہ تعلقات دوستانہ سے کہیں بڑھ کر تھے۔ پشاور میں تعینات چیف کمشنرا گورنر نے بھی کئی مواقع پر ریاست کا دورہ کیا۔ اسی طرح عبدالودود بھی کئی بار پشاور گئے۔ اکتوبر 1929ء میں وائسرائے ہند لارڈ گوشین نے دیر، سوات اور چترال ایجنسی کے دورہ کے موقع پر عبدالودود سے ملاقات کی جب کہ 14 اپریل 1930ء کو وائسرائے اور گورنر جنرل لارڈ ارون نے سیدو شریف میں ایک رسمی دربار کے موقع پر آپ کو سر کے خطاب سے نوازا۔ یہ خطاب انہیں جنوری 1930ء میں برطانوی بادشاہ کی جانب سے عطاء ہوا تھا۔

عبدالودود نے انگریز حکومت کو مشترکہ باہمی مفاد کو بنیاد بنا کر قائل کیا کہ اس طرح انگریز سلطنت کی ریاست سوات سے لگنے والی سرحدیں محفوظ ہوں گی۔ جواباً ان کی طرف سے ریاستی معاملات میں مداخلت نہیں ہوگی۔ 'یہاں کے صوبائی گورنر نے 1933ء میں اپنے مقاصد کی روشنی میں ریاست سوات کی اہمیت کے بارے میں اپنے موقف کی یوں وضاحت کی کہ 'دیر اور سوات میں حکومت کی موجودہ صورت حال کا برقرار رہنا ہمارے لئے اتنا اہم ہے کہ میرے خیال میں ہمارے لئے اس حقیقت کو سمجھنا لازم ہے اور مزید یہ کہ ہم کس حد تک اس کو جوں کا توں رکھنے پر مجبور ہیں۔'

عبدالودود جب بطور حکمران سامنے آیا تو اُسے برطانوی حکومت کی باقاعدہ سرپرستی حاصل تھی۔ اس کے اقتدار کے حصول کے معاملہ کے فوائد و نقصانات کی مکمل جانچ پڑتال صوبائی چیف کمشنر نے کی تھی۔ یوں بھی وہ 1897ء کے بعد سے برطانوی مفادات کے لئے کام کرتا رہا تھا۔ اُس کی وجہ یہ تھی کہ 'فریقین کا باہمی مفاد اس بات سے وابستہ تھا... کہ عوامی تحریک اور... انقلابی کٹر عوامی رہنما ہاتھ سے نہ نکل جائیں۔' اس کے باوجود برطانوی حکام اُسے تسلیم کرنے میں تاخیر کرتے رہے۔ جب 3 مئی 1926ء میں اُسے بطور والی تسلیم کیا گیا تو خاصی دیر ہوگئی تھی اور یہ خطاب اُس کی پسند اور خواہش کے مطابق بھی نہیں تھا۔ وہ تو خود کو باچا کہلوانا چاہتا تھا۔

عبدالودود سے برطانوی حکومت کے اس برتاؤ کے کئی مقاصد تھے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ اُس سے مزید وفاداری

کے خواہاں تھے تاکہ اُس پر ان کے اعتماد کا واضح جواز موجود ہو۔ جندول کے عمرا خان کی مثال ان کے سامنے تھی۔ پھر اُسے یہ بھی ثابت کرنا تھا کہ وہ اقتدار پر اپنی گرفت مضبوط رکھ سکتا ہے، ریاست میں استحکام لاسکتا ہے اور برطانیہ مخالف عناصر جیسے کہ سنڈاکئی بابا سے نمٹنے کی واقعتاً خواہش رکھتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اُسے یہ بھی دکھانا تھا کہ بالشویکوں سے اُسے کوئی ہمدردی نہیں ہے اور یہ کہ وہ اُن سے سختی کے ساتھ نمٹ سکتا ہے۔ اس لئے کہ 1917ء کے بالشویک انقلاب کے بعد روس کے زاروں کی پرانی توسیع پسندانہ پالیسی میں نظریاتی مصالحہ لگنے سے مزید تیزی آگئی تھی۔ سوات تزویراتی لحاظ سے اُس اہم ترین فوجی ہلال میں واقع تھا جو کہ صوبہ سرحد کے قبائلی علاقہ، ترکی، ایران اور افغانستان پر مشتمل تھا اور جس سے روس گھرا ہوا تھا۔ علاوہ ازیں برطانوی حکومت اپنے کچھ خاص مقاصد کے تحت سوات کو اپنے زیر نگیں لانے کا بھی ایک خیال رکھتی تھی۔ اس بات کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے خفیہ طور پر یہاں سے حاصل ہونے والی آمدنی کا تخمینہ لگایا تھا جو یہاں قبضہ کی صورت میں انہیں حاصل ہوتا۔

مزید برآں عبدالودود کے ایک قریبی ساتھی مولوی عبدالعزیز پر (جس نے اُسے سوات کا حکمران بنانے میں ایک کردار ادا کیا تھا اور جو سیدو شریف میں رہائش پذیر تھا) برطانیہ مخالف شورش برپا کرنے اور ایک نئی جماعت جمعیت عسکریہ ہند بنانے کا الزام تھا جس کا مقصد یہاں ایک بالشویک مرکز قائم کر کے قریبی برطانوی علاقوں میں بلا روک ٹوک پروپیگنڈا کرنا تھا۔ برطانوی حکام کو یہ بھی شک تھا کہ عبدالودود کے باجوڑ کے ملاؤں سے رابطے ہیں اور انگریز مخالف حاجی صاحب آف ترنگزئی اور مولوی عبدالعزیز سے بھی اس نے ساز باز کر رکھی ہے۔ انہیں شک تھا کہ وہ امیر افغانستان کی جانب سے باجوڑ سے الائی تک کے علاقہ کا گورنر بننے کا خواہش مند ہے جہاں بالشویک نظریات کی پرچار کے لئے اسکول قائم کرسکے۔

اسی وجہ سے ریاست کا باقاعدہ حکمران تسلیم کرنے کے معاملہ کو اُس وقت تک خطۂ التوا میں رکھا گیا جب تک مولوی عبدالعزیز کا انتقال نہ ہوگیا، عبدالودود نے سنڈاکئی بابا سے مکمل ناطہ نہ توڑلیا، اپنی حیثیت پوری طرح مستحکم نہ کرلی اور مختلف مواقع پر انگریزوں سے اپنی وفاداری کو ہر قسم کے شک وشبہ سے بالاتر نہ ثابت کرلیا۔ اس لئے جب صوبائی گورنر رالف گرفتھ نے اُس سے پوچھا کہ آپ اپنی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ کس بات کو سمجھتے ہیں؟ تو بغیر کسی ہچکچاہٹ کے عبدالودود نے جواب دیا کہ انگریز حکومت سے دوستانہ مراسم قائم کرنا میرا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔

انگریزوں کی پشت پناہی کا حصول اُس کی مجبوری تھی، انتخاب نہیں تھا۔ اُسے اپنے حریفوں کے مقابلہ میں اپنی پوزیشن مستحکم کرنی تھی جن میں غیر مذہبی اور مذہبی دونوں قسم کے لوگ شامل تھے۔ اسی طرح دیر اور امب کے جھگڑالو پڑوسیوں سے ہر وقت برسرِ پیکار ہونے کے خدشات تھے۔ اشیاء ضروریہ اور سامانِ حرب و ضرب کی فراہمی

محفوظ راہگذاری کی یقین دہانی کرائی۔

عبدالجبار شاہ کے عہد میں دیر اور سوات ریاستوں کے تعلقات کا جائزہ اس کتاب کے چوتھے باب میں لیا جا چکا ہے۔ دریا کے دائیں جانب کے علاقوں پر قبضہ کے لئے دونوں ریاستوں کے درمیان کش مکش کا آغاز فطری و یقینی تھا۔ نواب دیر کے خلاف اپنی پوزیشن مستحکم کرنے کے لئے عبدالودود نے نیک پی خیل میں گاڑو۔ ڈاگے اور بابوزئی میں چپی گرام کے مقام پر قلعے تعمیر کرائے۔ اس طرح دریا کے دونوں جانب حفاظتی تدابیر اختیار کی گئیں۔ اس اثنا میں عمرا خان آف جندول کے بیٹے عبدالمتین خان اور نواب دیر کے درمیان عداوت کی خبریں سوات پہنچیں۔ عبدالودود نے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کی ٹھانی اور اپنے سپہ سالار کے زیرکمان شموزئی کے محاذ پر لشکر بھیجا جس نے تیزی سے آگے بڑھ کر تیرنگ اور زرہ خیلہ کے قلعوں پر 10 ستمبر 1917ء کو قبضہ کرلیا۔ اسی ہفتہ بعد میں چکیسر کے قلعہ پر قبضہ کرکے دیر کی افواج کو شموزئی علاقہ سے نکال دیا گیا۔ وہ ادین زئی علاقہ میں راموڑہ تک پیچھے ہٹ گئیں۔

سواتی لشکر ادین زئی علاقہ میں پیش قدمی میں مصروف تھا کہ نواب کی جانب سے عبدالمتین خان کو شکست دینے کی خبر آئی جس پر سواتی لشکر نے کسی مناسب موقع کے انتظار میں پیش قدمی روک دی اور فریقین اتحادی محاذ بنانے کی تگ و دو میں لگ گئے۔ دیر کا ایک جرگہ نواب دیر اور خان آف خار کا اتحاد بنانے کے لئے خار گیا۔ دوسری جانب عبدالمتین خان نے عبدالودود کو یقین دلایا کہ باجوڑ کے ملا صاحب اُس کا ساتھ دیں گے۔ اس لئے وہ ادین زئی پر حملہ کردے اور وہ خود جندول پر حملہ کردے گا۔ نواب دیر نے عبدالمتین خان کے ساتھ معاہدہ کرکے اُسے سوات کے خلاف ملانے کی کوشش کی۔ ناکامی کی صورت میں وہ اُس پر حملہ آور ہوگیا۔

نواب کے باجوڑ میں مصروف ہونے کا فائدہ اٹھانے اور اس طرح اُس کے مخالف عبدالمتین خان کی مدد کی خاطر عبدالودود نے 24 مارچ کو دو ہزار افراد پر مشتمل فوج کی مدد سے ادین زئی علاقہ پر چڑھائی کردی اور پورے علاقہ کو تاراج کردیا۔ 28 مارچ کو اُس نے نواب کے شوا قلعہ پر حملہ کا قصد کیا لیکن در یں اثنا نواب کے لشکر سے اپنے پسپائی کے راستے کو خطرہ میں جان کر اُس نے اپنے بڑھتے قدم روک دیئے اور سیدو شریف لوٹ گیا۔ سوات کا ایک جرگہ دیر کے خطرہ سے نمٹنے کے لیے سنڈاکئی بابا کی مدد حاصل کرنے اُس کے پاس گیا۔ وہ شامیزئی علاقہ میں آیا اور اُس کی کوششوں سے سوات کے سب مختلف الخیال گروہ نواب دیر کے خلاف متحد ہوگئے۔ یوں عبدالودود اور سنڈاکئی بابا میں بھی مفاہمت ہوگئی۔ عبدالمتین خان نے بعد از عید جنگ چھیڑنے کے بارے میں اطلاع دی۔

نواب نے عبدالمتین سے نمٹنے کے لیے پیشگی اقدامات کئے بلکہ وہ سوات کے خلاف ایک اتحاد بنانے میں کامیاب ہوگیا۔ سوات کے کچھ خوانین بھی اُس کے ساتھ مل گئے۔ نواب اور عبدالودود دونوں نے اپنے اپنے لشکر اکٹھے کئے۔ نواب کی فوج پوری طاقت سے سامنے آئی۔ خار، جندول، سیند، میدان، براول، سلارزئی، اور ماموند لشکر بھی اس

کے ساتھ مل گئے۔

11 اگست 1918ء کو دیر کا لشکر شموزئی کی طرف بڑھا۔ اس نے اُس چھوٹے قلعہ پر قبضہ کرلیا جس کی حفاظت پر چار باغ کے نظر خان کی قیادت میں 26 افراد متعین تھے۔ وہ بے جگری سے لڑے اور سب کے سب مارے گئے۔ اس کے بعد انہوں نے گڑھی۔ خزانہ کے قلعہ پر حملہ کیا جہاں میاں گل شیرین جان، شاہ مدار میاں، االے میاں، عبدالرحیم خان آف پارڑی 80 افراد کی نفری کے ساتھ موجود تھے۔ لڑ کر قلعہ کے دروازے تک پہنچنے کے بعد دیری فوج نے اسے آگ لگادی۔ جب دروازے کھلے، سب لوگ باہر آئے۔ میاں گل شیرین جان کو پیچھے سے گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ دیگر قائدین بھی مارے گئے۔ دیر کی فوج کے دو سو افراد زخمی یا مارے گئے جب کہ سوات کے سو افراد کام آئے۔ میاں گل شیرین جان کی موت کی خبر ہر طرف دُکھ کا باعث بنی۔

میاں گل شیرین جان کی موت سے طیش میں آ کر باجوڑ کے ملاؤں نے بابڑہ ملا کی قیادت میں انتقام کا نعرہ لگایا۔ باجوڑ سے خطرہ محسوس کرتے ہوئے خار، جندول اور میدان کے لشکر سوات سے چلے گئے۔ سیند اور براول کے لشکر شموزئی سے پیچھے ہٹ کر ادین زئی میں اوچ چلے گئے جب کہ سوات کے لشکر بھی منتشر ہو گئے۔ نواب کی فوج باجوڑ کے ملاؤں سے نمٹنے جندول چلی گئی جہاں انہوں نے خان آف خار کے خلاف شدید جنگ شروع کر دی تھی۔

اگر چہ ملاؤں کو جانی نقصان اٹھانا پڑا لیکن اُن کا عزم مصمم تھا۔ حاجی صاحب آف ترنگزئی نے بھی گندب کا دورہ کیا اور میاں گل شیرین جان کے خون میں آلودہ کپڑے دکھائے۔ مہمند اور حلیم زئی قبائل نے بھی خان آف خار کے خلاف لڑنے کا فیصلہ کیا۔ اُس نے اس دوران بابڑہ ملا کے پاس اپنی ماں وبہن اور کچھ کے مطابق اپنی بیوی کو بھی میاں گان کے ایک بڑے وفد کے ساتھ بھیجا۔ اُس نے اس وفد سے ملاقات کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ خان کے خلاف ماموند قبائل کا لشکر تشکیل دینے کی سعی کرتا رہا جب کہ حاجی صاحب ترنگزئی نے مہمند قبائل کو اکٹھا کرنے کی کوشش کی لیکن یہ تحریک ناکام رہی۔

سوات میں عبدالودود نے شموزئی علاقہ کا قبضہ ختم کرانے کے لئے سواتی لشکروں کو اکٹھا کرنے کی کوشش کی لیکن سوات میں مطلوبہ جوش وخروش کی کمی تھی۔ سنڈاکئی بابا نے غضب ناک ہو کر دھمکی دی کہ اگر لوگ میاں گل شیرین جان کا انتقام لینے کے لئے باہر نہ نکلے تو وہ ان سے ناطہ توڑ کر باجوڑ چلے جائیں گے۔ کچھ تھوڑے بہت لوگ نکلے۔ شموزئی پہنچ کر وہ نواب کے آدمیوں کو وہاں سے نکال باہر کرنا چاہتے تھے کہ باجوڑ میں ملاؤں کی فوج کے تتر بتر ہونے کی خبر آئی۔ یہ سن کر یہ لوگ بھی واپس گھروں کو لوٹ آئے۔

سوات کے حکمران کا گھیراؤ کرنے کے لئے نواب دیر نے سوات کے سابق حکمران عبدالجبار شاہ کے ساتھ ساز باز شروع کی لیکن اُس کے مطالبات نواب کی مجوزہ رعایات سے کہیں زیادہ تھے، اس لئے یہ بیل منڈھے نہ چڑھ

سکی۔نواب اور باچا دونوں ہی اپنے خوانین اور ملاؤں سے نئے اتحاد پروان چڑھانے کے لئے کوشاں رہے تاکہ آنے والے مڈبھیڑوں کے لئے ان کی پوزیشن مضبوط ہو سکے۔

3 اپریل 1919ء کو نواب نے سوات پر حملہ کے لئے اپنی افواج کو پیش قدمی کا حکم دیا۔اس حملہ کی پیش بندی کے لئے سواتیوں نے پہلے ہی نہاگ درہ کی راہ میں واقع گاؤں شور پر قبضہ کرلیا جو کہ اب منڈہ تحصیل کا حصہ ہے۔22 اپریل کو نواب کالشکر سربالا کے راستے صدبر خان کی قیادت میں تو تانو بانڈئی پر حملہ آور ہوا۔سواتی لشکر نے حملہ آوروں کو پیچھے دھکیل دیا۔نیک پی خیل کے لئے سیبوجنی علاقہ سے پہنچنے والی تازہ دم کمک نے سواتیوں کی پوزیشن مزید مستحکم کردی۔اسی اثنا میں جب نیک پی خیل میں نواب کے لشکروں کو شدید مزاحمت کر کے پسپا ہونے پر مجبور کیا جارہا تھا عبدالودود 'خود نواب کے ساتھ دجل وفریب میں مصروف تھا'

حالاں کہ نواب کے لشکر نیک پی خیل میں شکست سے دوچار تھے لیکن وہ تالاش میں پندرہ سو کی نفری کے ساتھ موجود تھا۔جب کہ بارہ سو افراد پر مشتمل اُس کا ایک اور دستہ ادین زئی علاقہ میں موجود تھا۔سواتی افواج بھی غوربند اور کانڑا سے تازہ دم کمک کے ساتھ صف آرا تھیں۔اس سے 'سواتیوں کے عزم اور سخت رویہ میں مزید شدت پیدا ہوئی۔حتیٰ کہ عبدالودود نے جو کہ نواب کے ساتھ کسی معاہدہ پر خاصا مائل تھا، اُسے کہلا بھیجا کہ وہ سواتیوں کے عزمِ مصمم کو آزمانے کی جرأت نہ کرے۔'نواب نے اس دوران حال ہی میں سواتیوں سے چھینے گئے شموزئی علاقہ پر اپنا قبضہ برقرار رکھا۔

اگست 1919ء میں دیر کی افواج نہاگ درہ کے راستے وادیٔ سوات میں ایک بار پھر داخل ہوئیں۔اس وقت سوات میں موجود نواب کے ڈلہ (دھڑا) کے لوگ بھی ان کے ہم راہ تھے۔کئی گاؤں اُن کے قبضہ میں چلے گئے۔وہ سوات بالامٹہ کے علاقہ میں تو تکئے تک پہنچ گئے۔اس دوران باچا کی باجوڑ پالیسی کامیاب ہوئی جس کے نتیجہ میں عبدالمتین خان نے جندول پر حملہ کرکے باڑوہ (موجودہ ثمرباغ) پر قبضہ کرلیا اور نواب کو اپنی افواج سوات سے واپس بلانا پڑیں۔سوات بالا میں موجود اُس کی افواج کو حکم ہوا کہ:

> ''وہ 18/17 اگست کی درمیانی شب آدھی رات کے وقت واپسی شروع کریں۔سواتیوں کو اس بات کی سن گن ہوگئی اور انہوں نے پسپا ہوتی فوج کے راستے میں جگہ جگہ واپس اپنی پوزیشنیں سنبھال لیں۔نواب کی افواج کو ایسی زک اٹھانی پڑی جس کی مثال قبائلی جنگوں میں ملنی مشکل ہے۔پانچ سو سے ایک ہزار تک افراد مارے گئے۔آٹھ سو بندوقیں اور دو سو پچاس گھوڑے بھی چھن گئے۔''

باچا صاحب نے اس واقعہ کو یوں بیان کیا کہ:

> ''نواب ہمارے ہاتھوں سے بال بال بچ کر بھاگنے میں کامیاب ہوا لیکن بہت ہی بری حالت میں۔سواتیوں نے دشمنوں کا ہر جگہ پیچھا کیا۔سارے چھینے گئے علاقے واپس لے لئے۔ہم نے شموزئی اور ادین زئی پر قبضہ کرلیا اور مزید آگے بڑھنے کی

تیاری کر رہے تھے کہ نواب کے ہاتھوں باجوڑ میں عبدالمتین خان کی شکست کی خبر آئی۔ ہم نے اپنی پیش قدمی روک دی اور اپنی موجودہ کامرانیوں پر مطمئن ہو گئے۔"

مکمل شکست کے باوجود نواب دیر سواتی حکمران کو ادین زئی پر آسانی سے قابض ہونے کی اجازت دینے کے لئے تیار نہیں تھا۔ اکتوبر 1920ء میں سواتیوں نے محسوس کیا کہ نواب ادین زئی پر حملہ کی تیاری کر رہا ہے۔ انہوں نے اپنی دفاعی پوزیشن کو مزید مستحکم کیا۔ باچا کا ایک آلہ کار باجوڑ میں موجود تھا تاکہ نواب کے حملہ کی صورت میں خان آف خار، ملاؤں اور حاجی صاحب آف ترنگزئی کی مدد اسے حاصل ہو سکے۔ نومبر 1920ء میں دیر کی فوج نے اپنے اتحادیوں کے ساتھ اوچ کے مقام پر پوزیشن سنبھال لی۔ 21 نومبر سے اکا دکا حملے شروع ہوئے۔ سنڈاکئی بابا نے جندول کا رخ پھیرنے کے لئے ایک تدبیر کی۔

"عالم زیب خان کی قیادت میں جندول دستہ نے بہادری سے پیش قدمی کر کے مخالفین کے قدم اکھاڑ دئے لیکن دیر کی بقیہ فوج کو سواتیوں نے تتر بتر کر ڈالا۔ اور وہ انتہائی بدنظمی کے عالم میں تالاش لوٹ گئی۔"

نواب نے ایک بار پھر عبدالجبار شاہ کو دریائے سوات کا پورا بایاں کنارہ دینے کی شرط پر اتحاد کے لئے آمادہ کرنے کی ساز باز کی جو کہ اُس کا دیرینہ مطالبہ تھا۔ عبدالجبار شاہ نے چکیسر کی طرف سے پیش قدمی کی کوشش کی لیکن اس دوران نواب بیماری کی وجہ سے اپنی فوج کو حرکت میں نہ لا سکا۔ باچا صاحب نے آسانی سے اس کوشش کو ناکام بنا دیا۔ جولائی 1921ء میں نواب نے سلطنت خان آف جورہ (جو بعد میں خان بہادر کہلایا) کو دو سو افراد کے ہمراہ ایک ہراول دستہ کی شکل میں نیک پی خیل پر دھاوا بول کر اس پر قبضہ کے لئے بھیجا۔ سلطنت خان نے اپنی وفاداری بدلتے ہوئے باچا کے ساتھ مفاہمت کر لی اور دیر سے ساتھ آئے ہوئے نواب کے آدمیوں کو واپس اپنے گھروں کو بھیج دیا۔ لیکن

"جہاں لشکر نامراد رہے وہاں سازشوں کو کامیابی نصیب ہوئی۔ اس دوران میاں گل (عبدالودود) کے خلاف سوات کے اکثر علاقوں میں کھچڑی پک رہی تھی۔ کئی قبائلی عمائدین علاقہ چھوڑ کر نواب کے ساتھ ساز باز میں مصروف تھے۔ ستمبر (1921ء) میں ادین زئی علاقہ نے میاں گل سے آزادی کا اعلان کر دیا۔ نواب نے دوبارہ اپنی افواج کو کوچ کر دیا۔"

اندرونی عداوت اور عدم اطمینان کی وجہ سے باچا صاحب کی پوزیشن اس وقت خاصی کمزور تھی۔ لشکر کی چوکسی کے لیے اُس کے احکامات نظر انداز کئے جا رہے تھے۔

دسمبر 1921ء میں جانبین ادین زئی کے مقام پر مورچہ بند ہو کر ایک دوسرے کے آمنے سامنے آگئے۔ اپریل 1922ء میں تین ماہ کے لئے عارضی جنگ بندی ہوئی لیکن سازشوں کا سلسلہ جاری رہا۔ بونیر اور سوات کوہستان میں ہونے والی شورش کی وجہ سے باچا صاحب کی پوزیشن خاصی کمزور تھی لیکن اُس نے اپنی حکمت عملی کی بدولت اس سب پر قابو پالیا اور کامیاب رہا۔ اس دوران برطانوی حکومت نے فیصلہ کیا کہ چترال سڑک کے علاقہ میں

اس جنگی صورتِ حال کی اجازت نہیں دی جاسکتی اس لئے 20 جون 1922ء کو پولیٹیکل ایجنٹ ملاکنڈ نے نواب دیر اور باچا صاحب کو لکھا کہ

''ادین زئی میں سوات اور دیر کی افواج کے درمیان یہ مناقشہ برطانوی مفادات اور چترال سڑک پر امن وامان کی صورتِ حال کے لئے خطرہ ہے اس وجہ سے حکومت کا فیصلہ ہے کہ اسے فی الفور ختم کیا جائے۔ چیف کمشنر کی جانب سے مجھے دونوں فریقوں کو مندرجہ ذیل ہدایات جاری کرنے کے لئے کہا گیا ہے۔''

فریقین اپنے مفتوحہ علاقے چھوڑنے کے لئے تیار نہیں تھے لیکن انہیں اس فرمان کو تسلیم کرنا پڑا جسے ادین زئی معاہدہ کہا جاتا ہے۔ باچا صاحب کو 15 جولائی سے پہلے ادین زئی سے انخلا کے لئے کہا گیا جب کہ نواب کو بھی ضابطوں کے تحت پابند کیا گیا۔ اس معاہدہ کی شق 1، 4 اور 5 میں کہا گیا ہے۔

''1. فریقین 15 جولائی سے قبل اپنی افواج اس علاقہ سے ہٹالیں اور آئندہ ان میں سے کوئی بھی اس علاقہ کی طرف اپنی فوج نہ بھیجے۔

4. نواب مستقبل میں دریائے سوات کے دائیں اور مغربی جانب کے قبائل، شامیزئی، ننگی خیل، سیبوجنی اور شموزئی قبائل کے خلاف اُس وقت تک کوئی فوج کشی نہ کرے جب تک ان قبائل کی اکثریت اُس کی حکومت قبول کرنے کیلئے ازخود تیار نہ ہو۔

5. اگر ایسا ہو جائے تب بھی وہ کوئی لشکر بھیجنے سے قبل ملاکنڈ کے پولیٹیکل ایجنٹ سے پیشگی تحریری اجازت حاصل کرے۔''

اس معاہدہ کے ذریعہ سوات اور دیر کے درمیان جنگوں کا لامتناہی سلسلہ ختم ہو گیا۔ اس کے بعد چھوٹی موٹی سرحدی جھڑپوں کے علاوہ کوئی باقاعدہ جنگ نہیں ہوئی تاہم اس سے مکمل ہم آہنگی کی فضا قائم نہ ہو سکی۔ اس کی شق چار نے مستقبل میں نواب کی جانب سے سازشوں کا دروازہ کھلا رکھا۔ آنے والے ہر نواب دیر نے ان قبائل کی حمایت حاصل کرنے کے لئے اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ دیر، سوات دشمن سازشوں کا مرکز بنا رہا اور باچا صاحب کے مخالفین کے لئے ایک محفوظ پناہ گاہ کے طور پر استعمال ہوتا رہا۔ اس کے جواب میں باچا صاحب نے بھی باجوڑ اور دیر میں نواب کے مخالفین سے ساز باز کا سلسلہ جاری رکھا۔

شروع میں جب سوات کی فوجیں بونیر کی جانب بڑھیں تو نواب دیر نے سوات مخالف اتحاد کی امید پر عبدالجبار شاہ سے خط و کتابت کی۔ تاہم پولیٹیکل ایجنٹ کی جانب سے خط کے جواب میں نواب نے اُسے یقین دہانی کرائی کہ 'وہ ادین زئی معاہدہ پر مکمل عمل درآمد کرتے ہوئے میاں گل کے خلاف کسی قسم کا کوئی لشکر نہیں بھیجے گا' اس لئے عبدالجبار شاہ اور نواب امب کی طرف سے مسلسل لشکر کشی کے لئے ترغیب اور اپنے بہت سے مشیروں کی جانب سے ادینزئی معاہدہ سے علیحدہ ہو جانے کے دباؤ کو اُس نے نظر انداز کیا۔ صرف لشکر بھیجنے کے جھوٹے وعدوں پر انہیں ٹرخاتا

رہا اور نواب امب کوڈ ٹے رہنے کی تاکید کرتا رہا۔

جب فروری 1924ء میں باچا اپنے وزیر کے ہمراہ پشاور گیا تو نواب نے معاملات کی سن گن لینے کے لئے اوینزئی کے تحصیل دار کو اُن کے پیچھے بھیجا۔ سوات اور بونیر کا جب انگریزوں کی مدد سے باچا نے ہوائی جائزہ لیا اس پر نواب دیر کے دل میں حسد کی آگ بھڑک اٹھی اور نواب نے اپنے تحصیل دار کو بھیج کر اس معاملہ کی ساری تفصیلات معلوم کیں۔

1925ء میں نواب اورنگ زیب خان (جسے بالعموم بادشاہ خان کے لقب سے جانا جاتا تھا) کی موت کے بعد اُس کا بیٹا شاہ جہان خان تخت نشین ہوا۔ باچا نے اُس کے بھائی عالم زیب خان کی امداد وحمایت کی کوشش کی تو برطانوی حکومت نے اُسے ایسا کرنے سے روک دیا۔ جب عالم زیب خان پر عبدالمتین خان نے حملہ کر دیا تو باچا نے فوراً اُس کی مدد کے لئے پولیٹیکل ایجنٹ سے درخواست کی۔ اُس کی ساری فکر مندی کے باوجود اُسے ریاست دیر میں ہونے والی کسی لڑائی میں حصہ لینے سے منع کر دیا گیا۔

عبدالودود اداین زئی معاہدے کی سیاسی شقوں سے خوش نہیں تھا، اس لئے اُس نے اس میں کچھ ترامیم تجویز کیں۔ اُسے ملاکنڈ بلایا گیا تا کہ وہ اس ضمن میں نئے نواب دیر کے ساتھ مذاکرات کر سکے۔ کچھ پیچیدہ مسائل فیصلہ طلب تھے۔ عداوت ودشمنی کے عملی اقدامات سے دست کشی کی صورت میں دونوں ریاستوں کے درمیان ایک دوستانہ معاہدہ طے پاسکتا تھا۔ 14 مارچ 1925ء کو دونوں ریاستوں کے نمائندے ایک دوسرے سے ملے۔ امید کی جارہی تھی کہ دونوں حکمران اداین زئی معاملہ کے علاوہ اپنے دیگر سارے جھگڑوں کو نمٹا کر ایک تسلی بخش معاہدہ کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے اور اس طرح باہمی تناؤ کا خاتمہ ہو جائے گا لیکن تناؤ کی کیفیت برقرار رہی۔ اس لئے اکتوبر 1925ء میں باچا نے' نیک پی خیل میں اپنے تحصیل دار کو سختی سے اس امر کا پابند کیا کہ وہ دیر جانے والے سب راستوں کی کڑی نگرانی رکھے تا کہ سوات کا کوئی باشندہ نواب دیر سے کسی قسم کی کوئی سلسلہ جنبانی نہ کر سکے۔

سنڈاکئی بابا (جسے عبدالودود نے سوات سے چال بازی سے نکال دیا تھا) نواب دیر کو سوات پر حملہ کے لئے مسلسل اکسا رہا تھا۔ نواب نے اپنے قبیلہ پائندہ خیل کو سوات پر کسی حملہ میں شرکت سے منع کر دیا تھا۔ نواب نہ تو خود اس معاملہ میں دل چسپی لے رہا تھا اور نہ ہی اپنی رعایا کو اس بات کی اجازت دینے کے لئے تیار تھا لیکن وہ سنڈاکئی بابا کو کوئی واضح جواب بھی نہیں دینا چاہتا تھا۔ وہ اُسے یوں ہی لٹکائے رکھنا چاہتا تھا اس لئے اُس کی موت تک مختلف عذر تراش کر اُسے مطمئن کرتا رہا۔ اُس کی سابقہ دیر مخالف سرگرمیوں کی یاد ابھی نواب کے ذہن سے محو نہیں ہوئی تھی۔ چوں کہ دیر میں اُس کی موجودگی سوات کے حکمران کو مسلسل مشتعل رکھنے کا باعث تھی، اس لئے نواب اُسے دیر سے نکالنے پر آمادہ نہیں تھا۔

جولائی 1927ء میں نواب نے پولیٹیکل ایجنٹ سے احتجاج کیا کہ والی (عبدالودود) نے نیک پی خیل علاقہ میں واقع قلاگے اور سربالا کے لوگوں سے عشر اکٹھا کیا ہے۔ جب کہ باچا نے شکایت کی کہ نواب کے افسران نے ادین زئی سے گزرتے ہوئے اُس نمک ٹھیکے دار کا نمک ضبط کرلیا ہے (جس کو ریاست میں نمک کی فراہمی کا عمل ٹھیکہ دیا گیا تھا) جو کہ دریائے سوات کے دائیں جانب کے علاقے کا قصد کئے ہوئے تھا۔ سیاسی حکام نے نواب پر واضح کردیا کہ قلاگے اُس کی حدود سے باہر ہے۔ پھر انہوں نے فریقین سے کہا کہ وہ اپنے نمائندے ملاکنڈ بھیج دیں تاکہ نمک اور سربالا میں سرحدوں کی صحیح حد بندی کے سلسلہ میں معاملات طے کئے جاسکیں۔ بالآخر سربالا کو سوات کے حوالہ کردیا گیا۔

1928ء میں باچا نے تحریری ضمانت دی کہ اُس کی ریاست میں سرحدوں کے قریب مقیم کوئی پناہ گزیں اگر علاقہ دیر میں جا کر کسی جرم کا مرتکب ہوا تو اُسے سرحد سے ہٹالیا جائے گا۔ اسی قسم کی تحریری ضمانت نواب دیر نے بھی دی۔ صورت حال نے اُس وقت ایک نازک موڑ لیا جب جندول میں عالم زیب خان کے ساتھ لڑائی شروع ہوئی۔ وہ نواب دیر کا بھائی اور باچا کا اتحادی تھا۔ باچا نے نیک پی خیل میں تو تانو بانڈئی کے مقام پر اپنی افواج جمع کیں۔ وہ مسلسل پولیٹیکل ایجنٹ سے عالم زیب خان کی مدد کی خاطر ادین زئی پر حملہ کی اجازت مانگتا رہا۔ پولیٹیکل ایجنٹ نے تو محدتک اس بات کی سفارش کی کہ باچا کو ایسا کرنے دیا جائے تاکہ نواب اپنے بھائی سے کئے گئے معاہدہ کی پاسداری پر مجبور ہوجائے، لیکن اعلیٰ برطانوی حکام نے اُسے ایسا کرنے کی اجازت نہیں دی۔ جب کہ اس دوران نواب نے سوات سے حملہ کے خدشہ کے پیش نظر ادین زئی میں اپنی پوزیشن مستحکم کرلی۔

13 ستمبر 1928ء کو میاں دم خان نے دارمئی خان کے بیٹوں اور تقریباً 500 افراد پر مشتمل حامیوں کے ایک بڑے گروہ کے ہمراہ ہم کوٹ کے مقام پر دیر کی سرحد عبور کی۔ ایسا انہوں نے باچا پر ایک ناکام شب خون مارنے کے بعد کیا۔ یہ نئی سڑک کی تعمیر کے موقع پر پیتئی (فتح پور) میں اُس کے مجوزہ دورہ کے موقع پر کیا گیا۔ 11 ستمبر 1928ء کو چک درہ کے مقام پر نواب دیر کی جانب سے کیا گیا یہ سوال کہ "کیا میاں دم خان آگئے ہیں" اس بات کا غماز ہے کہ یہ سارا منصوبہ اُس کے مشورہ سے بنایا گیا تھا۔

تاہم نواب نے اپنے مہمانوں سے کہا کہ وہ ابھی سال ڈیڑھ سال کے لئے سوات پر حملہ کے لئے تیار نہیں ہے اس لئے کہ وہ جندول میں بری طرح الجھا ہوا ہے۔ اُس کے مہمان اس پہلو تہی والے جواب سے بہت جز بز ہوئے۔ درحقیقت نواب کو برطانوی حکام سے سخت پیغام مل چکا تھا کہ سوات سے آنے والے یہ لوگ اُس کی سرزمین کو سوات مخالف سرگرمیوں اور سازشوں کے لئے استعمال نہ کرسکیں۔ کہا جاتا ہے کہ ستمبر 1928ء میں نواب دیر کو ایک غیر دستخط شدہ خط ملا (جو بہ ظاہر اہالیان سوات کی جانب سے تھا)، جس میں اُس سے استدعا کی گئی تھی کہ وہ آکر سوات کو والی کے قبضہ سے چھڑالے، اس لئے کہ لوگ اُس کی سخت گیری سے تنگ آگئے ہیں۔ اُسے پیش کش کی گئی تھی کہ

دریائے سوات کے دائیں کنارے کے لوگ اُس کا ساتھ دینے کے لئے تیار ہیں۔

نواب کو یقین تھا کہ یہ صرف روپیہ، اسلحہ اور گولہ بارود تھیانے کے لئے والی کی حکومت سے ناراض لوگوں کا ایک حربہ ہے۔ تاہم اُس نے اپنے رضاعی بھائی اور اُس کے باپ کو سوات کی سرحد پر واقع سم کوٹ بھیجا تاکہ وہ وہاں ایک قلعہ تعمیر کر لیں اور نیک پی خیل کے لوگوں کو باچا کے خلاف بغاوت پر اُکسا سکیں۔

1929ء میں سوات میں مویشی چرانے کا ایک معمولی واقعہ بھی اختلاف کا باعث بنا جب پیر بابا آئے ہوئے دیری زائرین کو حراست میں لے لیا گیا۔ برطانوی حکام نے دونوں حکمرانوں کو ایسے جرائم کی حوصلہ شکنی اور اپنے دیگر دیرینہ تنازعات حل کرنے کے لئے کہا۔ حالات کو معمول پر لانے کے لئے برطانوی حکومت نے دسمبر 1930ء میں ایک فرمان جاری کیا جس میں 'نواب دیر اور والی (عبدالودود) کو باہمی دشمنی بلکہ ایک دوسرے کے خلاف سازشیں کرنے سے بھی منع کیا گیا۔ نواب نے تو مختلف وجوہات کو بہانہ بنا کر 1932ء تک اس پر عمل درآمد سے انکار کیا لیکن والی نے اسے فی الفور تسلیم کر لیا'۔

سواتی حکمران کے لئے یہ فرمان مہر بہ شکل تہر ثابت ہوا۔ حالاں کہ ان احکامات کے تحت اُس کی پوزیشن زیادہ نازک نظر آتی تھی اس کی جانب سے اسے فوری تسلیم کرنے کی وجہ سمجھ میں آتی ہے۔ اس سے وہ مضبوط ہوا اور اُس کی پوزیشن مستحکم ہوگئی۔ اس سے درحقیقت ادین زئی معاہدہ میں سوات کے مفادات کے خلاف باتوں کا ازالہ ہوگیا۔ سوائے ادین زئی پر دیر کے قبضہ کے باقی ہر لحاظ سے والی اور نواب کی پوزیشن یکساں ہوگئی۔

اس فرمان کے اجرا اور تسلیم کئے جانے کے باوجود نہ تو دونوں ریاستوں کے درمیان شکوک و شبہات کی فضا ختم ہوئی اور نہ ان میں دوستانہ تعلقات قائم ہو سکے۔ بہر حال عداوتوں اور سازشوں کا سلسلہ کچھ وقت کے لئے ضرور ٹل گیا۔ تعلقات آخر دم تک غیر دوستانہ اور تناؤ کا شکار رہے لیکن پھر کبھی کھلی جنگ تک بات نہیں پہنچی۔ انگریزوں کی تنقیح و توازن والی پالیسی دونوں ریاستوں کے باشندوں کے لئے کسی نعمت سے کم نہیں تھی۔ اس سے وہ مسلسل کشاکش، یورشوں، لڑائی اور لوٹ مار کے عذاب سے بچ گئے۔ 1969ء میں ادغام تک دونوں ریاستوں میں حالات جوں کے توں رہے۔

ریاست امب سے تعلقات

ریاست امب موجودہ صوبہ خیبر پختون خوا میں '15 -°34 اور '23 -°34 شمالاً اور '52 -°72 اور '10 -°73 شرقاً واقع ہے۔ یہ ریاست اباسین کے کنارے 225 مربع میل کے علاقہ پر پھیلی ہوئی تھی۔ اسے مغرب

میں اتمان زئی، جدون، امازئی اور مداخیل کے آزاد قبائل کے پہاڑوں نے گھیرا ہوا تھا۔ اس کے شمال مشرق میں تحصیل مانسہرہ (اب ضلع مانسہرہ)، شمال مغرب میں حسن زئی، نصرت خیل، بسی خیل، اکازئی اور سورتی قبائل، یاغی (غیر) علاقہ، جب کہ جنوب میں تحصیل ایبٹ آباد (اب ضلع) ہے۔

ایک طویل عرصہ تک امب کو ایک نیم خود مختار ریاست کی حیثیت حاصل تھی۔ اس کے سربراہ محمد اکرم خان کو 1868ء میں انگریز نے نواب کے خطاب سے نوازا۔ اس کا سبب' کچھ تو اُس کے باپ کی جانب سے (1857ء) کی جنگ میں (انگریزوں کے لئے) پیش کردہ خدمات تھیں اور کسی حد تک 1868ء میں ہزارہ مہم کے دوران اُس کی اپنی حوصلہ مندی اور وفاداری کا اعتراف سمجھا جاسکتا ہے۔' 1907ء میں محمد اکرم خان کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد اُس کا بیٹا خان زمان خان تخت نشین ہوا۔

خان زمان خان کو برطانوی راج میں ایک بے نظیر حیثیت حاصل تھی۔ ایک جانب وہ اپنے علاقہ کا خود مختار حکمران تھا جب کہ دوسری جانب تناول جاگیر دار تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ہری پور تحصیل ضلع ہزارہ میں واقع جاگیر اور وسیع زمینوں کا مالک ہونے کی وجہ سے برطانوی رعیت میں شامل تھا۔ جنوری 1919ء میں' ریاست امب کی سربراہی کی بدولت اسے (وفاداری اور اچھے برتاؤ کی شرط پر) نواب کا موروثی خطاب دیا گیا۔'

درمیان میں واقع خدوخیل، بونیر اور امازئی علاقوں کی وجہ سے سوات اور امب ریاستوں کے بیچ دوستانہ اور معاندانہ دونوں قسم کے تعلقات موجود نہیں تھے۔ نواب دیر نے سابقہ سواتی حکمران عبدالجبار شاہ (حالیہ مقیم ستھانہ) سے ساز باز کر کے سوات کے خلاف اتحاد بنانے کی کوشش کی۔ عبدالجبار شاہ کی سوات مخالف سرگرمیوں اور سوات و امب ریاستوں کی جانب سے بونیر پر قبضہ کی کوششوں سے دونوں ریاستوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔

نومبر 1918ء میں نواب دیر نے عبدالجبار شاہ کو سوات پر دوبارہ قبضہ کرنے کے لئے مدد کی ترغیب دی لیکن اُس وقت شرائط پر مفاہمت نہ ہونے کی وجہ سے بات آگے نہ بڑھ سکی۔ فروری 1921ء میں نواب نے دوبارہ عبدالجبار شاہ کو بہ یک وقت سوات پر حملہ کرنے کی دعوت دی اور دریائے سوات کے بائیں جانب کے علاقہ پر اُسے مکمل اقتدار کی یقین دھانی کرائی۔ اس دعوت کے دو ماہ بعد عبدالجبار شاہ نے نواب سے کہا کہ حملہ کا مناسب وقت آپہنچا ہے۔

16 اپریل کو عبدالجبار شاہ نے چکیسر سے اپنی مہم کا آغاز کیا اور بہ راستہ عزی خیل سوات پر حملہ کر کے نواب سے دریا کے دوسری جانب سے حملہ کے لئے کہا جیسا کہ ان کے درمیان معاہدہ ہوا تھا۔ یہ کوشش کامیاب نہ ہوسکی لیکن عبدالجبار شاہ نے نواب کو بتا دیا کہ وہ اپنی فوج ایک بار پھر آگے لے آئے گا اگر اُسے معلوم ہوا کہ نواب نے سوات پر چڑھائی کر دی ہے۔ ریاست سوات کے خلاف دیر اور امب کی ریاستوں کے درمیان سازشوں کا سلسلہ جاری رہا جس

کے نتیجہ میں دونوں نے مل کر سواتی حکمران کے خلاف ایک مخفقہ کوشش کی جو ناکامی پر منتج ہوئی (پانچواں باب دیکھ لیں)۔ ستمبر 1922ء میں نواب امب نے سواتی حکمران کو نکال باہر کرنے کے لئے اپنا لشکر بھیجا جس نے اپنی پوزیشن اور مقبوضات کی حفاظت کے لئے اپنی پوری طاقت استعمال کی۔ اس کے ساتھ بونیر پر اپنی عمل داری قائم کرنے کے لئے بھی وہ کوشاں رہا جہاں 1920ء میں سرسرداری کے میاں حمزاللہ کی قیادت میں ایک چھوٹے سے دستہ نے بونیر کی طرف واقع کلیل بانڈہ پر قبضہ کر لیا تھا۔

فروری 1923ء میں حسن زئی قبیلہ کے تقریباً سو افراد سوات آئے۔ وہ سواتی باچا کے ساتھ نواب امب کے خلاف اتحاد بنانا چاہتے تھے۔ اس سے نواب کو پریشانی لاحق ہوئی اور اُس نے فی الفور مداخیل جرگہ طلب کیا تاکہ اپنے خلاف کسی اتحاد کی صورت میں اُس کا توڑ کیا جا سکے۔ نواب امب بونیر پر سواتی حملہ سے طیش میں تھا اس لئے اُس نے عبدالجبار شاہ کے ساتھ اتحاد بنانے کی بات کی۔ عبدالجبار شاہ اُس کا وزیر بن گیا۔ اُس نے نواب کو تجویز پیش کی کہ ناگئی (بونیر) میں شاہ جہان خان کی مدد کے لئے ایک دستہ روانہ کیا جائے تاکہ سوات سے حملہ کے خطرہ کو کم کیا جا سکے۔

حسن زئی اور خدوخیل جرگوں نے آ کر ایک بار پھر نواب امب کے خلاف مدد کی درخواست کی۔ باچا صاحب نے بونیر ایک لشکر بھیج کر اس پر قبضہ کر لیا۔ جب کہ اسی دوران اُس نے ملاکنڈ کے پولیٹیکل ایجنٹ سے شکایت کی کہ نواب امب نے خدوخیل اپنی فوج بھیجی ہے جس نے چملہ کے مقام پر اُس کے آدمیوں پر فائرنگ کی ہے۔ اب وہ جوابی اقدام کرے گا جس کی ساری ذمہ داری نواب پر ہوگی۔ مئی 1923ء میں اُس نے پولیٹیکل ایجنٹ کو لکھا کہ اُس کی معلومات کے مطابق نواب بونیر میں اُس پر حملہ کرنے والا ہے۔ اگر ایسا ہوا تو وہ اباسین پار تناول پر حملہ کرنے میں خود کو آزاد سمجھے گا۔

جولائی 1923ء میں نواب امب نے اپنی ساری بے قاعدہ فوج کے ہمراہ دیولئی کے مقام پر کوچ کیا تاکہ چملہ پر قبضہ کے لئے سواتی فوج سے دو دو ہاتھ کرے۔ سواتی افواج وزیر حضرت علی کی زیر قیادت آگے بڑھیں۔ ڈگر پہنچ کر انہیں پتہ چلا کہ امب کا ایک لشکر ناگئی پر حملہ کرنے والا ہے۔ اس دوران وزیر اور نواب امب کو مزید کمک پہنچ گئی۔ 19 جولائی کو عبدالجبار شاہ کی زیر قیادت امب لشکر نے ناگئی پر حملہ کر دیا۔ گھمسان کی جنگ چھڑ گئی۔ 20 جولائی کو جنگ رک گئی اور دونوں فریق اپنے اپنے دستوں کو مضبوط بنانے میں لگے رہے۔ 26 جولائی کو باچا نے پولیٹیکل ایجنٹ کو مطلع کیا کہ اگر اُس کے دیگر زیر قبضہ علاقوں کی حفاظت کی ضمانت دی جائے تو وہ بونیر سے پسپا ہونے کے لئے تیار ہے۔

سواتی لشکر نے 17 اگست کو امب فوج پر حملہ کیا اور انہیں اپنے ٹھکانوں سے نکال باہر کیا۔ باچا نے پولیٹیکل

ایجنٹ کو لکھا کہ ' اُس کی فوجوں نے 18 تاریخ کو امب کے نواب کی فوج کو شکست دے دی ہے اور انہیں بونیر سے نکال دیا ہے۔' اور وہ واپس دیولئی چلی گئی ہے۔ نواب امب کی فوج کی شکست کی ایک وجہ اُس کے افسران کے درمیان حسد کا جذبہ تھا۔' دوسری وجہ' میاں گل کے وزیر کی جنگی حکمت عملی تھی جس کے تحت اُس نے اُن کے رسد کا راستہ مسدود کر دیا تھا۔' سواتیوں کی یہ فتح نواب امب کے لئے کاری ضرب ثابت ہوئی اور سوات کے خلاف اُس کی مہم جوئی کا خاتمہ ہو گیا۔ اس جنگ میں جانی نقصان بہت زیادہ ہوا۔ اس کا سبب بونیر میں سواتیوں کا دھوکہ سے کیا گیا قتل عام تھا جب وہ محاذ پر جارہے تھے اور پھر اس کے ردعمل میں ہونے والی جوابی کارروائی تھی۔

نواب امب کی مدد کرنے میں ناکامی کی وضاحت کرتے ہوئے نواب دیر نے اُسے لکھا کہ ' وہ اپنی فوج کو پیش قدمی کے لئے تیار رکھے تاکہ جب دیر کے لشکر میدان میں آجائیں تو وہ بھی ساتھ دینے کے لئے آجائے۔ نواب امب نے یوں تو اس تجویز کی حمایت کا اظہار کیا لیکن 'پس پردہ اپنا ایک آدمی میاں گل (سواتی حکمران) کے پاس معاہدہ امن کی شرائط کے بارے میں معلومات کے لئے بھیجا'۔ مذاکرات شروع ہوئے۔ باچا نے تجویز پیش کی کہ خدوخیل، امازئی اور آس پاس کے دیگر قبائل (جو کہ دونوں حکمرانوں کے زیر اثر ہیں) دونوں ریاستوں کے ماتحت نہ رہیں اور اس پورے علاقہ کو تصادم روک علاقہ قرار دے دیا جائے لیکن نواب امب ان قبائل کو پہلے کی طرح اپنے ماتحت رکھنا چاہتا تھا۔

نواب دیر نے نواب امب اور عبدالجبار شاہ کے ساتھ سلسلہ جنبانی کی۔ نواب امب نے پیش قدمی کا ارادہ باندھا جو کہ بے نتیجہ رہا۔ ڈپٹی کمشنر ہزارہ نے

"اُسے مشورہ دیا کہ وہ بونیر میں ایسی کسی مہم جوئی سے احتراز کرے بلکہ میاں گل سے گفت و گو کا آغاز کرنے کی کوئی سبیل پیدا کرے دونوں کے درمیان کم از کم عارضی نباہ کی کوئی صورت نکالے اور پھر بونیر اور قریبی قبائل کے ضمن میں باہمی حد بندی کا انتظام کرے۔"

اگست 1924ء میں سواتی باچا نے خدوخیل اور امازئی علاقہ میں پیش قدمی کی۔ شبہ کیا جارہا تھا کہ وہ ستھانہ اور امب پر اچانک حملہ کرنے کی منصوبہ بندی کر رہا ہے۔ نواب امب شیر گاہ چھوڑ کر دربند آ گیا تاکہ ایسے کسی حملہ کی مزاحمت کی جائے۔ باچا نے خدوخیل اور سورے امازئی کو زیرنگین کر لیا۔ جولائی 1925ء میں کہا جارہا تھا کہ باچا اور نواب فوری طور پر سرحدوں کی حد بندی کرنا چاہتے ہیں اور یہ کہ کچھ سواتی حکام کو اُس غرض کے لئے گفت و شنید کی خاطر بھیجا گیا لیکن وہ ناکام لوٹ آئے۔ تاہم برطانوی حکومت سے معاہدہ کے بعد باچا نے اپنے اور نواب امب کی ریاستوں کے درمیان ایک غیر جانب دار علاقہ تسلیم کر لیا۔ ایسا انگریزوں کی جانب سے اُسے والی تسلیم کئے جانے کے موقع پر کیا گیا۔

اس طرح برطانوی حکومت کی مداخلت اور دونوں ریاستوں کے درمیان حد بندی کرنے سے آئندہ ان کے درمیان جنگ کا خطرہ ٹل گیا لیکن ان کے درمیان تعلقات خراب ہی رہے۔

1930ء میں نواب امب نے برطانوی حکومت کے حضور اپنی کئی خوبیوں کا حوالہ دیتے ہوئے سوات کے ساتھ طے پانے والے تصفیہ پر اپنی ناخوشی کا اظہار کرتے ہوئے اپنے "ملکیتی دعویٰ" کو دھرایا۔ اُس نے لکھا۔

''مجھے کسی جنگ میں شکست نہیں ہوئی بلکہ محض مقامی انگریز حکومت کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے جو کہ جولائی 1923ء میں ہونے والی جملہ کی جنگ سے قبل مجھ تک پہنچائی گئی تھی، میں نے خاموشی اختیار کئے رکھی اس خیال سے کہ ریاست سوات اور امب کے درمیان حدود کا صحیح تعین کر دیا جائے گا۔ لیکن میری اس اطاعت شعاری کا بدلہ میری تمام توقعات کے برخلاف انتہائی افسوس ناک شکل میں مجھے دیا گیا۔ مجھے اپنے اُن علاقوں سے محروم کر دیا گیا۔ جو گزشتہ پچاس سالوں سے میرے ہاتھ میں تھے۔''

لیکن برطانوی حکومت کی ترجیحات مختلف تھیں۔ جس کا اظہار یوں کیا گیا کہ 'ریاست امب اور سوات کے درمیان بسنے والے قبائل کے بارے میں نواب امب پر بھی والیٔ سوات جیسی پابندیاں عائد کرنا لازم ہے۔' برطانوی حکومت نے اگر چہ کھلم کھلا والی کی حمایت وحفاظت کی پالیسی اختیار نہیں کی لیکن پس پردہ وہ اس خیال سے اُس کا خیال رکھتے رہے کہ صرف یہ نہیں کہ 'اُس کی مضبوط حکومت اُن کے مفاد میں ہے بلکہ ہر ہر موقع پر اُس نے اُن سے تعاون کر کے اپنی لازوال وفاداری کا ثبوت فراہم کیا ہے۔' اس لئے ریاست سوات کو مستحکم کرنا انگریزوں کے بہترین مفاد میں تھا۔

پاکستان سے تعلقات

ریاست سوات ہندوستان میں موجود تقریباً 562 نوابی ریاستوں میں سے ایک تھی۔ ان ریاستوں کی حیثیت اور مستقبل کے بارے میں آل انڈیا کانگریس اور آل انڈیا مسلم لیگ کے نقطہ نظر میں نمایاں فرق تھا۔ کانگریس کے اکثر رہنما بالخصوص اُس کے صدر جواہر لال نہرو ملک میں موجود ان علاحدہ اکائیوں کے خلاف تھے، اس لئے مستقبل میں ہندوستان اور پاکستان کی آزاد مملکتوں کے قیام کے بعد ان کے وجود کے بارے میں نہرو اپنی مخالفانہ رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے کہ 'شخصی حکومت کا مکمل خاتمہ ہونا چاہئے' اور یہ کہ 'کسی کے لئے بھی چاہے وہ جتنے بھی اونچے مقام پر فائز ہو یہ کہنا انتہائی رُسوا کن بات ہے کہ آج کے دور میں اُسے دوسرے انسانوں پر الوہی اختیار حاصل ہے۔'

کانگریس کی ان ریاستوں کے بارے میں سرکاری پالیسی یہ تھی کہ انہیں آزاد ہندوستان کا جز و لاینفک ہو کر رہنا ہوگا۔ اقتدار اعلیٰ یقیناً وجود میں آنے والی نئی مملکتوں کو حاصل ہوگا۔ مسلم لیگ کا نقطہ نظر مختلف تھا۔ 1940ء میں محمد

علی جناح نے قراردادِ پاکستان کے پاس ہونے کے موقع پر ایک بیان جاری کیا جس میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا کہ شمال مغربی علاقہ میں موجود ریاستوں کو مسلمانوں کے وطن کے وفاق میں شامل ہونے پر خوش آمدید کہا جائے گا۔ انہوں نے باقاعدہ اعلان کیا کہ لیگ کا ان ریاستوں کو مجبور کرنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ اس کے بعد انہوں نے اس مسئلہ پر کچھ نہیں کہا۔

ہندوستانی نوابی ریاستوں کے بارے میں 3 جون 1947ء کے پالیسی بیان میں کہا گیا کہ' شہنشاہِ معظم کی حکومت اس بات کی وضاحت کرنا چاہتی ہے کہ ہندوستانی ریاستوں کے بارے میں ان کی جو پالیسی 12 مئی 1946ء کے کیبنٹ مشن میمورنڈم میں بیان کی گئی ہے اُس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی گئی ہے۔'3 جون کے منصوبہ کے اعلان کے بعد نہرو نے' کانگریس کی مقرر کردہ پالیسی کے مطابق کہا کہ آنے والی کوئی سی بھی ہندوستانی حکومت انگریزوں سے انتقالِ اقتدار کے بعد اقتدارِ اعلیٰ کی حق دار ہوگی۔ اُس نے انتہائی شدومد سے اس بات سے انکار کیا کہ ریاستوں کو خود کو آزاد قرار دینے کا کوئی اختیار حاصل ہے۔ اُس نے دعویٰ کیا کہ کیبنٹ مشن کے میمورنڈم میں اس قسم کی کوئی بات موجود نہیں ہے۔'

جب کہ محمد علی' جناح نے کہا کہ ان کے خیال میں ریاستوں کو اس بات کا مکمل حق حاصل ہے کہ وہ دونوں میں سے کسی بھی اسمبلی کا حصہ بننے سے انکار کر دیں۔ ہر ہندوستانی ریاست اپنی حیثیت میں اقتدارِ اعلیٰ رکھتی ہے۔' ان ریاستوں کی آزاد حیثیت کی وکالت کرتے ہوئے جناح اپنی بات پر اڑے ہوئے تھے۔ اس سلسلہ میں اپنے دلائل دیتے ہوئے وہ کہتے ہیں۔

'' کیبنٹ مشن نے اس قسم کا کوئی اصول طے نہیں کیا کہ ہر ریاست کو ضرور دونوں میں سے کسی ایک اسمبلی کا حصہ بننا پڑے۔ انہیں فیصلہ کرنے کی آزادی حاصل ہے لیکن اس ضمن میں کئی معاملات طے ہونا ابھی باقی ہیں۔ یہ کام شاہی نمائندہ ہی کر سکتا ہے جب تک وہ ہے۔ مسلم لیگ اور کانگریس دونوں کا مفاد اسی میں ہے کہ یہ معاملات طے ہو جائیں۔''

بعد میں انہوں نے' الحاق کے منصوبہ کے بارے میں اپنے اعتراض اور پاکستان کے ساتھ آنے والی ریاستوں کی آزادی کی ضمانت کی فراہمی کے بارے میں اپنے ارادے کا اعلان کیا۔'

تیزی سے بدلتے منظر میں شمال مغربی سرحدی ریاستوں کی حیثیت قدرتی طور پر ہندوستان میں موجود دیگر ریاستوں سے مختلف تھی۔ ان ریاستوں کے حکمران نہ تو چیمبر آف پرنسز کے ارکان تھے اور نہ ہی ریاستوں کے بارے میں گفت و شنید کرنے والی کمیٹی میں ان کو کوئی نمائندگی حاصل تھی۔ ان کا مستقبل قبائلی علاقوں سے بندھا ہوا تھا۔ اولف کیرو نے مارچ 1947ء ہی میں کہہ دیا تھا کہ' اگر ہندوستان کے شمالی سرحد کو محفوظ رکھنا ہے تو اس کے لئے ان ریاستوں میں استحکام برقرار رکھنا لازم ہے۔' اس سے ان ریاستوں کی تزویری اہمیت اور ان کو باقی رکھنے کی ضرورت کا

اندازہ ہوتا ہے۔

ان ریاستوں کے مسائل داخلی سے زیادہ خارجی تھے۔ان کے مستقبل کے بارے میں غور وخوض شمال مغربی سرحدی قبائلی علاقہ کے تناظر میں کیا جاتا تھا۔ یہ ہندوستان کے دیگر تمام علاقوں سے مختلف صورت حال کی حامل تھیں۔ ان کا مستقبل اُس علاقہ سے مربوط تھا جو کہ ڈیورنڈ لائن اور ہندوستانی انتظامی مشینری کے تحت علاقوں کے درمیان واقع ہے۔

ان باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے پاکستان کے خارجہ امور اور دولت مشترکہ تعلقات کے شعبہ نے پشاور میں ناروبیف کو لکھا۔

''برائے مہربانی تمام متعلقہ حکمرانوں کو فوری مطلع کرو (اگر ضروری خیال کرو تو وسیع پیمانہ پر اس کو مشتہر کرو) کہ کو کہ آئینی لحاظ سے انہیں آزاد ہو جانے کا اختیار حاصل ہے پاکستان کی عارضی حکومت ان سے دوستانہ تعلقات کی خواہشمند ہے اور چاہتی ہے کہ انہیں دی جانے والی امدادی رقوم، موجودہ انتظامات اور معاہدہ وں کو جن میں افواج اور اسلحہ کی فراہمی وغیرہ شامل ہے برقرا رکھا جائے۔''

اگر یہ ریاستیں چاہیں تو اُس وقت تک موجودہ انتظامات کو جاری رکھا جائے گا جب تک کہ حکومت پاکستان اور متعلقہ ریاستوں کے درمیان متبادل انتظامات کے لئے نئے معاہدے نہ ہو جائیں۔

میاں گل عبدالودود کو برطانوی حکومت کے اختتام کے بعد پاکستان سے معاہدہ طے کرنے کے لئے اپنا کوئی نمائندہ مقرر کرنے میں تامل تھا لیکن وہ خود اس پر دستخط کرنے کے لئے تیار تھا۔ بعد میں اُس نے اپنے ولی عہد کو یہ معاہدہ (جب اور جہاں اس کی ضرورت پڑے) طے کرنے کا اختیار دے دیا۔ یہ اعلان کیا گیا کہ سرحدی ریاستوں کے لئے اپنے نمائندے ہیڈ کوارٹر بھیجنا نہ تو لازم ہے اور نہ مطلوب، اس لئے کہ یہ سارے معاملات مقامی طور پر نمٹائے جائیں گے۔ 13 اگست 1947ء کو بتایا گیا کہ سواتی حکمران نے موجودہ معاہدوں کو 15 اگست سے حکومت پاکستان کے ساتھ جوں کے توں جاری رکھنے پر رضامندی ظاہر کر دی ہے۔

وزیر اعظم پاکستان نے شمال مغربی سرحدی صوبہ کی حکومت کو 2 اکتوبر 1947ء میں راولپنڈی میں فرنٹیئر پالیسی کے بارے میں منعقدہ ایک کانفرنس میں ہدایت کی کہ سرحد پر واقع ریاستوں کے ساتھ حکومت پاکستان اور ان کے درمیان مستقبل کے معاہدوں کے سلسلہ میں بات کی جائے۔ مقصد اس کا یہ تھا کہ ان تمام ریاستوں کو الحاق کے اُس ضابطہ کو تسلیم کرنا چاہئے جس پر ریاست جوناگڑھ نے دستخط کئے تھے۔ مجوزہ دستاویز الحاق کا نچوڑ یہ تھا:

''امر جس کا اس ضابطہ کے تفصیلی لائحہ عمل میں اظہار کیا گیا ہے اُس کے مطابق حکومت پاکستان قانون سازی اور پالیسی سازی کی مجاز ہوگی اور یہ کہ ریاست کا حکمران اس ضابطہ کو اپنی حد تک لاگو کرنے پر تیار ہے۔ جب کہ حکمران کے موجودہ کلی اختیارات اُسے حاصل رہیں گے سوائے ان کا جن کا ضابطہ کے تفصیلی لائحہ عمل میں ذکر کیا گیا ہے۔''

پولیٹیکل ایجنٹ نے بتایا کہ ریاستوں کے حکمران اس الحاقی ضابطہ کی طوالت اور پیچیدگی کی وجہ سے خدشات کا شکار نظر آتے ہیں۔صوبائی گورنر نے پولیٹیکل ایجنٹ کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے سرحدی ریاستوں کے مخصوص حالات کی وجہ سے مختصر معاہدہ تجویز کیا۔ اُس نے تجویز پیش کی کہ

''میں حکومت پاکستان کی جانب سے ان حکمرانوں کو لکھ کر بتاؤں گا کہ حکومت پاکستان کی مذکورہ تین امور کے بارے میں ریاستوں کے ساتھ پالیسی بالعموم انہی خطوط پر استوار ہوگی جن پر حکومت برطانیہ اوران ریاستوں کے درمیان پہلے سے معاملات چلتے رہے تھے۔ میرے خیال میں اس سے ان کی تسلی ہوجائے گی۔ میں انہیں یہ بھی بتاؤں گا کہ ان کی امدادی رقوم وفاداری اور دیگر معمولی شرائط کے ساتھ جاری رہیں گی۔''

وزیراعظم پاکستان نے 30 اکتوبر 1947ء کو ضابطہ الحاق کا ترمیم شدہ حتمی مسودہ، صوبہ سرحد کے گورنر کو سونپا۔ تاہم تفصیلی لائحہ عمل کے ساتھ منسلک ایک ضمنی تحریر میں اس بات کی وضاحت کی گئی کہ'ان ریاستی حکمرانوں کو تحریراً یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مذکورہ تین امور کے بارے میں ریاستوں کے ساتھ حکومت پاکستان کی پالیسی ان عمومی خطوط پر استوار ہوگی جن پر برطانوی حکومت کی پالیسی استوار رہی ہے۔ البتہ امدادی رقوم کی یقین دھانی ان کو دے دی جائے۔'

طویل غوروخوض کے بعد 3 نومبر 1947ء کو ریاست سوات نے پاکستان کے ساتھ الحاق کیا اور 24 نومبر 1947ء کو 'سابقہ برطانوی حکومت کے ساتھ موجود شرائط پر اس الحاق کو تسلیم کرلیا گیا'۔ اے ایچ حبیبی رقم طراز ہے:

''برطانوی دور کے دو دستخط شدہ معاہدے، جن کی بعد میں حکومت پاکستان نے بھی توثیق کی ان میں ریاستی حکمرانوں کے لئے بشمول والیٔ سوات شرائط وضوابط اور حقوق وفرائض کی پوری وضاحت موجود ہے۔ ان کے مطابق تمام اہم امور جیسے دفاع، خارجہ امور، دیسی امور، وغیرہ بلاواسطہ مرکزی حکومت کے تحت آئیں گے۔''

'دیسی امور' کاذکر ضابطہ الحاق یا منسلک تفصیلی لائحہ عمل میں نہیں ہے بلکہ خارجہ امور، دفاع اور مواصلات سے متعلق حکومت پاکستان کے قانونی وانتظام وانصرام کے حق کو تسلیم کرلیا گیا تھا۔ 1954ء کے ضمنی ضابطہ الحاق میں دیگر اور کرنسی سے متعلق امور بھی شامل کر لئے گئے۔

میاں گل عبدالودود کا دعویٰ ہے کہ ریاستی حکمرانوں میں'پاکستان سے الحاق کرنے والے وہ پہلے حکمران ہیں۔' حقیقت میں یہ اعزاز، اگر اسے اعزاز سمجھا جائے، ریاست جوناگڑھ کو ملنا چاہئے، جس نے اگست 1947ء کے اوائل میں (قبل از تقسیم) 'پاکستان سے الحاق کے ارادے کا اعلان کردیا تھا'۔ اُس نے 14 ستمبر 1947ء کو پاکستان سے الحاق کیا تھا اور گورنر جنرل پاکستان نے 15 ستمبر 1947ء کو اس پر دستخط کردیئے تھے۔ بہاولپور اور خیر پور کی ریاستوں نے ضابطہ الحاق کو 3 اکتوبر 1947ء کو عملی جامہ پہنایا اور اسے 5 اکتوبر 1947ء کو منظور کرلیا گیا۔ چترال اور دیر کی ریاستوں نے بالترتیب 6 اکتوبر اور 8 نومبر 1947ء کو اسے عملی جامہ پہنایا جسے بالترتیب 18 اور 8

فروری 1948ء کو منظوری ملی۔ پاکستان سے الحاق کے بارے میں عبدالودود اور میاں گل جہان زیب دونوں کے بیانات غلط ہیں۔ آخر فلڈکر کے مطابق چترال نے الحاق میں سب سے پہل کی، پھر دیر اور تیسرے نمبر پر سوات نے اسے عملی جامہ پہنایا۔

تقسیم ہند سے قبل میاں گل عبدالودود نے آل انڈیا مسلم لیگ اور تحریک پاکستان کی حتی المقدور مدد کی۔ بالخصوص صوبہ سرحد میں ہونے والے ریفرنڈم کے موقع پر ان کی خدمات نمایاں رہیں۔ ریفرنڈم کے اخراجات میں مدد کے لئے انہوں نے مسلم لیگ کو ایک لاکھ دس ہزار روپے دیئے اور اُس کے ساتھ ساتھ ریفرنڈم میں پاکستان کے حق میں رائے عامہ ہموار کرنے کے لئے نچلے واقع اضلاع میں اپنے لوگ بھیجے۔

انہوں نے قائداعظم ریلیف فنڈ میں دو لاکھ روپے دیئے۔ اس طرح موقع بہ موقع مختلف قسم کے پاکستانی فنڈوں کے سلسلہ میں کل آٹھ لاکھ روپے دیئے۔ انہوں نے سیکرٹری دفاع اسکندر مرزا کے کہنے پر حکومت پاکستان کے لئے ایک فیوری لڑاکا جہاز ایک لاکھ پچیس ہزار روپے میں خریدا جسے ولی عہد سوات جہان زیب کا نام دیا گیا۔ اسی طرح وہ اپنے سالانہ وظیفہ سے بھی ہمیشہ کے لئے دست بردار ہوگئے۔

جب 1948ء میں کشمیر میں جنگ چھڑی تو انہوں نے بارہ مولا میں پاکستان کو پہنچنے والے ابتدائی دھچکے کے بعد اپنی ریاستی ملیشیا کشمیر بھیج دی۔ سواتی فوج نے محاذ پر پہنچتے ہی ایک گھنٹہ کے اندر باغ کے قصبہ پر قبضہ کرلیا۔ اگر انہیں بلا روک ٹوک آگے بڑھنے دیا جاتا تو وہ پونچھ پر قبضہ کر لیتی۔ وہ سرینگر کے مضافات میں پہنچ کر اُس پر قبضہ کرنے والی تھی کہ پاکستانی حکام نے انہیں پسپا ہونے کے لئے کہا۔ بعد ازاں ہر دوسرے مہینے سواتی فوج کا تازہ دم دستہ ریاستی گاڑیوں میں پہنچ کر اپنے ساتھیوں کی جگہ لیتا رہا حتیٰ کہ فائر بندی کا اعلان ہو گیا۔ 1965ء کی جنگ کے دوران بھی سواتی ملیشیا کو کشمیر کے محاذ پر بھیجا گیا۔ دوران جنگ ایک دستہ محاذ پر موجود رہا، وقت معینہ پر تازہ دم دستہ اُس کی جگہ لیتا رہا۔ اس بار بھی محاذ پر سواتی ملیشا نے بہت اہم کردار ادا کیا اور بڑی کامیابی حاصل کی لیکن پاکستانی افسران کی نا اہلی کی وجہ سے مقبوضہ علاقوں سے ہاتھ دھونے پڑے اور پیش قدمی کر کے فوجی حکمت عملی سے اہم مقامات قبضہ میں لینے کے مواقع گنوا دیئے گئے۔

تقسیم ہند کا عمل 15 اگست 1947ء کو پایۂ تکمیل کو پہنچا اور اُسی دن پاکستان معرض وجود میں آیا نہ کہ 14 اگست کو جیسا کہ عموماً سمجھا جاتا ہے۔ ریاست سوات اندرونی طور پر خود مختار رہی، حالانکہ تکنیکی لحاظ سے اس نے پاکستان کے ساتھ الحاق کرلیا تھا۔ کالام کا مسئلہ (جس پر سوات نے 14 اور 15 اگست کی رات کو قبضہ کرلیا تھا) فریقین میں وجہ نزاع بنا رہا اس لئے کہ 'حکومت پاکستان اس قبضہ کو قانونی طور پر صحیح تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھی۔ 'یہ مسئلہ 1954ء تک برقرار رہا جب 12 فروری 1954ء کو والی صاحب نے 'حکومت پاکستان کے ساتھ سوات

کے پہلے آئینی اور سوات کوہستان (کالام، اوشو، اتروڑ کے علاقے) کے انتظام کے بارے میں معاہدے پر دستخط کئے۔ خفت سے بچنے کی ایک تدبیر کے طور پر اس بات پر مصالحت کر لی گئی کہ یہ علاقہ سوات کے علاقوں کی طرح کے اختیارات کے ساتھ والی کے ماتحت رہے گا لیکن اُسے منتظم کالام کہا جائے گا اور یہاں کا انتظام چلانے کے عوض اُسے سالانہ چوبیس ہزار روپیہ الاونس دیا جائے گا۔ سوات کی ریاستی حکومت کا خیال تھا کہ کالام اُس کا حصہ ہے جب کہ حکومت پاکستان کے خیال میں اسے عارضی طور پر ریاست سوات کے زیر انتظام دے دیا گیا ہے۔ ڈیوڈ ڈشر اس پر یوں اپنی رائے دیتا ہے۔

"تازہ کالام سے یہ فوری سوال پیدا ہوتا ہے کہ مرکزی حکومت اس ریاست کے علاوہ وجود کو کیوں برداشت کر رہی ہے۔ اس سوال کے کئی جواب دیئے جاسکتے ہیں لیکن سب سے صاف جواب والی کے چیف سیکرٹری کا لگتا ہے جس نے کہا کہ سوات کا ادغام موجودہ صورت حال کے مقابلہ میں مرکزی حکومت کے لئے کہیں زیادہ مسائل اور پریشانیوں کا سبب بنے گا۔"

پاکستان بننے کے بعد شمال میں کچھ زیادہ نہیں بدلا۔ وجہ یہ تھی کہ حکومتِ پاکستان نے ان سرحدی ریاستوں کے بارے میں خاصا نرم رویہ رکھا۔ مرکزی حکومت نے سوات کی سیاست میں کوئی مداخلت نہیں کی۔ صوبہ سرحد کے گورنر نے وہاں کا دورہ کیا اور 17-18 نومبر 1947ء کی رات سیدو شریف میں گذاری۔ مارچ 1949ء میں گورنر جنرل آف پاکستان خواجہ ناظم الدین نے صوبائی گورنر اور پولیٹیکل ریزیڈنٹ کے ہمراہ سوات کا دورہ کیا۔ 12 دسمبر 1949ء کو وزیراعظم پاکستان لیاقت علی خان نے سیدو شریف میں منعقدہ ایک دربار میں شرکت کی جس میں انہوں نے والی صاحب کی اپنے ہاتھوں سے دستار بندی کی۔ اپنے خطاب میں انہوں نے فرمایا کہ میں والی صاحب کو اس بات کی یقین دہانی کرانا چاہتا ہوں کہ میری حکومت یہاں کے لوگوں کی اقتصادی اور تعلیمی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ہر ممکن مدد فراہم کرنے کی خواہاں ہے۔ ساٹھ سال تک حکومت پاکستان نے ریاستِ سوات کی سیاست میں کوئی مداخلت نہیں کی۔

"جب بھی اس کا کوئی افسر یہاں آیا تو دامنِ احتیاط کو تھامے رکھا.... 1954ء کے سیاسی تصفیہ سے مرکزی حکومت کی سیاسی نہیں صرف آئینی یکسانیت کی خواہش عیاں ہے۔ 1954ء کا سوات عبوری آئینی ایکٹ اور ضمنی ضابطہ الحاق اس ریاست کو آئندہ کے لئے وفاق پاکستان کا حصہ گردانتا ہے۔"

بہاولپور، خیر پور اور بلوچستان کی ریاستوں کے حکمران اب صرف آئینی سربراہان تھے۔ ان کے سارے اختیارات وزرائے اعلیٰ کو منتقل ہو گئے تھے۔ جب کہ سوات میں کسی وزیر اعلیٰ کا تقرر نہیں کیا گیا۔ والی ہی کونسل کا صدر، وزیر اعلیٰ اور حکمران تھا۔ یہ بات بھی دل چسپی سے خالی نہیں کہ نواب دیر نے ضمنی ضابطہ الحاق پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا تھا اس لئے ریاستی حکمرانوں میں اُس کی حیثیت سب سے جدا تھی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت پاکستان نے اُس کے خلاف کارروائی کی اور اُسے معزول کر دیا گیا۔

پاکستان کے مغربی بازو میں ون یونٹ کی تشکیل کے وقت خدشہ تھا کہ قبائلی علاقے اور نوابی ریاستوں کو اس نئے صوبہ میں مدغم کر دیا جائے گا۔ اس طرح اُن کی علاحدہ حیثیت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ بہاولپور کی مقننہ کی برطرفی کو اس قسم کی کارروائی کی تمہید سمجھا گیا۔ اس لئے والی نے ریاست کی مشاورتی کونسل کے لئے انتخابات کا اعلان کر دیا۔ اس کے بعد سوات کو مغربی پاکستان میں مدغم کرنے کے بارے میں مزید کوئی بات نہیں کی گئی۔ '14 دسمبر (1954ء) کو ایک سرکاری اخباری اعلامیہ میں ریاستی خودمختاری کے تسلسل کی تصدیق کرتے ہوئے کہا گیا کہ شمال مغربی سرحدی صوبہ کی ریاستوں کو مجوزہ مغربی پاکستان میں مدغم نہیں کیا جائے گا بلکہ ان کو خصوصی علاقوں کا درجہ حاصل رہے گا۔'

جب ایوب خان برسرِ اقتدار آیا تو حکومتِ پاکستان اور ریاست سوات کے درمیان تعلقات میں صدر پاکستان کی دو بیٹیوں کی والی کے دو بیٹوں کے ساتھ شادی نے مزید گرمجوشی پیدا کر دی۔ تاہم بعض معاملات جیسے مجرموں کی ایک دوسرے کو حوالگی وغیرہ کے بارے میں اختلافات برقرار رہے۔

کچھ پاکستانی حکام ذاتی طور پر والی کے ہمدرد تھے اور اُس کی حمایت کرتے تھے۔ مثال کے طور پر پولیٹیکل ایجنٹ گلگت سید فرید اللہ شاہ نے اپنے ایک انتہائی خفیہ خط میں دیر، سوات اور چترال کے پولیٹیکل ایجنٹ کو لکھا کہ والی صاحب ان کے مشترک دوست ہیں اور وہ حتی الوسع ان کی عزت و وقار والی حیثیت برقرار رکھنے کے لئے کوشاں رہیں گے۔

جولائی 1951ء میں کہا گیا کہ 'علاقہ میں ایک عام خیال ہے... کہ والیِ سوات نے... نواب دیر کے ساتھ ایک خفیہ معاہدہ کر لیا ہے کہ وہ دونوں افغان حکومت سے ملی بھگت کر کے پاکستان پر حملہ کر دیں۔' لیکن جہاں تک والی صاحب کا تعلق ہے تو وہ پاکستان کے وفادار رہے ہیں اور اُس کے لئے کسی قسم کے مسائل پیدا کرنے سے ہمیشہ احتراز کرتے رہے ہیں۔ انہوں نے پاکستانی حکومت کے خدشات کے جواب میں ملاکنڈ میں پولیٹیکل ایجنٹ کو واضح طور پر بیان دیا کہ 'جیسا کہ تمہیں معلوم ہے کہ میری ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ حکومت پاکستان سے تعاون کرتا رہوں اور اس کی مدد کرتا رہوں نہ کہ اُس کے لئے مشکلات پیدا کروں۔' اُس نے نہ صرف یہ کہ سید فرید اللہ شاہ کا شکریہ ادا کیا کہ وہ اس پر اعتماد کرتا ہے بلکہ اُسے اور حکومت پاکستان کو یقین دلایا کہ 'میں حکومت پاکستان کے لئے کسی قسم کی کوئی مشکل کھڑی کرنے والا آخری آدمی ہوں گا۔ میں یہ بات لکھ کر دیتا ہوں کہ میرا یہی مطلب ہے۔' والی صاحب نے بعض سواتی باشندوں سے ضمانتیں لیں کہ وہ پاکستان کے خلاف کوئی پروپیگنڈہ نہیں کریں گے۔

کمزور داخلی اصلاحات، بھاری شاہانہ ذاتی اخراجات اور کالام پر جائز ناجائز قبضہ سے حکومت پاکستان کا صرفِ نظر اس بات کا غماز ہے کہ حکومت ان کا کتنا لحاظ کرتی تھی اور یہ کہ باہمی معاملات میں ان کی حیثیت کتنی مستحکم

تھی۔ علاوہ ازیں پاکستانی انتظامیہ نے (جو کہ جدید طرز زندگی کی دل دادہ تھی) انگریزوں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے سوات کی ترقی پسند حکومت کی دیگر پس ماندہ ریاستوں کے مقابلہ میں زیادہ حمایت و تائید برقرار رکھی۔ البتہ مارچ 1969ء میں ایوب خان کی حکومت سے دست برداری کے بعد تعلقات اتنے دوستانہ نہیں رہے اور فوج کے اقتدار میں آنے کے بعد کچھ پاکستانی حکام نے (جن کے سوات کے حکمرانوں سے ذاتی عناد والے تعلقات تھے) سوات کے پاکستان کے ساتھ تعلقات کی نہج کو بالکل بدل ڈالا۔

آٹھواں باب

انتظام وانصرام

ریاستِ سوات بہت سی چیزوں کے لئے پہلے برطانوی اور بعد میں پاکستانی حکومت پر انحصار کرتی تھی، جیسے کرنسی، ڈاک وتار، خارجہ امور اور بجلی۔ تاہم داخلی طور پر یہ خود مختار تھی۔ اس کے اپنے قوانین تھے، اپنا نظام انصاف، اپنی فوج، پولیس، انتظامیہ، بجٹ اور نظام محصولات تھا۔ حتیٰ کہ اپنا جھنڈا تھا: ہرے پس منظر میں ایک سنہرا قلعہ۔

ریاست سوات ہندوستانی ریاستوں میں سب سے نوخیز تھی۔ یہ شاید دنیا کی واحد ایسی حکومتی مشینری تھی جو کاغذ کے فالتو استعمال کے بغیر چل رہی تھی۔ حالاں کہ اس انتظامی نظام کا بانی اس کا پہلا حکمران عبدالجبار شاہ تھا (جسے اُس کے بعد میں آنے والوں نے ترقی دی) لیکن یہ کتاب میاں گل عبدالودود اور میاں گل جہان زیب کے ادوار حکومت (1917ء تا 1969ء) میں روبہ عمل نظم حکومت سے متعلق ہے۔ وجہ یہ ہے کہ عبدالجبار شاہ کے عہد (1915ء تا 1917ء) کے انتظامِ حکومت کے بارے میں تفصیلی معلومات موجود نہیں ہیں۔

سول انتظامیہ

اس ریاست کی بنیاد ایک محدود عمائدین کے جرگہ نے رکھی جسے حکمرانوں کے تقرر اور برطرفی کا اختیار حاصل تھا۔ جرگہ نے عبدالجبار شاہ کے تقرر اور برطرفی اور اسی طرح میاں گل عبدالودود کے تقرر میں اپنے اس اختیار کو استعمال کیا۔ تاہم میاں گل عبدالودود نے رفتہ رفتہ ایک مطلق العنان حکمران کی حیثیت اختیار کرلی اور پھر اسے موروثی طرزِ حکمرانی میں بدل ڈالا۔

اس انتظامی ڈھانچہ میں چوٹی پر حکمران اور سب سے نیچے تحصیل دار ہوتے تھے۔ حکمران منتظم اعلیٰ ہوتا تھا بلکہ حقیقت میں وہی سب محکموں کا سربراہ تھا۔ ضمنی ضابطہ الحاق جس پر 1954ء میں والی نے دستخط کئے تھے اور حکومت سوات (عبوری آئین) ایکٹ 1954ء، دونوں کے مطابق حکمران ایک مشاورتی کونسل بنانے کا پابند تھا، جس کے

پندرہ ارکان منتخب اور دس حکمران کے نامزد کردہ تھے لیکن بہاولپور، خیر پور، اور بلوچستان کی ریاستوں کی طرح یہاں کسی وزیر اعلیٰ کو نہیں تھوپا گیا۔[1] والی خود ہی اس کے اپنے الفاظ میں کونسل کا صدر، وزیر اعلیٰ اور حکمران تھا۔ میاں گل جہان زیب کہتے ہیں۔

"درحقیقت ان کے قائم کردہ اس نظام سے کوئی فرق نہیں پڑا۔۔۔۔اس کونسل کے پاس کوئی طاقت نہیں تھی۔ میں انہیں سال میں دو بار جمع کرتا اور انہیں بتاتا کہ کیا کرنا ہے۔ ان میں سے بعض کچھ تجاویز پیش کرتے جن کی اہمیت صرف ان کے گاؤں کے لئے ہوتی۔ میں ایک عمومی انداز میں کہتا ٹھیک ہے یہ میں کردوں گا اور ان سے ہمیشہ کہا کرتا کہ انہیں ریاست کے اجتماعی مفاد اور ضروریات کو ترجیحی بنیاد پر دیکھنا چاہیئے۔ جب کہ دوسرے ہمیشہ میری تعریف کرتے کہ آپ سب کچھ خود ہی تو کرتے ہیں ہمیں مشورہ دینے کی کیا ضرورت ہے۔ پھر جون میں، میں بجٹ پیش کرتا اور ان کے ساتھ اس پر تبادلہ خیال کرتا۔"

1954ء سے قبل تو یہ کٹھ پتلی مشاورتی کونسل بھی موجود نہیں تھی اور حکمران کی من مرضی ہی سب کچھ تھی۔ عملاً تو ضمنی ضابطہ الحاق کے بعد بھی اُس کے اختیارات اور حیثیت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ شروع میں حکمران کے لئے عام لوگوں کے تعاون کو نظرانداز کرنا ممکن نہیں تھا، اس لئے کہ حکومت کے لئے اُسے اُن لوگوں پر انحصار کرنا پڑتا تھا جن کی مدد سے اُسے اقتدار ملا تھا لیکن رفتہ رفتہ میاں گل عبدالودود کے عہد میں حکومت نے مکمل بادشاہت کی شکل اختیار کرلی، جس میں حکمران کی مرضی ہی قانون تھی۔ اس کے اختیارات اور طاقت لامحدود تھی اور افلاطون کے فلسفی بادشاہ کی طرح وہ خود ہر ضابطہ اور قانون سے مبرا تھا۔ وہ جرگوں کے بنائے ہوئے مروج قوانین کو ختم کرسکتا تھا اور ان کی جگہ اپنے قوانین لاسکتا تھا۔ وہ بڑے چھوٹے ہر قسم کے حکام کا تقرر اور برطرفی کرسکتا تھا۔ ریاستی ملازمین صرف اُس کے سامنے جواب دہ تھے۔ ریاست میں اُس کے اختیارات کا مواخذہ نہیں ہوسکتا تھا اور 1954ء تک وہ پاکستانی حکام کی طرف سے اُس پر مسلط کی گئی مشاورتی کونسل کے سامنے بھی جواب دہ نہیں تھا۔ ریاست کے اندر ہر معاملہ میں اُس کا فیصلہ حتمی ہوتا تھا۔

مثال کے طور پر والی کا ایک فرمان یہ تھا کہ اُس کی اجازت کے بغیر اسٹامپ پیپر (جائیداد کی لین دین والی قانونی دستاویز) کو ضبط نہیں کیا جاسکتا تھا۔ کوئی مقدمہ جس کا فیصلہ شرعی قوانین کے تحت کیا گیا ہو، سزا پر نظر ثانی یا خاتمہ کے لئے اُس کی اجازت کے بغیر کسی اور قاضی کے سامنے پیش نہیں کیا جاسکتا تھا۔ کوئی افسر اُس کے حکم کے برعکس حکم نہیں دے سکتا تھا۔ مزید یہ کہ اُس کے کسی حکم کو اُس کی اجازت کے بغیر ختم نہیں کیا جاسکتا تھا۔ خلاف ورزی کرنے والے کی نوکری ختم کی جاسکتی تھی۔

سوات کو ایک مکمل مطلق العنان ریاست میں تبدیل کرنے کے بعد حکمرانوں نے مرکزیت پر مبنی نظام سیاست کو برقرار رکھا۔ درجہ بہ درجہ اختیار و اقتدار کا کوئی مقامی نظام تشکیل دینے میں کوئی دل چسپی نہیں لی۔ مسلسل نیلی

فون رابطوں کے ذریعے وہ کسی علاقہ میں تعینات افسروں کے درمیان طاقت کے توازن کو برقرار رکھتے تھے۔ جب کہ نہ تو کوئی ایسا ادارہ تھا اور نہ فرد جو حکمران کے اختیار کو متوازن رکھنے یا محدود کرنے میں کسی قسم کا کوئی کردار ادا کر سکے۔ اکبر ایس احمد اس کا مشاہدہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ

"دیگر مشرقی مطلق العنان آمریتوں سے اس کا تقابل حاکم وحکومتی فطرت کے تناظر میں کیا جانا چاہیئے۔ سواتی عدالت کو غلو اور صفوی دور کی عدالتوں والی قواعد واصول کی رسمی پابندی اور حوالی پہنچ سے دوری کا مقام بھی حاصل نہ ہو سکا۔ اور (صرف بادشاہ صاحب کی حد تک) انتہائی متحرک، قابل رسائی اور بہت نظر آنے والی شخصیت تھی۔"

یاد رہے کہ سواتی معاشرہ ہندوستان اور ایران کے دیگر معاشروں سے مختلف تھا۔ سوات کی ریاست اور معاشرہ کی تشکیل ایک تازہ واردات تھی۔ سوات کے باچا صاحب کی بے حد متحرک، قابل رسائی اور ہر جگہ نظر آنے والی شخصیت کے پیچھے دراصل اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل یکتا سواتی معاشرہ میں انہیں اپنی بقا کا سوال درپیش تھا۔ جیسے جیسے ان کی پوزیشن مستحکم ہوتی گئی، ویسے ویسے ہر جگہ پہنچنے کی اُن کی عادت میں کمی آتی گئی۔ سوات کی یکتا خصوصیت اور اُس کی سیاسی قیادت ہی نے حاکم اور رعایا کے درمیان تعلق کو ایک خاص روپ دیا تھا۔

عبدالودود کے عہد میں گو شروع میں تو ایسا کوئی انتظام نہیں تھا لیکن بعد میں برطانوی حکومت سے خط وکتابت کی ذمہ داری ایک سیکرٹری کو سونپ دی گئی۔ اُس کے علاوہ بھی حکمران کی جانب سے جو کام اُس کے حوالے کیا جاتا وہ اُسے سرانجام دیتا۔ بعد میں حکمران کی طرف سے ایک چیف سیکرٹری اور پرائیویٹ سیکرٹری کا تقرر ہوا۔ چیف سیکرٹری پہلے برطانوی حکومت اور بعد میں حکومت پاکستان سے رابطے استوار رکھتا اور دیگر معاملات بھی دیکھتا جو اُس کے حوالے کیے جاتے۔ پرائیویٹ سیکرٹری حکمران کی ذاتی خط وکتابت کا کام سنبھالتا اور مزید جو بھی اُسے کرنے کو کہا جاتا۔

جہان زیب کے عہد میں ڈپٹی سیکرٹری اور اسسٹنٹ سیکرٹری مع افسر اطلاعات کے نئے عہدے بنائے گئے۔ ان کا کام پرائیویٹ سیکرٹری کو نجی خط وکتابت سنبھالنے، تعلیم، صحت اور ریاستی ملکیت سوات ہوٹل کے معاملات میں مدد فراہم کرنا تھی۔ مزید برآں ان سب کے ذریعہ حکمران گاڑیوں کو لائسنس کے اجرا اور رجسٹریشن کرنے والے اداروں کی نگرانی بھی کرتا۔ حکمران شعبۂ اطلاعات پر اسسٹنٹ سیکرٹری مع افسر اطلاعات کے ذریعہ نظر رکھتا۔ چیف سیکرٹری کی مدد کے لئے بھی اُس کے دفتر میں ایک نائب سیکرٹری کا تقرر کر دیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ سیکرٹریٹ میں محکمہ انصاف کا ایک سربراہ ہوتا تھا۔ شروع میں یہ عہدہ حاکم اعلیٰ پھر حاکم اعلیٰ دفتر حضور، بعد میں اُس کو مشیر کے عہدہ پر ترقی دے دی گئی۔

مزے کی بات یہ ہے کہ مخبری کا کوئی باقاعدہ خفیہ ادارہ موجود نہیں تھا۔ اس کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی گئی

لیکن عبدالودود اور جہان زیب کے کچھ مخبر یہ برحال تھے، جن کی بالعموم نہ تو شہرت اچھی تھی اور نہ ہی خاص حلقوں تک ان کو کوئی رسائی حاصل تھی۔

بادشاہت قائم ہونے کے بعد ایک ولی عہد مقرر کیا گیا۔ 1923ء میں اُس نے اپنے بڑے بیٹے جہان زیب کو ولی عہد مقرر کیا۔ جب 1949ء میں جہان زیب والی بنا تو اُس نے اپنے بڑے بیٹے میاں گل اورنگ زیب کو ولی عہد مقرر کیا۔

ولی عہد حکمران کی غیر موجودگی میں اُس کے فرائض سرانجام دیتا۔ ریاست میں اُس کی حیثیت حکمران کے نائب کی سی تھی۔ اُسے انتظامی امور کا تجربہ دلانے کے لئے نیک پی خیل اور شموزئی علاقہ کے انتظامی معاملات سپرد کردیئے گئے۔ دارالحکومت میں اُس کا علاحدہ دفتر اور عملہ تھا، جہاں وہ اپنے دائرہ اختیار میں لوگوں کی دادرسی کرتا اور متعلقہ تحصیل دار یا حاکم کے فیصلوں کے خلاف اپیلوں کی سماعت کرتا۔ حتمی فیصلہ کا اختیار اُسے حاصل نہیں تھا۔ اُس کے فیصلوں کے خلاف اپیل کرنے کا حق ہر فریق کو حاصل تھا۔ حتمی فیصلہ حکمران ہی کا ہوتا تھا۔ کسی سرکاری ملازم کو برطرف کرنے کا اختیار بھی اُسے حاصل نہیں تھا۔ ایسا وہ صرف اس صورت میں کرسکتا تھا جب وہ حکمران کی غیر موجودگی میں اُس کے فرائض منصبی انجام دے رہا ہوتا۔ اس سلسلہ میں سوات زیریں کے مشیر تاج محمد خان زیب سر کی مثال موجود ہے۔ اُسے کسی کے تقرر کا اختیار حاصل نہیں تھا۔ موجود معلومات کی بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ حکمران اور ولی عہد کے درمیان امورِ مملکت چلانے کے سلسلہ میں تعلقات کبھی اچھے نہ رہے۔ میاں گل اورنگ زیب یوں تو ان افواہوں کی تردید کرتے ہیں اور اپنے معاملہ میں وہ کہتے ہیں 'نہیں نہیں، یہ سچ نہیں ہے' لیکن ان کی اس بات سے اس خیال کو تقویت بھی ملتی ہے کہ 'اختلافِ رائے تو بہرحال ہوتا ہی ہے'۔

انتظامی حکام

نظامِ حکومت سنبھالنے کے بعد عبدالودود نے حضرت علی کو اپنا وزیر مقرر کیا۔ ابتدائی طور پر ان مرکزی حکام میں سب سے اعلیٰ مرتبہ حضرت علی (وزیر) اور سپہ سالار (کمانڈر ان چیف) احمد علی (حضرت علی کے بھائی) کا تھا۔ 1940ء میں اُس وقت حضرت علی کو وزیر اعظم اور احمد علی کو وزیر بنا دیا گیا جب کہ کمانڈر ان چیف کا عہدہ ولی عہد کو سونپا گیا۔

1943ء میں وزیر برادران کے استعفوں کے بعد وزیر اعظم کا عہدہ ختم کر دیا گیا اور نئی اسامیاں اور عہدے بنائے گئے جو یہ تھے۔ وزیر ملک (وزیر مملکت)، وزیر مال (وزیر خزانہ) اور سپہ سالار۔ یہ حکام ریاست کے انتظامی

اُمور میں حکمران کی مدد کرتے تھے اور یہ اپنے اپنے محکموں کے سربراہ تھے۔ انہیں مختلف سب ڈویژنوں کی دیکھ بھال کی ذمہ داری بھی سونپی گئی تھی اور یہ اپنے متعلقہ انتظامی علاقوں کے انچارج ہوتے تھے' تاکہ انتظامی اُمور کو جلدی اور اچھی طرح سے نمٹایا جا سکے'۔

انتظامی عہدے مستقل نہیں ہوتے تھے بلکہ ان کا دارومدار حکمران کی صوابدید پر تھا۔ اور وہ مسلسل ان میں تبدیلیاں کرتا رہتا تھا۔ مثال کے طور پر میاں گل جہان زیب نے

''مشیر ملک (انتظامی مشیر) اور مشیر مال (مشیر مالیات) کے عہدے بنائے۔ پھر ان ناموں کو بالترتیب وزیر ملک (وزیر مملکت) اور وزیر مال (وزیر خزانہ) کے نام دے دیئے۔ پھر ان میں پہلے کو ختم کر کے تین سادہ مشیر مقرر کئے گئے۔ کچھ عرصہ تک یہ عہدے برقرار رہے۔ پھر ان کی جگہ وزیر ملک نے لی۔ ان کے علاوہ 1957ء میں والی کی مدد کے لئے دو نائب وزیر (ڈپٹی منسٹر) مقرر ہوئے۔''

1960ء کے ایک شاہی فرمان پر دو نائب وزیروں، سپہ سالار اور وزیر ملک کے دستخط موجود ہیں، جو کہ ریاست کے سرکاری ریکارڈ کا حصہ ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ کوئی وزیر ایک دن میں دو سے زیادہ معاملات میرے سامنے پیش نہیں کرے گا۔ حکم عدولی کی صورت میں اگر میں اُسے جرمانہ کروں تو وہ اُسے بہت زیادہ محسوس نہیں کرے گا۔

1966ء میں ایک نئے وزیر یعنی وزیر منصفان، تین مشیروں اور وزیر مال اور وزیر ملک کا ذکر ہے۔ ان کے دائرہ اختیار میں آنے والے علاقے مندرجہ ذیل ہیں۔

1 وزیر منصفان: حاکمی چکیسر، حاکمی پورن۔
2 وزیر مال: چارباغ، بریکوٹ
3 وزیر ملک: حاکمی بحرین، حاکمی چپن۔
4 محمد مجید خان مشیر: اکا معروف بامی خیل، نیکپی خیل، عزی خیل، فتح پور، شموزئی۔
5 کشور خان مشیر: حاکمی سوات بالا، حاکمی الپوری۔
6 تاج محمد خان مشیر: حاکمی بونیر، طوطالئی، ابا خیل، نیکت خیل۔

1958-59ء میں اعلیٰ عہدوں پر یہ متمکن تھے: وزیر ملک، سپہ سالار، وزیر مال اور دو نائب وزیر (ایک سینئر نائب وزیر اور دوسرا جونیئر نائب وزیر کہلاتا تھا)۔ ان کے دائرہ اختیار میں آنے والے علاقے درجہ ذیل ہیں۔

1 وزیر ملک: بریکوٹ، ڈیر، جگ شوئی، کرمگ، کندیا نیکپی خیل، چپن، رانولیا، سیو اور شموزئی کی تحصیلیں۔
2 سپہ سالار: سوات بالا، بشام، چکیسر، مارتونگ اور پورن کی تحصیلیں۔
3 سینئر نائب وزیر: بابوزئی، پیخترزئی، مٹہ، چارباغ، ڈگر، گدیزی، کاگرہ، اور سلارزئی کی تحصیلیں۔
4 جونیئر نائب وزیر: الپوری، بحرین، کالام، کانزا، خوازہ خیلہ، لیلونئی، مدین، فتح پور، سیدو شریف اور طوطالئی۔

وزیر مال کے دائرۂ اختیار کے علاقوں کا کوئی ذکر موجود نہیں۔

ضلعی محافظ خانہ میں اُس دور کے محفوظ رجسٹروں میں مندرجہ ذیل اسٹامپ موجود ہیں۔ بانی ریاست سوات: حکمران ریاست سوات: ولی عہد ریاست سوات: فاتح الملک خان بہادر وزیرِاعظم ریاستِ سوات: وزیر ملک ریاستِ سوات: وزیر مال ریاستِ سوات: سپہ سالار ریاست سوات: وزیر منصفان ریاست سوات: نائب وزیر ریاست سوات: مشیر ملک ریاستِ سوات: مشیر مال ریاست سوات: نائب سالار ریاست سوات: مشیر ریاست سوات: مشیر سوات: مشیر برسوات: مشیر کوزسوات: نائب مشیر ریاست سوات: نائب مشیر دفتر ہزہائی نس حکمران سوات: نائب مشیر بابوزئی سوات: حاکم اعلیٰ دفتر حضور: حاکم اعلیٰ تحصیل بابوزئی: حاکم کوزسوات: حاکم اعلیٰ کبل نیک پی خیل۔

بعض اوقات ایک ہی شخص کے مختلف القاب والے اسٹامپوں پر دستخط ہوتے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ ذمہ داریاں اور القاب مسلسل بدلتے رہتے تھے۔ حکام کی تعداد موجود اسٹامپوں سے کہیں کم تھی۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مستقل عہدے نہیں ہوتے تھے بلکہ ہر چیز کا دارمدار حکمران کی خواہش اور ترنگ پر تھا۔

ریاست کے اعلیٰ مناصب پر فائز حکام کو ریاست کے مختلف علاقے سونپے گئے تھے۔ ان سب کے دفاتر یدوشریف میں تھے اور یہ سب حکمران اور ولی عہد کے ماتحت تھے لیکن وہ صرف حکمران کے آگے جواب دہ تھے۔ ان کا ابتدائی اور مرافعہ دائرۂ اختیار حکمران کے تحت تھا۔

انتظامی تقسیم

عبدالودود کے دورِ حکومت کے شروع میں سوات انتظامی لحاظ سے پانچ اضلاع میں تقسیم تھا (جنہیں حاکمی کہا جاتا تھا) اور ہر ضلع ایک حاکم کے ماتحت تھا۔ ریاست میں 25 تحصیلیں تھیں اور ہر تحصیل تحصیل دار کے ماتحت ہوتا تھا۔ یہ انتظامی تقسیم بالعموم قبائلی بنیادوں پر تھی اور اسے مرکز سے حاکموں اور تحصیل داروں کے ذریعے چلایا جاتا تھا۔ حاکمیوں کی تعداد سات، آٹھ، نو، دس اور گیارہ بتائی گئی ہے۔ جب کہ تحصیلوں کی تعداد حکمران کے ایک فرمان کے مطابق 30 بتائی گئی ہے۔ تاہم مختلف مصنفوں نے اسے 33، 35 اور 32 بھی بتایا ہے۔

تحصیل کا حاکم اعلیٰ یا تحصیل دار ہوتا تھا یا حاکم۔ ریاست کی سب سے چھوٹی اکائی تحصیل ہوتی تھی اور تحصیل دار اس کا انتظامی مع عدالتی مع عمل درآمد کا ضامن، اور افسر مالیات ہوتا تھا۔ حاکمی ایک بڑی اکائی ہوتی تھی اور حاکم اس کا انتظامی مع عدالتی مع عمل درآمد کا ضامن اور افسر مالیات ہوتا تھا۔ حاکم کا رتبہ تحصیل دار سے بڑا ہوتا تھا۔

وسیع الرقبہ تحصیل جیسے کبل پر تحصیل دار کی جگہ حاکم کا تقرر کیا جاتا تھا۔ اس صورت میں اُس تحصیل کو حاکمی کہا

جاتا تھا۔ یا اُسے کسی چھوٹی تحصیل میں تعینات کر دیا جاتا جہاں کا وہ انچارج ہوتا اور اُس کی حاکمی میں شامل دیگر تحصیلوں اور تحصیل داروں کے لئے وہ قریب ترین افسرِ اعلیٰ کے فرائض سرانجام دیتا۔ ایسا حاکم جس کے دائرہ اختیار میں ایک سے زیادہ تحصیلیں ہوتیں، تو وہاں وہ اُن تحصیل داروں کے فیصلوں کے خلاف اپیلوں کی سماعت بھی کرتا جو اُس کے دائرہ اختیار میں آتے تھے۔

حاکم اعلیٰ دفترِ حضور کا حوالہ بھی ملتا ہے۔ وہ مرکزی سیکرٹریٹ میں محکمہ عدل کا سربراہ ہوتا تھا۔ والی کے ایک فرمان کے مطابق سیف الملوک حاکم اعلیٰ کا تقرر کر کے (جو کہ حاکم اعلیٰ دفترِ حضور تھا) اُن چھ افسران میں شامل کیا گیا جو کہ والی کی غیر موجودگی میں مقدمات کا فیصلہ کر سکتے تھے۔ ایسے ہی حوالے حاکم اعلیٰ بابوزئی اور حاکم اعلیٰ کبل/نیک پی خیل کے بارے میں بھی ملتے ہیں۔ تمام دیگر حکام کی طرح تحصیل دار اور حاکم کا تقرر بھی حکمران کرتا تھا۔ وہ صرف اُس کے سامنے جواب دہ تھے اور حکمران کی تائید و مرضی پر اُن کے عہدوں کا دارومدار تھا اور اکثر اُن کا تبادلہ ہوتا رہتا تھا۔

حکمران ہی کی طرح تحصیل دار اور حاکم کی اپنے دائرہ اختیار میں مختلف النوع ذمہ داریاں تھیں۔ انتظامی، عدالتی اور مالی قسم کے امور انہیں نمٹانے پڑتے تھے۔ ان کے فرائض منصبی میں یہ شامل تھا کہ وہ حکمران اور دیگر حکام بالا کے فرامین پر مکمل عمل درآمد کو یقینی بنائیں، توانین کی پاسداری کرائیں اور حکمران خاندان کے خلاف کسی سرگرمی یا سازش کا بروقت سدباب کریں۔ وہ اپنے دائرہ اختیار میں لوگوں کے دیوانی اور فوجداری دونوں قسم کے مقدمات سننے کے مجاز تھے۔ وہ ریاستی محصولات جیسے عشر جمع کرنے کا کام بذریعہ نیلامی کسی کو تفویض کرتے۔ پھر اس بات کو یقینی بناتے کہ عشر کو صحیح طریقے سے جمع کیا گیا ہے اور اُس کی پوری صحیح مقدار ریاست کے خزانہ میں جمع کر دی گئی ہے۔ اس طرح اپنے دائرہ اختیار میں شامل سرکاری ملازمین جیسے اساتذہ، ڈاکٹروں اور فوجیوں کو تنخواہیں دیتے اور آمدنی اور ادائیگیوں کا حساب کتاب رکھتے۔

وہ زیرِ تعمیر سرکاری کاموں و منصوبوں جیسے پلوں اور سرکاری عمارتوں کا معائنہ کرتے۔ اگر وہ جگہ تحصیل ہیڈ کوارٹر سے دو میل تک کے فاصلہ پر ہوتی تو اُن پر اُس کا روزانہ معائنہ لازم تھا۔ اگر پانچ میل تک کا فاصلہ ہوتا تو ہفتہ وار معائنہ اُن پر لازم تھا تاکہ اس بات کو یقینی بنایا جا سکے کہ کام صحیح طریقہ سے ہو رہا ہے۔ کسی قسم کے نقص اور خامی کا ذمہ دار تحصیل دار اور حاکم، نائب سالار اور ناخود کپتان ہوتا تھا۔ جائیداد کے لین دین کے کاغذات اور نکاح ناموں پر دستخط کرنا اور اُن کا ریکارڈ رکھنا بھی اُن کے فرائض میں شامل تھا۔ حکمران کے فرامین کی تعمیل اُن پر ہر گھڑی لازم تھی۔

انتظامی عہدوں کے لئے بالعموم مشہور، بااثر اور وفادار خاندانوں کے افراد کو چنا جاتا تاکہ عام لوگ اُن کی عزت کریں۔ والی کے اپنے الفاظ میں یہ سارے عہدے 'سیاسی نوعیت' کے تھے اس لئے ان تقرریوں میں سیاسی

عوامل کو مدنظر رکھنا لازم تھا۔ حکمران کی جانب سے برطرف کیے جانے کا خطرہ ہر وقت اُن پر منڈلاتا رہتا تھا۔ اس بات کا دعویٰ کیا جاتا ہے کہ تحصیل دار اور حاکم رشوت لینے یا ممنوعہ تحائف قبول کرنے یا کسی جرم کے الزام میں برطرف کر دیئے جاتے ہیں۔ 'بہر صورت رشوت ستانی عام تھی، جس کا خود والی کو بھی علم تھا۔ جس کا خود اُس نے بھی اعتراف کیا ہے بشرطیکہ آدمی بین السطور میں موجود حقیقت پڑھ سکتا ہو۔

1960ء سے قبل سرکاری ملازمین کو کسی قسم کا صلہ خدمات یا پنشن وغیرہ نہیں ملتی تھی لیکن جون 1960ء میں اعلان کیا گیا کہ آئندہ اگست سے سرکاری ملازمین کو یہ سہولت دے دی جائے گی۔ پندرہ سال تک ملازمت کرنے والے اس اسکیم سے مستفید ہونے کے حق دار ہوں گے۔ انہیں ہر سال پر ایک بنیادی تنخواہ کے مساوی رقم دی جائے گی لیکن اس ضمن میں دی جانے والی رقم 20 مہینوں کی بنیادی تنخواہ سے زیادہ نہیں ہوگی۔ وہ لوگ جو پندرہ سال ملازمت کے باوجود اس کے حق دار نہیں ہوں گے اُن کے نام بھی دیئے ہوئے ہیں۔

جیل

ریاست میں سیدو شریف کے مقام پر ایک مرکزی جیل تھی اور ہر تحصیل، قلعہ اور تھانہ میں بھی ایک جیل ہوتی تھی۔ جیلوں کے حالات بدترین ہوتے تھے۔ ملزمان کے ساتھ انتہائی برا سلوک ہوتا۔ خوراک کم مقدار اور کم معیار جب کہ غسل خانہ کی سہولت نہ ہونے کے برابر تھی۔ ابتدائی زمانے میں قیدیوں کے ساتھ ایک انتہائی غیر انسانی سلوک یہ بھی کیا جاتا کہ اُن کا ایک پاؤں کسی بڑی لکڑی میں سوراخ کر کے اُس میں بند کر دیا جاتا۔ زیادہ سخت مجرموں اور اسی طرح سیاسی مجرموں کے دونوں پاؤں میں بیڑیاں ڈالی جاتیں۔ اسے کونده کہا جاتا۔

ایک بار جیل معائنے کے دوران نیک پی خیل شاہ ڈھیرئی کے ایک قیدی قاضی مرتضیٰ نے جیل کے برے حالات اور خراب خوراک کے بارے میں والی سے شکایت کی جرأت کی۔ والی نے اُسے بری طرح مارا پیٹا لیکن بعد میں کسی حد تک ان شکایات کا ازالہ کر دیا گیا۔ 1966ء میں گگرئ کے علی حیدر نے جیل کی خوراک کے پست ترین معیار، غسل خانوں، ٹائلٹ اور صحت سے متعلق سہولتوں کی کمی کے بارے میں جیل سے خط لکھا۔ اس کے بعد حالات کو بہتر بنانے کے سلسلہ میں تھوڑی بہت کوشش کی گئی۔ تھانہ اور قلعہ جیلوں میں قید ملزموں کی خوراک کا انتظام اُن لوگوں کو کرنا پڑتا تھا جن کی شکایت پر انہیں قید کیا گیا تھا۔

مجرموں سے جیل کے باہر جسمانی مشقت کرائی جاتی تھی، لیکن مراعات یافتہ خاندانوں کے افراد سے صرف اسپتالوں یا سرکاری جگہوں کی صفائی ستھرائی کا کام لیا جاتا تھا جب کہ عام مجرموں سے پتھر ڈھونے جیسا سخت کام لیا جاتا

تھا یا اُن سے پتھروں کی کان کنی کرائی جاتی۔ میاں گل جہان زیب نے سیدو شریف میں جیل کی ایک نئی عمارت بنوائی اور کچھ اصلاحات متعارف کرائے۔ یہ فرمان جاری کیا گیا کہ قیدی کو ایک ہفتہ سے زیادہ تھانہ میں نہیں رکھا جاسکتا تھا اور جسے ایک ہفتہ سے زیادہ قید کی سزا ہوجاتی اُسے مرکزی جیل منتقل کرنا لازمی تھا۔ نومبر 1964ء کے بعد سے قیدیوں کو بجرائی ذقید (تخفیف قید) کے نام سے 40 روپے ماہانہ دیئے جاتے تھے۔

فوجی انتظامیہ

کسی ریاست کے دفاع اور استحکام کے لئے فوج کا ہونا ضروری ہے۔ ریاست سوات اس ضرورت سے مستثنیٰ نہیں تھی۔ گرد و پیش میں دشمن ریاستوں اور اندرون خانہ مضبوط ناراض عناصر کی وجہ سے ریاست سوات کی صورت حال اس ضمن میں زیادہ نازک تھی۔ اس کے لئے اچھی فوج رکھنا لازم تھا۔

ریاست سوات کی تشکیل کا فوری سبب نواب دیر کی ظالمانہ حکمو‌ی سے نجات حاصل کرنے کی شدید خواہش تھی۔ بیرونی دشمنوں کے ناپاک عزائم کی توڑ کرنے اور داخلی ناراض عناصر کو قابو میں رکھنے کے لئے ایک بڑی مضبوط فوج کی تشکیل ضروری تھی۔ روایتی قسم کے لشکر ایک منظم مضبوط فوج کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ تاہم اُس وقت کی فوری ضروریات پوری کرنے کے لئے ریاستی فوج کے ساتھ ساتھ اس روایتی نظام کو بھی جاری رکھا گیا۔ آخری والئی سوات نے اس سلسلہ میں کہا۔

> ''دیر اور امب سے جنگوں کے لئے لوگوں کے لشکر بنانا اور اُس کے ساتھ ساتھ عشر ادا کرنا ضروری تھا تا کہ ریاست اور اُس کی ملیشیا کی مدد کی جا سکے۔ زمین کے ہر دو حصوں کے بدلہ میں انہیں اپنے خان کی قیادت میں لڑنے کے لئے ایک مسلح آدمی مہیا کرنا ہوتا تھا۔ جب وہ جنگ کے لئے کسی لشکر کا حصہ بنتا تو اُسے خوراک اور کارتوسوں کے اخراجات خود پورے کرنے پڑتے۔ جب لشکر حرکت میں نہ ہوتا تو وہ خان یا ملک کے رحم و کرم پر ہوتا۔ اس لئے میرے باپ نے اس نظام کو ختم کر کے ملیشیا کی تعداد میں اضافہ کا فیصلہ کیا۔ یہ ایک قسم کا بیگار یا جبری مشقت تھی۔ جب لوگوں میں درشتگی اور کرختگی ختم ہوگئی تو وہ لشکروں میں شامل ہونے سے کترانے لگے۔ پھر یہ بھی تھا کہ ان افراد کا اختیار ریاست کی جگہ ملک کے پاس ہوتا تھا۔''

اسی لئے آہستہ آہستہ لشکر کا نظام ترک کر کے فوج کی تعداد میں اضافہ کیا گیا۔

تنظیمی ڈھانچہ

مسلح افواج کا سالار اعظم تو حکمران خود ہوتا تھا لیکن افواج کی فوری کمان سپہ سالار کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔ اُسے عدالتی اور انتظامی فرائض سے بھی عہدہ برآ ہونا ہوتا تھا۔ اقتدار میں آنے کے فوراً بعد تو عبدالودود نے اپنے حقیقی

تیرین جان کو سپہ سالار بنایا لیکن 1918ء میں اُس کی موت کے بعد شہری اور فوجی انتظامیہ دونوں کا سربراہ وزیر حضرت علی کو بنایا گیا۔ پھر فوجی انتظامیہ کی ازسرنو تنظیم اور اصلاح کے مدنظر وزیر کے بھائی احمد علی کو سپہ سالار مقرر کیا گیا۔

مسلح افواج کی تنظیم یوں کی گئی تھی۔ ہر پندرہ سپاہیوں کے اوپر ایک افسر ہوتا تھا جسے جمعدار کہتے تھے۔ پانچ جمعداروں کے اوپر ایک صوبیدار ہوتا تھا۔ 5 صوبیدار ایک صوبیدار میجر کے ماتحت ہوتے تھے۔ دو صوبیدار میجروں کے اوپر ایک کپتان ہوتا تھا۔ 1957ء سے پہلے کپتان کو کمان افسر کہا جاتا تھا۔ ہر چودہ فوجیوں کے اوپر ایک حوالدار بھی ہوتا تھا جو جمعدار کے ماتحت ہوتا۔ ان کے بعد دو نائب سالار اور ایک سپہ سالار ہوتا جس کی حیثیت ایک وزیر دفاع اور کمانڈر ان چیف جیسی ہوتی۔ یہ سب کے سب حکمران کے ماتحت ہوتے تھے جس کی حیثیت ایک سالارِ اعظم کی سی تھی اور صرف وہ افواج کو کوچ کرنے کا حکم دے سکتا تھا۔

سپاہی سے لے کر سپہ سالار تک تقرر، ترقی اور برطرفی کا اختیار صرف حکمران کے پاس تھا۔ اس کا انحصار اُس کی صوابدید پر تھا۔ 1958ء میں اعلان ہوا کہ جس کسی نے اپنے موجودہ عہدہ میں دو سال نہ گذارے ہوں اُسے ترقی کے لئے حکمران کے پاس پیش نہ کیا جائے۔ عبدالغفور قاسمی کا کہنا ہے کہ ہر پلاٹون میں آٹھ سو سپاہی، چالیس حوالدار، چالیس جمعدار، آٹھ صوبیدار اور دو صوبیدار میجر ہوتے تھے۔ پلاٹون کا سب سے اعلیٰ افسر کمان افسر (کمانڈنگ افسر) کہلاتا تھا۔ بعد میں اُسے کپتان کہا جانے لگا۔

شروع میں جمعدار کے تحت 17 سپاہی ہوتے تھے۔ اُن میں سترھواں حوالدار ہوتا تھا۔ اور اس اکائی کو سوکی کہا جاتا تھا۔ بعد میں اس کی تعداد میں کمی کر کے اسے 16 کر دیا گیا۔ سولھواں جمعدار اور پندرھواں حوالدار ہوتا تھا باقی عام سپاہی ہوتے تھے۔

مسلح افواج

مسلح افواج میں دو قسم کے فوجی ہوتے تھے۔ ایک باقاعدہ اور ایک ریزرو (آئندہ کسی مقصد کے لئے محاذ سے دور رکھی گئی فوج)۔ باقاعدہ فوج کو تو اُجرت ملتی تھی لیکن ریزرو فوجیوں کو کچھ نہیں ملتا تھا، اس وقت بھی جب وہ عملاً جنگ میں شامل ہوتے تھے۔ ان کے نام ریاست کے پاس لکھے ہوتے تھے اور ناگہانی کی صورت میں انہیں طلب کیا جاتا تھا۔ ان کی کل تعداد پندرہ سو کے لگ بھگ تھی۔ اُن میں سب سے بڑا افسر صوبیدار ہوتا تھا۔ وہ باقاعدہ فوج کے سپہ سالار کے تحت خدمات انجام دیتے تھے۔ وہی ان کی بھرتی اور ان کے طرزِ عمل کے قواعد و ضوابط بناتا تھا۔ طلب کئے

جانے پر اُن کا واحد کام ریاست کے دفاع کے لئے جنگ میں شریک ہونا تھا۔ اپنے لئے اسلحہ اور گولہ بارود وہ خود خریدتے تھے، البتہ انہیں دورانِ جنگ راشن دیا جاتا تھا۔ نمایاں کارکردگی پر انعام میں انہیں رائفل ملتی تھی اور باقاعدہ فوج کے برعکس وہ جسمانی مشقت سے مستثنیٰ ہوتے تھے۔

شروع میں باقاعدہ فوج صرف پیادہ اور سوار دستوں پر مشتمل تھی لیکن بعد میں توپ خانہ، مشین گن، سگنل رجمنٹ اور حکمران کے لئے ذاتی حفاظتی دستہ کو بھی اس کا حصہ بنا دیا گیا۔ ابتدائی برسوں میں گھڑسوار دستوں کو اپنی صلاحیت اور سریع الحرکت ہونے کی وجہ سے سب سے مؤثر اور اہم سمجھا جاتا تھا۔ اس کو ترقی دی گئی اور اس کی تعداد میں اتنی جلد اضافہ کیا گیا کہ عبدالودود کے اقتدار کے دوسرے سال میں ان کی تعداد 700 تک پہنچ گئی۔ جب پڑوسی ریاستوں اور اندرونی مخالفین سے خطرہ کم ہو گیا اور سڑکوں کی حالت بہتر ہوئی تو ان کی اہمیت کم ہوتی چلی گئی۔ شروع میں ان کی تعداد کم کر دی گئی اور پھر آخری والی کے عہد میں 1950ء کی دہائی میں انہیں بالکل ختم کر دیا گیا۔

باقاعدہ فوج میں تین سو فوجیوں پر مشتمل ایک دستہ کو بہرا اردل کہا جاتا تھا۔ اس دستہ اور عام فوجیوں میں یہ فرق تھا کہ انہیں 303 رائفل دی جاتی تھی، جب کہ عام فوجیوں کو سواتی رائفلیں دی جاتی تھیں جو زیادہ قابلِ اعتماد نہیں تھیں۔ توپ خانہ چند بندوقوں، فرسودہ توپوں اور چوڑے دہانے والی چند چھوٹی توپوں پر مشتمل تھا۔ سیدو شریف میں صرف چند مشین گنیں تھیں اور ان کی حفاظت اور استعمال کے لئے خاص تربیت یافتہ لوگ رکھے گئے تھے۔ سگنل کور، شیشہ کہا جاتا تھا۔ تربیت یافتہ اور تجربہ کار لوگ اس رجمنٹ میں خدمات انجام دیتے تھے۔ یہ مختلف مہموں میں فوج کے ساتھ ہوتے تھے۔

100 یا اس کے قریب افراد پر مشتمل والی کے ذاتی حفاظتی دستہ کو اردلِ حضور کہا جاتا تھا۔ باری باری آدھ دستہ ہفتہ وار ڈیوٹی دیتا تھا۔ ان کے اپنے جمعدار، صوبیدار اور دو کپتان تھے۔ کپتانوں کی بھی باری باری ہفتہ وار ڈیوٹی ہوتی۔ وہ ریاست کے اندر اور باہر والی کے ہمراہ رہتے۔ حضور اردل یا اردلِ حضور کے فرائض میں والی کی رہائش گاہ اور دفتر کی حفاظت کرنا بھی تھی۔ باقاعدہ فوج کے برخلاف انہیں ریاست سے یونی فارم، جوتے اور پکا ہوا کھانا ملتا تھا۔ چوں کہ والی کے حفاظتی دستہ میں شمولیت کو اعزاز سمجھا جاتا تھا، اس لئے معزز خاندانوں کے افراد کو اس میں بھرتی کیا جاتا تھا۔

ابتدا میں ریاستی افواج کا کوئی مخصوص یونی فارم نہیں تھا۔ 1940ء میں ولی عہد نے خاکی یونیفارم اور پشاوری چپل کو یونیفارم بنا دیا۔ بعد میں اسے فائنل کر دیا گیا۔ نومبر 1960ء میں ملیشیا اور پولیس میں شامل سب پر یہ لازم کر دیا گیا کہ وہ پریڈ کی مخصوص چال میں چلنا سیکھیں ورنہ انہیں نوکری سے برخواست کر دیا جائے گا۔

مسلح افواج کے فرائض

افواج کا اصل فریضہ تو ریاست کا دفاع کرنا تھا لیکن زمانہ امن میں انہیں صرف روٹیاں توڑنے کی بجائے دیگر کاموں جیسے سڑکوں، اسکولوں اور پلوں کی تعمیر پر لگادیا جاتا تھا۔ اس کے پیچھے یہ خیال تھا کہ بے کار بیٹھ کر اُن کی سخت جانی میں کمی آ جائے گی۔ اُن کے لئے یہ عوامی بھلائی کے کام زیادہ مشقت طلب نہیں تھے۔ سال میں صرف دو مہینے انہیں دینے پڑتے تھے۔ یہ یک وقت انہیں صرف دس دن کام کرنا پڑتا تھا۔ اس طرح انہیں اپنی زمینوں کی دیکھ بھال اور دیگر خانگی کاموں کے لئے بھی پورا وقت مل جاتا تھا اوران کے گھر والوں کو بھی طویل وقفوں کے لئے ان کی دوری کا عذاب نہیں جھیلنا پڑتا تھا۔' علاوہ ازیں انہیں اپنے افسروں کی معیت میں کام کرنے کی وجہ سے نظم و نسق کا سبق یاد رہتا تھا۔'

اپنے ایک فرمان میں والی نے عام سپاہیوں اور حوالداروں کو دکان داری کرنے ٹیکسی چلانے اور تانگے چلانے کی اجازت دے دی تھی۔ جمعدار اور اس سے اوپر کے افسران کو ایسا کرنے کی اجازت نہیں تھی تاکہ اُن کا رعب و دبدبہ برقرار رہے۔ وہ ان تمام چیزوں کے مالک ہو سکتے تھے لیکن انہیں خود چلا نہیں سکتے تھے۔ وہ اُجرت پر کسی اور کی خدمات حاصل کر سکتے تھے۔

تنخواہیں اور اُجرتیں

ابتداء میں فوج کو تنخواہ سال میں دو بار بڑی فصلوں کے موقع پر جنس کی شکل میں ملتی تھی۔ سپاہی کو 14 من مکئی اور 4 من گندم، حوالدار کو 16 من مکئی اور 5 من گندم، جمعدار کو 20 من مکئی اور 6 من گندم، صوبیدار کو 40 من مکئی اور 10 من گندم، صوبیدار میجر کو 80 من مکئی اور 20 من گندم اور کمان افسر کو 120 من مکئی اور 30 من گندم بطور تنخواہ ملتی تھی۔ بعد میں عام سپاہیوں، حوالداروں، جمعداروں اور صوبیداروں کو تنخواہ دینے کا یہی طریقہ کار جاری رہا جب کہ صوبیدار سے اوپر کے افسران کو ماہانہ بنیادوں پر رقم کی شکل میں تنخواہ ملنے لگی۔ بعض صوبیداروں کو بھی ماہانہ تنخواہ دی جانے لگی۔

1950ء کی دہائی میں سپاہی کو سالانہ 18 من، جمعدار کو 25 من اور صوبیدار کو 50 من غلہ دیا جاتا تھا۔ موسم گرما کی فصل کے مقابلہ میں موسم سرما کی فصل میں سے زیادہ حصہ ملتا تھا۔ صوبیدار میجر کو 120 روپے، کپتان کو 180 روپے، نائب سالار کو 400 روپے اور سپہ سالار کو 750 روپے ماہانہ تنخواہ ملتی تھی۔ بعد میں ان میں اضافہ کیا گیا۔ اباسین کوہستان سے تعلق رکھنے والے فوجیوں کو وہاں موسم گرما کی فصل نہ ہونے کی وجہ سے موسم گرما میں کچھ نہیں

ملتا تھا۔ اس کی تلافی موسم سرما کی فصل کے موقع پر کر دی جاتی تھی۔ والی کے ایک فرمان کے مطابق یکم ستمبر 1962ء سے کپتان کو 230 روپے اور صوبیدار میجر کو 135 روپے ماہانہ تنخواہ ملا کرے گی۔ 1960ء تک مسلح افواج کو صلہ خدمات یا پنشن دینے کی کوئی روایت موجود نہیں تھی۔ البتہ ریٹائر ہونے والے کا نامزد کردہ کوئی قریبی رشتہ دار اس کی جگہ حکمران کی صوابدید پر ریاستی ملیشیا میں بھرتی کر لیا جاتا۔ تاجونو کے مطابق 1960ء کے بعد 20 ماہ کی تنخواہ کے برابر رقم (آخری تین سالوں کی اوسط تنخواہ کے حساب سے) ریٹائرمنٹ پر ادا کر دی جاتی بشرطیکہ اس کی ملازمت کا دورانیہ کم ازکم پندرہ سال ہو۔ اسے کیمٹی کہا جاتا تھا۔ جو لوگ اس فرمان کے اجراء سے دو سال قبل ریٹائر ہونے تھے انہیں بھی یہ سہولت دے دی گئی۔

والی نے اس بات کی پوری طرح صراحت کر دی تھی کہ فوج میں جس نے 20 سال یا اس سے زائد وقت کے لئے خدمات دی ہوں، جس نے 15 سے 19 سال ملازمت کی ہو اور جس نے پندرہ سال سے کم وقت کی ملازمت کی ہو ان کو بالترتیب اس شرح سے ادائیگی کی جائے گی: 400 روپے، 300 روپے اور 20 روپے۔ جس کی مدت ملازمت 15 سال سے کم ہو اور اُس نے رضا کارانہ طور پر ریٹائرمنٹ لی ہو اُسے کچھ بھی نہیں دیا جائے گا۔ بعد میں اس میں کچھ ترامیم کی گئیں جب کپتانوں، صوبیدار میجروں، صوبیداروں، جمعداروں اور حوالداروں کے لئے پوری، آدھی اور ایک چوتھائی کے حساب سے کیمٹی دینا منظور ہوا۔ اس کا انحصار اس بات پر تھا کہ اس کی ریٹائرمنٹ کے وقت اُس کے بیٹے کو کس منصب پر ترقی دی جائے گی۔

باقاعدہ افواج کا سال میں دو بار معائنہ کیا جاتا تھا۔ چند ایک استثنائی صورتوں کے علاوہ فوج کے سارے افسر وسپاہی اپنے گاؤں میں اپنے گھروں میں رہتے تھے۔ بلاوے پر دو مقررہ وقت اور مقررہ جگہ پر پہنچ جاتے تھے۔ ان کی رہائش کے لئے نہ تو بیرکیں تھیں اور نہ ہی کوئی چھاؤنی۔

مسلح افواج کی تعداد

میاں گل عبدالودود ایک بڑی اور مضبوط فوج کی اہمیت سے ناواقف نہیں تھا اس لئے ایک مضبوط گھڑ سوار دستہ کی تشکیل کے لئے اُس نے قرضہ لینے سے احتراز نہیں کیا تاکہ دیر کے مضبوط گھڑ سوار دستہ کا برابری کی بنیاد پر مقابلہ کر سکے۔ 1918ء میں نواب دیر سے ہونے والی دوسری جنگ میں اُس کے پاس صرف 60 افراد پر مشتمل گھڑ سوار دستہ تھا۔ اسے ادین زئی اور شموزئی علاقوں پر دوبارہ قبضہ کے بعد بڑھا کر 700 افراد پر مشتمل دستہ بنا دیا گیا۔ اکتوبر 1923ء کے ایک برطانوی سیاسی رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ میاں گل (عبدالودود) نے حالیہ دنوں

میں اپنے نظامی لشکر میں اضافہ کر کے اس کی تعداد چھ ہزار تک پہنچا دی ہے۔ اور بتایا جاتا ہے کہ وہ پورن، چکیسر اور بونیر کے علاقوں سے تین ہزار اور سوات کوہستان سے ایک ہزار مزید افراد بھرتی کرنا چاہتا ہے۔' میاں گل عبدالودود نے پولیٹیکل ایجنٹ کے نام اپنے ایک طویل خط میں اس اضافہ کی تصدیق کرتے ہوئے بتایا کہ 'دیر اور امب ریاستوں کی جانب سے دوہرے خطرہ کی وجہ سے' اُس کے لئے ایسا کرنا ضروری ہو گیا ہے۔

ہر طرح کی ریاستی افواج (گھڑ سوار اور پیادہ) میں اضافہ کا یہ عمل جاری رہا۔ اس لئے جب دسمبر 1949ء میں میاں گل عبدالودود نے اقتدار میاں گل جہان زیب کو سونپا تو اُس وقت 'ریاستی افواج کی تعداد تیرہ ہزار تھی۔ اس میں مشین گن کمپنی، توپ خانہ، گھڑ سوار دستے شامل تھے....اس کے علاوہ ریزرو فوج بھی موجود تھی۔'

جب بیرونی خطرات ٹل گئے تو گھڑ سوار دستہ ختم کر دیا گیا اور دیگر شعبوں کی تعداد میں کمی کر کے (مختلف بیانات کے مطابق) کل تعداد 9500، قریباً 10000، 8000، قریباً 8500 اور 6000 کر دی گئی۔ پاکستان میں ادغام کے وقت افواج سے متعلق افراد کی کل تعداد 6126 بیان کی جاتی ہے۔ بیرونی خطرات نہ ہونے کے باوجود فوج رکھنے کی توجیہ آخری والئی سوات نے یہ بیان کی ہے کہ 'اس طرح لوگوں کو ایک قسم کی ملازمت فراہم کرنا ایک دانش مندانہ فعل تھا۔ اس کو وہ اپنی عزت افزائی سمجھتے تھے۔ اور اس طرح ریاست کو مفت میں کام کرنے والوں کی اتنی بڑی تعداد میسر تھی۔ جہاں تک افسر طبقہ کا تعلق ہے تو دراصل لوگ جمعدار اور صوبیدار بننا اپنی بڑی عزت افزائی گردانتے تھے۔ خوانین، سیدوں اور میاں برادری سے تعلق رکھنے والوں کو ٹھنڈا رکھنے کا بھی یہ ایک کارگر طریقہ تھا۔'

علاوہ ازیں 'ان کے ہتھیار رکھنے کی وجہ سرکاری ملازمت تھی اور یوں اختیارات کا نشہ بھی پورا ہو جاتا تھا۔' اس معاملہ کا ایک اور اہم پہلو بھی ہے جسے والی نے نظر انداز کیا ہے۔ وہ یہ کہ فوج حکومت کی طاقت کا مظہر تھی۔ عوام کو عوام بنائے رکھنے کے لئے ہر ریاست کو اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ کسی بھی اندرونی خلفشار یا حکمران کے خلاف بغاوت کی سرکوبی کی یہی واحد ضمانت تھی۔

مسلح افواج کو جدید ترین ہتھیاروں سے لیس کرنے کے لئے حکمرانوں نے ہر ضروری قدم اٹھایا اور حتی الامکان اسلحہ بھی ذخیرہ کرتے رہے۔ عبدالودود کو اقتدار حاصل کرنے سے قبل ہی اس بات کا یہ خوبی اندازہ تھا کہ اپنا اسلحہ خانہ لازمی چیز ہے۔ اُس نے کاکا صاحب زیارت کے صاحب شاہ اور اُس کے بیٹے مرفعت شاہ کو اس مقصد کے لئے ملازمت دی کہ وہ اس کے لئے اسلحہ بنائیں گے۔ برطانوی حکومت کے ایک دیسی نائب نے یہ کارخانہ جون 1912ء میں دیکھا۔ اُس کی موجودگی میں مارٹنی ہنری رائفل کا کارتوس بنایا گیا جس کے خول کو آٹھ بار بھرا جا سکتا تھا۔ اپریل 1923ء میں بتایا گیا کہ

''میاں گل (عبدالودود) کی سیدو میں قائم اسلحہ ساز فیکٹری کے بارے میں ایک مختصر نوٹ دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔ یہاں

مارٹینی ہنری کارتوسوں کی روزانہ پیداوار 500 ہے۔ کئی لاکھ کارتوس اُس نے ذخیرہ کر رکھے ہیں۔ وہ اپنا سیاہ رنگ بارود پاؤڈر بنا رہا ہے۔ اور ایچ وی رائفلوں کے لئے سفید پاؤڈر بھی۔ اس کا ایک نمونہ تجربہ کے لئے راولپنڈی اسلحہ خانہ بھیجا جائے گا۔ اُسے توقع ہے کہ ایک ماہ کے اندر اوپر بیان کردہ بندوق کی طرح ایک اور بندوق تیار کر لی جائے گی۔ اُس کی نظامی افواج کا دو تہائی حصہ مارٹینی ہنری رائفل سے مسلح ہے جب کہ بقیہ کے پاس جدید ایچ وی ہتھیار ہیں۔"

اس رپورٹ کے دو سال کے اندر عبدالودود کے سیدو کے کارخانہ میں پانچویں پیچھے سے بھری جانے والی بندوق جس میں بیٹری پیک ہوتی ہے بنالی گئی۔ اس کی آزمائش اطمینان بخش رہی۔ 1927ء میں اپنی جنگی حیثیت کو ریاست دیر کی سطح پر لانے کے لئے عبدالودود نے برطانوی ہند کی حکومت سے درخواست کی کہ اُسے بھی ہندوستان میں اتنا ہی اسلحہ اور گولہ بارود خریدنے کی اجازت دی جائے جتنا کہ نواب دیر نے اس کے اقتدار میں آنے کے وقت سے خریدا ہے۔

قلعے، تھانے اور ان کی نفری

امن وامان قائم رکھنے کے لئے ریاست میں ہر جگہ قلعے تعمیر کئے گئے۔ ہر قلعہ میں صوبیدار یا جمعدار کے زیر قیادت فوجی ہوتے تھے جنہیں قلعہ وال کہا جاتا تھا۔ وہ اپنے خاندانوں کے ہمراہ قلعوں کے اندر رہتے تھے۔ غیر شادی شدہ افراد کو قلعہ میں نوکری کی اجازت نہیں تھی۔

عبدالودود کا مقصد یہ تھا کہ ریاست بھر میں قلعوں کا ایک جال بنا دے، نمایاں اونچی جگہوں یا پہاڑی چوٹیوں پر یہ اتنے فاصلے پر ہوں کہ ایک قلعہ سے دوسرے قلعے کو دیکھا جا سکے اور یہ کہ بلا خوف وخطر ایک دوسرے کی مدد کر سکیں۔ سرحدوں کی حفاظت اور اندرونی خطرات سے نمٹنے کیلئے 80 قلعے تعمیر کئے گئے تھے۔ ان میں خندقیں تھیں، فصیلیں تھیں، رکاوٹیں تھیں، بُرج تھے اور سب کے سب بہت مضبوط بنائے گئے تھے۔ تعداد کے بارے میں اختلاف ہے یہ 68، 73 اور 75 بھی بیان کی گئی ہے۔

ہر قلعہ میں ایک ٹیلی فون ہوتا اور ایک منشی ہوتا جو روزنامچے لکھتا۔ ایک ذمہ دار آزمودہ وفادار صوبیدار یا جمعدار عملہ کا سربراہ ہوتا۔ امن وامان برقرار رکھنا، انتظامی حکام کے احکامات کی تعمیل، چھوٹے موٹے فیصلے کرنا اور سب سے اہم یہ کہ ہر قسم کے انتشار واضطراب کا قلع قمع کرنا اُس کے فرائض میں شامل تھا۔ عملہ کے فرائض میں سرکاری محصول (عشر) اکٹھا کرنے میں اعانت، مجرموں سے حکومتی بقایاجات اور جرمانے وصول کرنا، حکمران اور دیگر حکام کے فرامین عوام تک پہنچانا، اور قرض داروں سے قرض خواہوں کے قرضے وصول کرنا شامل تھا۔

قلعہ کا ادارہ کثیر المقاصد اور کثیر الجہت تھا۔ اس میں تعینات عملہ کی تعداد علاقہ کی ضروریات اور اہمیت کے

لحاظ سے مختلف ہوتی تھیں۔ بدعنوانی کے سد باب اور کارکردگی کی بہتری کے لئے قلعہ کے افسران کا بھی ہر دو یا تین سال بعد تبادلہ کر دیا جاتا جس طرح کہ انتظامی حکام کے کئے جاتے تھے۔ لوگوں کی شکایات بھی اُن کے تبادلہ یا برطرفی کا سبب بن سکتی تھی۔ اس محکمہ کے اعلیٰ افسران 4 میجر اور ایک کمانڈر تھے۔ ہر میجر کے تحت کئی قلعے ہوتے تھے۔ ماتحت افسران کی کارکردگی کی ذمہ داری اُس کی تھی۔ 1958ء تک قلعے بھی سپہ سالار کے ماتحت تھے۔ اس کے بعد انہیں علاحدہ کر کے انہیں ایک کمانڈر کے تحت کر دیا گیا۔ قلعہ کی تمام افواج کا سپاہی سے کمانڈر تک تقرر حکمران کرتا تھا اور اُن کی برطرفی کا اختیار بھی صرف اُس کو تھا۔ قلعہ کے سارے عملہ کو تنخواہ جنس کی شکل میں سال کی دو بڑی فصلوں کے موقع پر دی جاتی تھی۔ حکمران کے ایک فرمان کے مطابق ٹریفک ڈیوٹی دینے والے پولیس کو جرمانے کا پانچ فی صد اور یہ ڈیوٹی سرانجام دینے والے غیر پولیس افراد کو جرمانے کا دس فی صد دینا قرار پایا تھا۔

وقت کے ساتھ ساتھ قلعوں اور تھانوں کی تعداد میں فرق آتا گیا اور مرحلہ وار تھانوں نے قلعوں کی جگہ لے لی۔ تھانہ اور قلعہ میں بنیادی فرق یہ تھا کہ قلعہ میں تعینات سپاہیوں کو قلعہ وال اور ان کے افسروں کو جمعدار اور صوبیدار کہا جاتا تھا جب کہ تھانہ میں متعین سپاہیوں کو پولیس اور افسر کو تھانیدار کہا جانے لگا۔ تاہم ہر تھانہ کا سربراہ تھانیدار نہیں ہوتا تھا۔ اکثر تھانوں کی عمارتیں دو کمروں پر مشتمل تھیں۔ جب کہ قلعے بڑی مضبوط عمارتیں تھیں جن میں سپاہیوں کے خاندان بھی رہائش پذیر ہوتے تھے۔ سب سے اہم بات یہ بھی تھی کہ تھانہ قلعہ کی طرح کثیر المقاصد جگہ نہیں تھی۔ قلعوں اور تھانوں کے عملے کی تعداد بھی مختلف بیان کی گئی ہے یعنی 1825 اور 2000۔ تعداد میں اضافہ ضرورت میں اضافہ کی وجہ سے ہوا ہوگا۔

فریڈرک بارتھ ریاست سوات کی فوجی تنظیم کا بہت واضح انداز میں یوں خلاصہ بیان کرتا ہے۔

"مقامی اور علاقائی بنیاد رکھنے کی وجہ سے اس میں سیاسی تقسیم لازمی تھی اس لئے اس کے افسر اور عام فوجی دھڑے بندی (ڈلہ نظام) سے ہرگز محفوظ نہیں تھے۔ اس چیز نے اس بات کو خارج از امکان بنا دیا تھا کہ ان کو علاحدگی پسندی، بغاوت یا فوجی انقلاب میں استعمال کیا جا سکے۔ مراتب کا دبدبہ، اسلحہ اور فوجی مصروفیات کو ایک ایسی تنظیم کی دل کشی کے لئے ساتھ جوڑ دیا گیا تھا جسے زیادہ تر عوامی بھلائی کے کاموں میں مشغول رکھا جاتا تھا اور جو بیگار کی خدمات سرانجام دینے والا بڑا منظم ادارہ تھا۔ مراتب کی وجہ سے افسران کو اختیار و اقتدار کے ایک جائز استعمال کی سہولت حاصل تھی۔ اور سواتی معاشرہ میں جس شان و شوکت کی بے حد طلب ہے اس سے وہ بھی مل جاتی تھی۔ جب کہ زیادہ تر غریب گھرانوں کو اس فوجی نوکری سے روزی روٹی کے مسائل پر قابو پانے میں قابل قدر سہولت مل جاتی تھی، اس طرح فوج لوگوں کو حکومت کا وفادار رکھنے کا اچھا ذریعہ تھی۔ ایک انتہائی منظم طریقہ سے چھ سے آٹھ ہزار تک افراد کو ریاستی مشینری میں جوڑ دیا گیا تھا اور اس سے حکمران کے خلاف کسی بغاوت کا بھی کوئی خدشہ نہیں تھا۔ اس میں وسیع پیمانے پر عوامی بھلائی کی خدمات سرانجام دینے کی صلاحیت موجود تھی اور بطور حرف آخر یہ کہ سیاسی مقاصد کے لئے رقومات اور بخششوں کی مسلسل تقسیم کا یہ انتہائی کارآمد ذریعہ بنا رہا۔"

مالی انتظام

مالی وسائل قوموں اور ریاستوں کی تعمیر و ترقی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اس لئے علم سیاسیات میں مشہور ہندو مصنف کوٹلیہ نے اس اصول کی بنیاد رکھی کہ 'چوں کہ سب کاموں کا دارومدار مالی وسائل پر ہے اس لئے خزانہ پر زیادہ توجہ دی جانی چاہئے۔' ریاست سوات کے امور بھی کافی مالی وسائل اور مضبوط مالی نظام کے بغیر کامیابی سے نہیں چلائے جاسکتے تھے۔ ریاست کی مالی انتظامیہ کا بانی عبدالجبار شاہ تھا۔

انتظامی مراتب

محکمۂ مال کا سربراہ بھی حکمران خود ہی ہوتا تھا اور مالی اخراجات کا حتمی اختیار بھی اُس کے پاس تھا۔ اُس کی پیشگی اجازت کے بغیر کوئی رقم صرف نہیں کی جاسکتی تھی۔ نیچے سے اوپر تک محکمہ کے سارے ملازمین کی تقرری، ترقی اور برطرفی کا اختیار حکمران کے پاس تھا اور وہ یہ سب کچھ اپنی صوابدید کے مطابق کرتا تھا۔ شہری انتظامیہ کی طرح محکمہ مال کے ڈھانچہ میں بھی سب سے اوپر حکمران اور سب سے نچلے درجہ پر تحصیل دار ہوتا تھا۔ ہر تحصیل میں ایک خاص کلرک ہوتا تھا (جسے سب دفتر مرزا کہا جاتا تھا) جو اجارہ داروں سے سرکاری واجبات وصول کرتا، اس کا حساب وزیرِ مال ؔ مرکزی دفتر میں جمع کرتا اور تحصیل کی سطح پر سرکاری آمدنی کا حساب رکھتا۔

عبدالودود کے عہد کے ابتدائی دور میں وزیرِ مال نہیں تھا۔ وزیرِ اعظم کے ذریعہ ساری ریاستی آمدنی سر خزانہ میں جمع ہو جاتی اور اُس کی اجازت سے نکالی جاتی۔ بعد میں ایک مالیات کا وزیر مقرر کیا گیا (حقیقت میں علاوہ سے کوئی محکمہ مال نہیں تھا) جسے وزیرِ مال کہا جانے لگا۔ وہ حکمران کی جانب سے اس محکمہ کو چلاتا تھا۔ اُس کے پاس انتظامی اور عدالتی اختیارات بھی ہوتے تھے۔ اُسے ایک خزانچی اور ایک چھوٹے سے عملہ کی سہولت حاصل تھی جو اس معاملہ میں اُس کی مدد کرتا تھا۔ بعد میں (عبدالودود کے عہد میں بھی) ولی عہد جہان زیب روزانہ کی بنیاد پر حساب کتاب کی جانچ پڑتال کرنے لگے۔ مشیر مال (مشیر خزانہ) کا عہدہ بہت بعد میں جہان زیب کے عہد میں بنایا گیا اور والی بذاتِ خود صبح سویرے محکمہ مال کا ریکارڈ اور کھاتوں کی تفصیلات کی جانچ پڑتال کرتے جو کہ خزانہ کا افسر (جسے مہتمم خزانہ کہا جاتا تھا) اُس کے سامنے پیش کرتا۔ وزیرِ مال کو خزانہ میں موجود کل رقم اور جس مد میں وہ خرچ ہوئی سے بے خبر رکھا جاتا۔ آخری والی اس سلسلہ میں خود کہتے ہیں کہ

''خزانہ کا مکمل قبضہ اور اُس کے حسابات کی جانچ پڑتال میرے ہاتھ میں تھی۔ خزانہ کی رقم وزیرِ مال یا مشیر مال (اگر وہ جونیئر آدمی ہوتا) جمع کرتا لیکن ادائیگیاں اور حسابی کتب مہتمم کے تحت تھیں جسے افسر مال کہا جاسکتا ہے۔ وہ بلاواسطہ میرے تحت تھا۔

حالاں کہ وہ عہدہ میں وزیر سے نیچے تھا لیکن وہ اُس سے معلوم کرسکتا تھا کہ یہ یادو رقوم کہاں سے آئیں اور مزید ادائیگیاں کب آئیں گی وغیرہ وغیرہ۔''

ذرائع آمدنی

ریاست کے پاس آمدن کا سب سے بڑا ذریعہ عشر تھا جسے فصل کی تیاری کے موقع پر جمع کیا جاتا۔ اسے دس فی صد کے حساب سے کھلیان میں وصول کیا جاتا۔ عبدالودود کے عہد میں عشر کے ساتھ ریاست نے مزید دسواں حصہ لینا شروع کیا۔ اس کی وجہ افواج کی دیکھ بھال تھی اور اس کے بدلہ میں لوگوں کو لشکر کی ڈیوٹی سے چھوٹ مل جاتی تھی۔ آخری والی اس بارے میں کہتے ہیں۔

''میرے باپ نے دونوں محصولات کی فوری وصولی شروع کی۔ دسواں حصہ وہ کھلیان پر لے لیتے اور غلہ گھر پہنچنے کے بعد مزید دس فیصد وصول کرتے۔ یہ اضافی ٹیکس لشکر کے نام پر لیا جاتا۔ اس کے خلاف شکوہ شکایت کا سلسلہ جاری رہا۔ میں نے اس پورے مسئلہ کا تفصیلی جائزہ لیا کہ عشر کتنا بنتا ہے اور پھر یہ اضافی دسواں اس میں کتنا اضافہ کرتا ہے۔ میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ ساڑھے سات حصہ میں سے ایک حصہ یا ۱۳ء۳۳ فیصد کے برابر بنتا ہے نہ کہ دس میں سے ایک۔ تو ہم نے کہا یہ دوہری وصولی نہیں ہونی چاہئے کہ ایک بار کھلیان میں لیا جائے اور پھر گھر پہنچنے پر لیا جائے۔ پرانے طریقہ میں یہ خامی بھی تھی کہ وہ قطعات اراضی اس سے مستثنیٰ تھیں جو سیریٰ کے ذیل میں آتی تھیں۔ اس لئے کہ لشکروں میں آدمیوں کی فراہمی صرف پختونوں پر لازم تھا۔ جب ہم نے نیا نظام متعارف کرایا تو ساڑھے سات حصوں میں سے ایک حصہ لیا جانے لگا۔ اس طرح ایک بڑی ریاستی ملیشیا کی دیکھ بھال کے لئے ایسی استثنائی صورتیں بھی ختم کردی گئیں۔''

اس طرح ریاست عشر کے نام پر کھلیان ہی پر سب سے 13.33 فی صد کے حساب سے حصہ وصول کرتی۔ مارچ 1969ء میں اس شرح کو کم کرکے دس فی صد کردیا گیا۔ والی کا کہنا ہے کہ 'یہ میرے خلاف اٹھنے والی شکایت میں سے ایک تھی۔ میں نے سوچا: 'ریاست نے تو یہ ہرصورت جانا ہے۔ میں کہہ سکتا ہوں چلو ٹھیک ہے۔' اس لئے عشر کو دوبارہ عشر بنادیا گیا۔' اس سلسلہ میں دیئے گئے فرمان میں کہا گیا کہ 'اب عشر صحیح معنوں میں عشر بن گیا۔' اس بات کی بھی وضاحت کردی گئی کہ اس سے سالانہ بجٹ میں بیس یا پچیس لاکھ روپے کا خسارہ ہوگا جس سے ترقیاتی کاموں کی رفتار کم ہوجائے گی حتیٰ کہ بجٹ کو دوبارہ متوازن بنایا جاسکے۔ عبدالجبار شاہ کے عہد میں سیریٰ قطعات اراضی کو عشر سے مستثنیٰ قرار دیا گیا تھا لیکن عبدالودود نے دونوں قسم کی قطعات اراضی 'دوتر' اور 'سیریٰ' پر اسے لاگو کردیا۔

فصلوں کے علاوہ عشر دودھ دینے والے جانوروں گایوں، بھینسوں، بھیڑ بکریوں کے گلّوں اور پھلوں کے باغات پر بھی لیا جاتا تھا۔ بھیڑ بکریوں کے گلہ مالکان کو 40 بھیڑوں اور بکریوں پر ایک عدد بھیڑ یا بکری، اسی طرح شہد

کی کھیوں پر فی چھتہ ایک سیر شہد دینا پڑتا تھا۔ دودھ دینے والی بھینس یا گائے پر ایک سیر گھی فی جانور دینا پڑتا تھا۔ دودھ دینے والی بکریوں پر بھی ایک سیر گھی دینا پڑتا تھا۔ سبزیوں اور پھلوں پر بھی عشر لیا جاتا تھا۔[2] شروع میں ذاتی استعمال کے لئے اگائی جانے والی سبزیوں، رہائشی گھروں میں موجود پھل دار درختوں، گھریلو استعمال والی گایوں و بھینسوں پر بھی عشر وصول کیا جاتا تھا۔ بعد میں انہیں عشر سے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا۔[3] چرواہے اپنے گلوں پر زکوۃ کے علاوہ سالانہ ایک اونی کمبل بھی بطور ٹیکس ادا کرتے تھے۔

یہ سارے محاصل ریاست خود اکٹھے نہیں کرتی تھی بلکہ ان کی باقاعدہ نیلامی لگتی تھی اور سب سے زیادہ بولی دینے والے کو اس کا ٹھیکہ دے دیا جاتا تھا۔ ان لوگوں کو اجارہ گر، اجارہ دار، یا عشری کہا جاتا تھا۔ فصلوں کے لئے انہیں فی فصل اور دیگر ٹیکسوں کے لئے انہیں ایک سال کے لئے ایک خاص علاقہ کا اجارہ ملتا تھا۔ اجارہ دار کو ایک خاص دستاویز جس پر وزیر مال، تحصیل دار، یا حاکم کے دستخط ہوتے ملتا تھا، جس میں اس بات کی وضاحت ہوتی کہ فلاں علاقہ کا اجارہ فلاں شخص کو دے دیا گیا اور یہ کہ وہ طے شدہ غلہ کی مقدار یا رقم یا دیگر اشیا جنس کی صورت میں مقررہ وقت پر ادا کرے گا۔ اس میں اس بات کی بھی وضاحت ہوتی تھی کہ نفع نقصان دونوں صورتوں میں اجارہ دار سرکار کا طے شدہ حصہ دے گا۔

ادائیگی میں ناکام ہو جانے کی صورت میں اجارہ گروں سے وصولی کا بہت ہی انوکھا طریقہ اختیار کیا جاتا۔ سرکاری ملیشیا کی ایک خاص تعداد اُس کے گھر جا کر مقیم ہو جاتی۔ اُسے اس وقت تک ان کے کھانے پینے اور رہائش کا انتظام کرنا پڑتا جب تک وہ ادائیگی نہ کر دیتا۔ اسے سوئی کینول (چوکی بٹھانا) یا نوکران کینول (نوکران بٹھانا) کہا جاتا تھا۔[4]

اجارہ داروں کے لئے نیلام کا اہتمام وزیر مال تحصیل داروں کے ذریعے کرتا تھا۔ صرف سیاسی لحاظ سے مستحکم لوگ اس میں حصہ لیتے اس لئے کہ اگر وہ مطلوبہ مقدار سے زیادہ وصول کرتے تو وہ ان کا ہو جاتا اور اگر مطلوبہ مقدار سے جمع شدہ مقدار کم ہوتی تو وہ کمی انہیں پوری کرنی پڑتی۔ مقررہ وقت آنے پر انہیں غلہ، گھی، شہد یا نقد رقم فوری دینی پڑتی۔ اسی لئے مجاز حکام کا یہ فرض تھا کہ وہ صرف صاحب حیثیت لوگوں کو یہ ٹھیکے دیتے، ورنہ اجارہ دار سے وصولی نہ ہونے کی صورت میں وہ خسارہ انہیں پورا کرنا پڑتا۔

بعد میں حکمران کی طرف سے ان لوگوں کی نام بنام فہرست بنائی گئی جنہیں اُس کی تحریری اجازت کے بغیر اجارہ نہیں دیا جاتا تھا۔ یہ فرمان بھی جاری ہوا کہ جو سرکاری ملازم کوئی اجارہ لے گا اور پھر سرکار کا حصہ ادا کرنے میں ناکام رہے گا تو اُسے نوکری سے برخواست کر کے جیل بھیج دیا جائے گا حتیٰ کہ سرکاری حصہ اُس سے وصول کر لیا جائے۔

تحصیل داروں اور حاکموں کی ذمہ داری تھی کہ وہ سرکاری واجبات وصول کریں، ان کا صحیح حساب کتاب رکھیں اور رشوت اور غبن کا سدِ باب کریں۔

درآمد اور برآمد پر بھی محصول لیا جاتا تھا جسے چنگی کہا جاتا تھا۔ سوات میں اس کے لئے لنڈا کے چیک پوسٹ اور بونیر میں امبیلہ چیک پوسٹ کے مقام پر انتظامات کئے گئے تھے۔ لنڈا کے چیک پوسٹ کا قیام جنوری 1918ء میں عمل میں لایا گیا تھا جب کہ امبیلہ چیک پوسٹ بونیر کے الحاق کے بعد جولائی 1924ء میں قائم کیا گیا تھا۔ اس سے میاں گل عبدالودود کی مقبولیت خاصی متاثر ہوگئی تھی۔ یہ محصول بھی ٹھیکہ پر دیا جاتا اور ٹھیکہ دار کو اسے چار اقساط میں ادا کرنا ہوتا۔

جنوری 1918ء میں ہر گھر پر ایک روپیہ ٹیکس عائد کیا گیا۔ جس پر زبردست احتجاج کیا گیا۔ مئی 1925ء میں مینگورہ کے تاجروں پر 20 سے لے کر 120 روپے تک کا ٹیکس عائد کیا گیا۔ اس نے بھی تاجر پیشہ برادری میں بے چینی پھیلا دی۔ نمک اور گھی کی فراہمی کو بھی ٹھیکہ پر دیا گیا اور ٹھیکہ دار سے محصول وصول کیا جانے لگا۔ 1926ء میں نمک کی فراہمی کا ٹھیکہ ایک سال کے لئے بیس ہزار روپے پر دیا گیا۔ 1934ء میں پیشہ ور افراد اور دکان داروں پر حیثیت ٹیکس نافذ کیا گیا۔

آمدنی کا ایک اور ذریعہ سڑک ٹیکس تھا۔ ٹرانسپورٹروں اور گاڑی مالکان سے ریاست ایک مخصوص قسم کی رقم لیتی تھی۔ تانگہ بانوں سے بھی ایک خاص فیس وصول کی جاتی تھی۔

سوات جنگلات کی دولت سے مالا مال تھا۔ ریاست کے وجود میں آنے سے قبل اس سے مناسب استفادہ نہیں کیا گیا۔ ریاست بننے کے بعد منظم طریقہ سے اس پر کام شروع کیا گیا اور یہ ریاست کی آمدنی کا بہت بڑا ذریعہ بن گیا۔ جنگلات کی آمدنی میں 90 فی صد ریاست کے پاس چلا جاتا تھا صرف دس فی صد رائلٹی زمین مالکان کو ملتی تھی۔

تمسکات پر لیا جانے والا ٹیکس اور مختلف جرائم پر لئے جانے والے جرمانے بھی ریاستی خزانہ کے لئے آمدن کا ایک اور ذریعہ تھا۔ مختلف جرائم پر بھاری جرمانے عائد کئے جاتے تھے۔ مار پیٹ، قتل، چوری، زنا، قوانین وضوابط کی خلاف ورزی وغیرہ پر ٹھیک ٹھاک جرمانے عائد کئے جاتے تھے۔ ان جرمانوں کا ایک بڑا حصہ ریاست کے خزانہ میں چلا جاتا تھا۔ کچھ تھوڑا بہت مرہم پٹی اور دیت کے سلسلہ میں متاثرہ فریق کو دیا جاتا۔ شروع میں متعلقہ خان اور ملک کو اس جرمانہ کا ایک تہائی حصہ دیا جاتا۔ بعد میں ان خوانین اور ملکانان کو 20 روپے سے زائد نہیں ملتے تھے جن کو مواجب نہیں ملتا تھا۔ اور جن کو 20 روپے سے زائد مواجب ملتا تھا تو اُن کو ان کے مواجب جتنی رقم دی جاتی تھی اس سے زیادہ نہیں۔

علاوہ ازیں اسٹامپ پیپر، اسلحہ لائسنس فیس، ٹیلی فون فیس، منشیات ٹیکس (الکحل، افیون اور چرس کی فراہمی کا ٹھیکہ دیا جاتا تھا)، کانیں (زمرد وغیرہ)، ضبط شدہ جائیدادوں کے کرائے اور آمدنی، مویشی میلہ ٹیکس اور ریاستی ملکیت کے ہوٹل (سوات ہوٹل) سے آنے والی آمدن، الغرض آمدنی کے کئی ذرائع تھے۔ ان کے علاوہ حکومت پاکستان سے بھی امداد کی شکل میں ایک خاص رقم ملتی تھی۔ البتہ اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ مویشی میلہ ٹیکس، کانوں سے حاصل ہونے والی آمدنی، سوات ہوٹل اور بنیادی جمہوریت کے ضمن میں حکومت پاکستان والی امداد وغیرہ میاں گل جہان زیب کے عہد سے تعلق رکھتے ہیں۔ آخری والی نے اس بات کا یوں خلاصہ بیان کیا ہے کہ

''ریاست کی معیشت میں بڑھوتری کا عمل جاری رہا ہے۔ اس کو تفصیلاً یوں بیان کر سکتے ہیں کہ اس کا بڑا حصہ تو جنس کی صورت میں خزانہ میں آتا اور بنیادی خدمات کے معاوضے جیسے پولیس اور فوج کی تنخواہ اس مد سے ادا کی جاتی۔ نقد آمدنی نے بھی اس میں اپنا حصہ ڈالنا شروع کر دیا۔ غلہ کی پیداوار بڑھنے سے عشر میں حاصل ہونے والی آمدنی بڑھ گئی۔ یوں ہم غلہ بیچنے کے بھی قابل ہو گئے... نقد آمدن میں اضافہ اطمینان بخش رہا۔ جب میں نے زمام اقتدار سنبھالا تو ریاست کی سالانہ نقد آمدنی 50 لاکھ روپے تھی۔ یہ بڑھتے بڑھتے دو کروڑ ہو گئی جب کہ نہ تو کوئی اضافی ٹیکس لگا اور نہ ہی انکم ٹیکس لگایا گیا۔ صرف چنگی سے ملنے والا محصول جو ابتداء میں صرف چودہ ہزار روپے تھا، میری حکومت کے خاتمہ کے وقت بیس لاکھ تک پہنچ گیا تھا۔''

والی صاحب نے تو اس کے لئے ریاستی معیشت کی اصطلاح استعمال کی ہے لیکن درحقیقت یہ صرف ریاست کو محاصل کی مد میں ملنے والی آمدنی ہے۔ دراصل ٹیکس بہت تھے جس کا بارتھ نے عمدگی سے تجزیہ کیا ہے۔ وہ کہتا ہے ریاست کی آمدنی 'کا انحصار سب طرح کی نجی منفعت بخش سرگرمیوں پر ٹیکس، زرعی پیداوار پر عشر، عمارتی لکڑی پر ٹیکس، درآمد و برآمد پر چنگی محصولات اور مختلف کاموں پر فیس کی وصولی پر تھا۔' ریاستی آمدنی کے ان مختلف ذرا تفصیلی تجزیہ سے (جس کا بارتھ نے ذکر نہیں کیا ہے) بھی اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ نجی منفعت بخش سرگرمیوں پر ٹیکس وصول کیا جاتا تھا۔

اخراجات

تحصیل کی سطح پر مختلف ذرائع سے ملنے والی آمدنی وہاں کی جانے والی ادائیگیوں کے بعد آمدن اور اخراجات کی تفصیل کے ساتھ مرکزی خزانہ میں جمع ہو جاتی تھی۔ خزانہ سے تحصیل دار اور حاکم کو اس کی رسید جاری کر دی جاتی۔ تازہ ترین مکمل حساب کتاب رکھا جاتا۔ شروع میں اس کا نگران وزیر مال تھا۔ بعد میں ولی عہد اور پھر حکمران نے بہ ذات خود یہ کام سنبھال لیا۔

سرکاری آمدنی کو انتظامیہ (معہ شاہی اخراجات)، فوج، پولیس، اسلحہ خانہ، تعلیم، صحت، سڑکوں اور پلوں،

آب پاشی، مواجب، نشرواشاعت، پاکستانی فنڈوں میں عطیات، مَلَکَانہ اورامداد، محکمہ ٹیلی فون، جیل، عوامی بہبود کے لئے ٹرانسپورٹ، جنگلات کی رائلٹی، مشاورتی کونسل کے اخراجات، سرکاری عمارتوں، کانوں کی رائلٹی اور ریٹائرڈ ملازمین کی کمیٹی جیسے مدوں پر خرچ کیا جاتا۔ 1954ء سے پہلے نہ تو مشاورتی کونسل کا کوئی وجود تھا اور نہ شاہی اخراجات کے لئے وظیفہ کا تصور۔ خزانہ کا سارا اختیار حکمران کے ہاتھ میں تھا۔ عملاً بعد میں بھی ایسا ہی رہا۔ مختلف مدات کے لئے رقم کی تخصیص بہت بعد کی بات ہے اس لئے کہ 1954ء سے پہلے بجٹ کا کوئی تصور موجود نہیں تھا۔

نہ تو ضمنی ضابطہ الحاق سے پہلے ریاستی آمدنی اور اخراجات اور شاہی اخراجات کے لئے مختص رقم کی جانچ پڑتال کبھی ہوئی اور نہ ہی بعد میں کبھی ایسا ہوا۔ ایسا پہلی بار پاکستان میں ریاست کے ادغام کے بعد ہوا جسے حکومتِ پاکستان نے کرایا 'لیکن کسی بے قاعدگی اور غبن کا پتہ نہیں چلا۔' الزام لگایا جاتا ہے کہ پرانا سارا ریکارڈ ضائع کر کے نیا ریکارڈ اُس کی جگہ رکھا گیا، تاکہ بے قاعدگی اور غبن کا پتہ نہ چل سکے۔ نتیجہ یہی نکالا جاسکتا ہے کہ دونوں باتوں کی صحت یقینی نہیں بلکہ یہ جانچ پڑتال کا معاملہ صرف لیپاپوتی سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔

مالیات کے بارے میں ایک خاص بات یہ ہے کہ ساری آمدنی کبھی استعمال میں نہیں لائی گئی بلکہ اس کا ایک حصہ ہمیشہ فاضل رہا۔ مثلاً 1949-50ء، 1955-56ء، 1961-62ء اور 1966-67ء میں بالترتیب آمدنی ساٹھ لاکھ روپے، چونسٹھ لاکھ روپے، ایک کروڑ چودہ لاکھ تہتر ہزار روپے، اور ایک کروڑ ساٹھ لاکھ دس ہزار روپے، جب کہ اخراجات بالترتیب ساٹھ لاکھ روپے، اکسٹھ لاکھ پچیس ہزار روپے، ایک کروڑ تیرہ لاکھ روپے، اور ایک کروڑ ستاون لاکھ چالیس ہزار روپے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب خزانہ حکومتِ پاکستان کے حوالہ کیا گیا تو 'اس میں پندرہ لاکھ روپے نقد اور کچھ حصص موجود تھے۔'

کرنسی

ریاست سوات کی اپنی کرنسی نہیں تھی۔ پہلے برطانوی ہند اور بعد میں حکومتِ پاکستان کی کرنسی کو ریاستی کرنسی کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا۔

عدالتی انتظامیہ

دیگر انتظامی دائرہ ہائے کار کی طرح ریاست کا اپنا انوکھا عدالتی نظام تھا۔

قوانین وضوابط

حکمرانی نے بہ تدریج مکمل مطلق العنانیہ کی شکل اختیار کرلی لیکن ابتدا میں حکمران کے لئے لوگوں کا تعاون حاصل کرنا ضروری تھا۔ اس لئے کہ یہاں صحیح حکومت چلانے کے لئے اُس کا دارومدار اُن لوگوں کی حمایت پر تھا جو اُسے اقتدار میں لائے تھے۔ اپنی غیر محفوظ حیثیت اور سماجی صورت حال کی پیچیدگیوں سے بہ خوبی واقف ہونے کی وجہ سے میاں گل عبدالودود نے ایک عجیب حکمت عملی اختیار کی۔ اُس نے یہ چاہا کہ اس کے کہ خود آئین اور ضابطۂ قانون بنائے لوگوں سے کہا کہ وہ جرگہ کے ذریعہ اپنے لئے اپنے علاقائی رواج اور ضروریات کو مدنظر رکھ کر قوانین وضوابط بنالیں۔ ان قوانین وضوابط کو سختی سے نافذ کیا جائے گا اور لوگوں سے ان پر عمل درآمد کروایا جائے گا۔ ان قوانین کو دستور العمل' کہا جاتا تھا۔ ان ضوابط (جو مختلف جرگے اپنے علاقوں کے لئے بناتے تھے) میں یکسانیت نہیں ہوتی تھی۔

ان کے ساتھ ساتھ حکمران اپنے فرمان بھی جاری کرتا تھا اور اپنے قوانین پر بھی عمل درآمد کراتا تھا۔ مثلاً 20 اکتوبر 1931ء میں جاری کردہ اُس کا ایک فرمان معاہدہ نکاح میں کچھ نکات شامل کرنے کے بارے میں ہے۔ 11 جنوری 1938ء کا ایک فرمان زمین کے لین دین کے بارے میں ہے اور ایک بلا تاریخ فرمان ٹیلی فون کے ستون تباہ کرنے یا انہیں جلانے یا درختوں اور گندم کی فصل کے ساتھ یہی سلوک کرنے کے بارے میں ہے۔

یہ فرامین بعض وقت علاقے میں مروجہ قوانین وضوابط کے برعکس ہوتے تھے۔ اس سلسلہ میں جرگہ سے کہا کہ وہ ان کو اپنے ضوابط میں شامل کردے۔ مثلاً نریز اور درے خیل جرگہ کے ضوابط کے مطابق قتل کا جرمانہ سو روپے سے دو سو روپے کے درمیان تھا لیکن حکمران نے اسے ایک ہزار روپے کردیا۔ جرگہ نے اس کی تصدیق کی اور اس شرح پر خوشی کا اظہار بھی کیا۔ اس نے سڑک کے اوپر قتل کرنے کی صورت میں قصاص کے ضابطہ کو بھی تسلیم کیا۔

تحصیل برانیال (بحرین) کے جرگہ کے بیان سے عیاں ہے کہ زہر، سنکھیا اور تیزاب پر حکومت نے پابندی عائد کردی ہے اور اُس نے اس کی تصدیق کردی ہے۔

اسی طرح سے چکیسر کے سرکردہ افراد کے ایک بیان سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ انہیں شاہی فرمان کے ذریعہ کہا گیا کہ چوری، قتل اور فصلیں جلانے کی صورت میں اگر مجرم کوئی نامعلوم آدمی ہوتو علاقے کے لوگوں پر لازم ہوگا کہ وہ مجرم کا پتہ چلا کر اُسے پکڑوائیں۔ بہ صورت دیگر اُس پورے علاقہ کو جرمانہ ادا کرنا پڑے گا۔

حکمران اکثر و بیشتر اپنے فرمان بہ ذریعہ ٹیلی فون جاری کرتا تھا۔ مثلاً ایک جرگہ بتاتا ہے کہ 20 جون 1938ء کو بہ ذریعہ ٹیلی فون یہ فرمان جاری کیا گیا۔ میاں گل عبدالودود اپنے اس طریق کار اور حکمت عملی کو یوں بیان کرتا ہے:

''اگر میں یہ کہوں تو اسے صرف لاف زنی نہ سمجھا جائے کہ سوات کا عدالتی اور انتظامی نظام اور وہاں کے سارے قوانین وضوابط نہ صرف یہ کہ میں نے متعارف کرائے بلکہ میرے ذہن کی پیداوار ہیں۔ اس میں کسی اور سے کوئی مدد نہیں لی گئی۔ علاقہ کی ضروریات اور وہاں کے مخصوص حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے خود ہی انہیں مرتب کیا۔

جب کوئی نیا علاقہ فتح ہوتا یا اپنی مرضی سے ریاست میں شامل ہوتا تو میں وہاں کی ساری آبادی کا ایک نمائندہ جرگہ بلاتا اور ان سے کہتا کہ قتل، ڈاکہ، چوری، غصب، زنا بالجبر اور زنا جیسے جرائم کے لئے خود ہی سزائیں مقرر کریں۔ جب وہ کسی ایک فیصلہ پر پہنچ جاتے، تو میں اسے ایک معاہدہ کی شکل میں لکھواتا جس پر وہ سب دستخط کرتے یا اپنے انگوٹھوں کے نشان لگاتے۔ مقامی قسم کے مقدمات کو اس کے مطابق نمٹایا جاتا۔''

میاں گل عبدالودود نے اجتماعی ذمہ داری کا قانون بھی متعارف کرایا جسے جرگوں نے منظور کر کے اپنے ضابطوں میں شامل کرلیا۔ اس قانون کے مطابق متعلقہ علاقہ کے لوگوں کی مشترکہ ذمہ داری بنتی تھی کہ وہ مجرم کی نشان دہی کرے یا اُسے حکومت کے حوالہ کریں۔ ناکامی کی صورت میں سزا یا جرمانہ سب کو بھگتنا پڑتا تھا۔ ادغام تک یہ قانون چلتا رہا اور جرائم کو محدود رکھنے میں مددگار ثابت ہوتا رہا۔

عمل درآمد

اس طرح جرگوں کے ذریعہ بنائے گئے قوانین پر بالعموم عمل درآمد ہوتا تھا لیکن بعض اوقات کسی خاص ذر، پشت پناہی یا ڈراوے کی وجہ سے استثنائی صورتِ حال بن جاتی تھی۔ اس کی وضاحت کے لئے دو مشہور مثالیں دی جاتی ہیں۔

پیر محمد خان نے اپنے چچا جمروز خان کو قتل کر دیا لیکن اُسے سزا نہیں دی گئی۔ آخری والی کے بیان کے مطابق اس کی وجہ یہ تھی کہ حکمران 'جمروز خان کو پسند نہیں کرتا تھا' اور مزید برآں یہ کہ 'اُن دنوں کسی خان کو قصاص کر کے نہیں مارا جا سکتا تھا۔ یہ قانون تو نہیں تھا لیکن اُس دور کی سیاست کا یہی تقاضا تھا'

دوسرا مقدمہ منگلور کے دوستے خان اور اُس گاؤں کے زرین خان کا ہے جن کے درمیان تنازعہ اور رقابت چلی آرہی تھی۔ زرین خان کے حجرہ میں سے فائر کر کے دوستے خان کو مار ڈالا گیا جس پر زرین خان کو پکڑ کر دوستے خان کے بیٹے کے حوالہ کر دیا گیا جس نے اُسے گولی ماردی۔ والی اس واقعہ کا تذکرہ کرتے ہوئے اعتراف کرتا ہے کہ 'اگر میں زرین خان کو بچالیتا تو علاقہ کے کئی سرکردہ افراد الزام لگاتے کہ دوستے خان کو میں نے قتل کرایا ہے بلکہ اس قسم کی افواہیں پہلے ہی شروع ہوگئی تھیں'

والی خود یہ بات بیان کرتا ہے کہ 'شریعت میں قاتل کی شناخت کے لئے عینی شہادت کا ہونا لازم ہے۔ جب

حجرہ سے گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی تو کس کی گولی کا مقتول شکار بنا ناممکن البیان ہے۔' لیکن اُسے دوستے خان نے دھڑے کے آگے جھکنا پڑا اور زرین خان کو اُن کے حوالہ کر کے قتل کرا دیا گیا تاکہ والی اس قتل کے الزام میں ملوث ہونے سے بچ جائے۔ والی کے اپنے الفاظ میں: 'نتائج کے لحاظ سے یہ ایک سیاسی معاملہ تھا۔' والی نے تو اس بات کے لئے افواہ کا لفظ استعمال کیا ہے لیکن اُس کے بارے میں اُس وقت عام خیال یہی تھا کہ یہ قتل والی کے کہنے اور اس یقین دھانی پر کیا گیا کہ قاتل کو تحفظ دیا جائے گا لیکن دوستے خان کے دھڑے (ڈلہ) کے دباؤ سے وہ اپنے وعدہ کو پورا نہ کر سکا۔

قاضی، شریعت، عدالتی ڈھانچہ اور ان کی حیثیت

میاں گل عبدالودود نے گاؤں، تحصیل اور حاکمی کی سطح پر قاضی مقرر کیئے[5] تاکہ دادرسی کے لئے متاثرین کو لمبے فاصلے نہ طے کرنے پڑیں۔ تحصیل قاضی صرف تحصیل سطح کے فیصلے ہی نہ کرتا بلکہ گاؤں کے قاضی کے فیصلوں کے خلاف درخواستوں کی سماعت بھی کرتا اور حاکم سے وابستہ قاضی اعلیٰ عدالت کا فریضہ سرانجام دیتا تھا۔ دارالحکومت میں موجود اعلیٰ ترین عدالت قاضی القضاۃ اور فقہ اسلامی پر سند فقہا پر مشتمل تھی۔ اہم مقدمات کا فیصلہ اس عدالت میں ہوتا اور یہ اسلامی فقہ کے مطابق فیصلے کرنے والا اعلیٰ ترین ادارہ تھا۔

میاں گل جہان زیب کے ایک حکم کے مطابق موجودہ قاضی اپنی اپنی جگہ برقرار رہیں گے اور یہ کہ مستقبل میں ہر حاکمی میں تین اور تحصیل میں دو قاضی ہوں گے۔ اس طرح کل 71 قاضی ہوں گے۔ تاہم بریکوٹ حاکمی کے لئے دو جب کہ کالام تحصیل کے لئے تین قاضی مقرر کیئے گئے تھے۔ ایک دوسرے حکم کے مطابق اگر اچھی صحت کا مالک ہو تو قاضی 70 سال کے عمر میں ریٹائر ہوگا بہ صورت دیگر 65 سال کے بعد ریٹائر ہوگا۔

درحقیقت عدالتی ڈھانچہ میں بھی سب سے اوپر حکمران اور نیچے تحصیل دار ہوتا تھا۔ قاضی کسی مقدمہ کو اُس وقت تک ہاتھ نہیں لگا سکتے تھے جب تک تحصیل دار اُسے اُن کے پاس نہ بھیج دیتا۔ حتیٰ کہ سپہ سالار تک کے پاس عدالتی اختیار تھا۔ ایک بالکل نیا شعبہ محکمہ منصفان کے نام سے بعد میں تشکیل دیا گیا۔ ان منصفوں کو بھی عدالتی اختیار دے دیئے گئے تھے۔ یہ لوگ گروپ کی شکل میں متنازعہ جگہ کا معائنہ کرتے اور یا تو تنازعہ کا خود ہی فیصلہ کر دیتے یا اس کی تفصیلی رپورٹ تیار کر کے حکمران یا ولی عہد کو پیش کر دیتے، جیسا بھی انہیں کرنے کو کہا جاتا۔ منصفان کا فوجداری مقدمات سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ ان کے حوالے نہیں کئے جاتے تھے۔ ان کا دائرہ اختیار جائیداد کے تنازعات تک محدود تھا۔

سوات میں شریعت اور قاضیوں کی حیثیت کے بارے میں خاصی غلط بیانی سے کام لیا گیا ہے۔مثلاً محمد ایوب خان لکھتے ہیں کہ'سب قسم کے تنازعات چاہے دیوانی ہوں یا فوجداری، قرآن اور شریعت کے مطابق حل کیے جاتے تھے... بادشاہ صاحب اور اُن کے نیچے قاضی وغیرہ مثالی اسلامی انصاف سے کام لیتے تھے۔' لیکن باچا صاحب خود بیان کرتے ہیں کہ' جو چاہتا اپنی مرضی سے اسلامی شریعت کے مطابق اپنے مقدمہ کا فیصلہ کرواسکتا تھا۔'اور یہ کہ' علاقائی جرگہ نے جو قوانین وضوابط اپنے علاقہ کے لئے بنائے تھے، ان کی ایک نقل ہر تحصیل میں موجود ہوتی تھی اور سب لوگوں کو اختیار حاصل تھا کہ وہ شریعت اور رواجی قوانین میں سے جس کے مطابق چاہتے اپنے فیصلے کرواسکتے تھے'اس لئے یہ عام خیال غلط ہے کہ شریعت ریاست کا اعلیٰ ترین قانون تھا اور سب فیصلے اُس کے مطابق ہوتے تھے اور کسی کے لئے اُس سے روگردانی ممکن نہ تھی۔

اختیارات کی کوئی تقسیم موجود نہیں تھی۔ انتظامی، عمل درآمد، مالی اور عدالتی طاقت اور وظائف سب کے سب سرکاری حکام اور حکمران کے ہاتھوں میں تھے۔ قاضی عدالتیں، انتظامی اور عدالتی حکام کی تابعدار تھیں اور اسلامی قوانین علاقائی ضوابط اخلاق کے تحت تھیں جب کہ یہ دونوں حکمران کے تابع تھے۔

بعض مقدمات میں محکمہ قضا کی رائے کسی خاص درخواست کے بارے میں معلوم کی جاتی کہ کیا وہ شریعت کے مطابق روا ہے یا نہیں۔ یہ بہرصورت عدلیہ انتظامیہ کے قبضہ میں تھی۔ بااثر لوگوں کے مقدمات اور قتل اور زنا کے مقدمات کا حکمران خود فیصلہ کرتا تھا۔ انہیں قاضی کے پاس نہیں لایا جاتا تھا۔ قاضیوں کو اکثر بتادیا جاتا کہ مقدمات کیسے چلانے ہیں اور کیا لائحہ عمل اختیار کرنا ہے۔ بعض اوقات قاضیوں کو اشارتاً بتایا جاتا کہ فریقین میں سے کون حکمران یا کسی خاص سرکاری افسر کا منظور نظر ہے۔

حکومت پاکستان کی ایک مردم شماری رپورٹ میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ' قاضیوں کے فیصلے حتمی ہوتے ہیں اور انہیں حکمران بھی نہیں بدل سکتے۔' حقیقت میں قاضیوں کے فیصلوں کے خلاف حکمران کے پاس اپیلیں داخل کی جاتیں اور کئی بار قاضیوں کو شریعت کے مطابق کیے گئے اپنے فیصلوں پر نظر ثانی کے لئے کہا جاتا۔ اسی طرح یہ بیان کہ' کسی مقدمہ میں قاضی کے فیصلہ کے بعد تحصیل دار کے پاس اسے ختم کرنے یا بدلنے کا اختیار نہیں' حقیقت کے برخلاف ہے اس لئے کہ کئی بار تحصیل دار نے قاضی کے فیصلہ کو منسوخ کرکے اس کی جگہ اپنا فیصلہ دے دیا۔ قاضیوں کے فیصلوں اور دیگر کاغذات کی توثیق ہمیشہ انتظامی عدالتی افسران سے کرائی جاتی اس لئے کہ صرف قاضی اور محکمہ قضا کے دستخط اور مہر کو کافی نہیں سمجھا جاتا تھا۔

ہر قسم کے جرائم کے لئے جرمانے تھے جیسے قتل، مار پیٹ، چوری، زنا وغیرہ۔ سخت قسم کے اسلامی قوانین پر عمل درآمد کم ہی کیا جاتا اس لئے کہ ان سارے جرمانوں کا تعین مقامی جرگوں یا حکمران نے کیا ہوتا۔ اس بات کی مزید

وضاحت کے لئے حکمران کے مندرجہ ذیل احکام یہاں دیئے جا رہے ہیں۔

اپنے ایک شائع شدہ فرمان میں میاں گل جہان زیب اعلان کرتا ہے کہ آئندہ سے جرمانے اس شرح سے وصول کئے جائیں گے۔

1. ارتکاب زنا: 500 روپے (صرف مردوں سے وصول کیا جاتا تھا)
2. کسی پر گولی چلانا: 200 روپے
3. کسی کے مکان میں نقب زنی: 200 روپے
4. لواطت: 200 روپے (صرف بدفعلی کرنے والے سے لیا جاتا)
5. عورت سے چھیڑ چھاڑ: 100 روپے۔

والی کے اس قسم کے ایک اور فرمان میں اعلان کیا گیا کہ جس کسی نے اپنی بیوی کی ناک کاٹ دی تو اُسے دو ہزار روپے جرمانہ اور بیوی کو طلاق دینا پڑے گا۔ پھر اس فرمان میں ایک ترمیم کر کے کہا گیا کہ ملزم دو ہزار روپے جرمانہ یا سات سال قید کی سزا بھگتے گا اور اس کے ساتھ بیوی کو طلاق بھی دے گا۔

قتل کے مقدمات کا فیصلہ شریعت کے بجائے خالصتاً سیاسی بنیادوں پر کیا جاتا تھا۔ اس ضمن میں جمروز خان اور دوستے خان کے قتل کی مثالوں سے پہلے ہی اس بات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ میاں گل جہان زیب کا مندرجہ ذیل بیان اس بات کی مزید وضاحت کرتا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

''میں ہمیشہ سے علاقائی رواج کی موجودگی کا معترف رہا ہوں جس کی وجہ سے نتائج کو مدنظر رکھتے ہوئے فیصلے کرنے پڑتے تھے۔ یہاں نسلوں سے قائم پرانے جھگڑے چل رہے تھے۔ اگر کوئی کسی کو قتل کر دیتا تو ورثا، قاتل کے قریبی رشتہ داروں میں سے کسی کو قتل کر کے اس کا بدلہ لیتے اور یوں یہ سلسلہ چل پڑتا۔ چونکہ یہ سب انتقاماً ہوتا تھا اس لئے ایسے قتل کے لئے میں کسی کو سزائے موت نہیں دے سکتا تھا لیکن ہم انہیں جرمانہ کر سکتے تھے یا قید کر سکتے تھے، یا دونوں سزائیں بیک وقت دے سکتے تھے''

قصاص کے قانون پر صرف یہ نہیں کہ انتقاماً قتل کے مقدمات میں عمل درآمد نہیں کیا جاتا تھا بلکہ دیگر قسم کے قتل کے مقدمات میں بھی اس پر عمل کم ہی ہوتا تھا جس کا اندازہ والی کے اس بیان سے لیا جا سکتا ہے کہ 'ریاست سوات میں سالانہ اوسطاً 22 قتل ہوتے تھے۔ ان میں سے آدھے اباسین کوہستان میں ہوتے تھے لیکن وہاں کسی ایک مقدمہ میں بھی کسی کو سزائے موت نہیں دی گئی اور ریاست کے دیگر علاقوں میں والی کے بیان کے مطابق 'وہ سال میں صرف دو یا تین قاتلوں کو گولی مار کر ہلاک کرنے کا حکم دیتے تھے۔۔۔ 22 میں سے تین کو سزائے موت دی جاتی۔ عبرت کے لئے یہ کافی تھا۔ باقی قاتلوں کو 7 سال یا 10 سال قید یا بھاری جرمانہ کر دیئے جاتے'۔

درخواستیں دائر کرنے اور اس طرح اُن کو نمٹانے کے عمل میں یکسانیت نہیں تھی۔ درخواستیں کئی قسم کے سرکاری حکام کے سامنے پیش کی جا سکتی تھیں جیسے تحصیل دار، حاکم، حاکم اعلیٰ، نائب مشیر، مشیر، وزراء، سپہ سالار، ولی عہد اور

وائی۔ بعض اسٹامپ پیپروں پر رسم درخواست کے الفاظ لکھے ہوتے تھے۔ عام کاغذ اور باہر سے آئے خطوط کی شکل میں بھی درخواستیں قابل قبول تھیں۔ درخواست سے متعلق سرکاری ہدایات، جوابات اور احکام اس کاغذ کی پشت پر لکھے جاتے تھے جس پر درخواست لکھی جاتی تھی۔ حتمی فیصلے اسٹامپ پیپر پر لکھ کر کامیاب فریق کے حوالے کر دیئے جاتے تھے۔ فیصلے بالعموم مختصر ہوتے تھے۔ ان میں درخواست دھندہ اور مدعا علیہ کے نام، فریقین کے موقف اور فیصلہ بالتفصیل لکھ دیا جاتا۔ یہ سب کچھ پشتو زبان میں لکھا جاتا تھا کیونکہ ریاست کی سرکاری زبان تھی۔ اس کا سرکاری رجسٹروں میں ریکارڈ رکھا جاتا تھا۔ دلچسپی کی بات یہ ہے کہ مغربی طرز انصاف کی موجودہ خامیوں یعنی فنی نکتہ بازی، تاخیر اور مہنگا ہونا وغیرہ سے یہ نظام پاک تھا۔

مفت عدالتی چارہ جوئی اور جلد فیصلے

یہ بات سو فی صد درست ہے کہ انصاف میں تاخیر انصاف سے انکار کے مترادف ہے۔ اس لحاظ سے سوات کا نظام انصاف مثالی تھا۔ عدالتی چارہ جوئی کا طریقہ آسان اور فیصلے بہت جلد کر دیئے جاتے تھے۔ عموماً ایک یا دو ساعتوں میں فیصلے سنا دیئے جاتے تھے اور ان پر فوری عمل درآمد کر دیا جاتا۔ عبدالغفور قاسمی کہتے ہیں کہ درخواست دائر کرنے، فیصلے، اپیل، قرضہ کی وصولی، حکم کے منتقی کرنے یا اس پر تعمیل کی کوئی فیس نہیں لی جاتی۔ درخواست گذار فوجداری یا دیوانی چارہ جوئی پر ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کرتا۔ چاہے معاملہ بڑا ہو یا چھوٹا، فیصلہ ایک یا دو ساعتوں میں کر دیا جاتا ہے۔ عبدالودود کے مطابق، مقدمے یا درخواستیں ایک آنہ کے اسٹامپ پیپر پر دائر کئے جاتے تھے (روپیہ میں 16 آنے ہوتے تھے)۔ ان کو حکومت کی طرف سے ہر تحصیل اور عدالت میں فراہم کر دیا جاتا تھا۔ ہر عدالت اور تحصیل میں خاص کلرک تعینات ہوتے تھے جو درخواست گذاروں کے لئے مفت میں درخواستیں لکھتے تھے۔ عدالت کی کوئی فیس نہیں تھی۔ وہ مزید دعویٰ کرتا ہے۔

> "اس بات کے پیش نظر کہ سوات کے باشندوں کی اکثریت غریب ہے، میری کوشش تھی کہ ایسا عدالتی نظام تشکیل دوں کہ جس میں امیر اور غریب دونوں کو بغیر کچھ خرچ کئے انصاف مل سکے۔ اسے سرخ فیتہ کی لعنت سے بھی آزاد رکھا جائے۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے مجھے ایسا نظام بنانے کی توفیق دی جس میں یہ ساری باتیں موجود تھیں اور جو ملک میں رائج دیگر نظاموں سے مختلف تھا۔"

بعد میں اسٹامپ پیپر کی قیمت بڑھا دی گئی اور درخواست یا مقدمہ دائر کرنے والوں کو اس کی قیمت ادا کرنی پڑتی تھی اور تحصیل یا عدالت کے احاطہ میں موجود غیر سرکاری منشیوں کو بھی اس کام کا معاوضہ دینا پڑتا تھا۔

رشوت، بدعنوانی، اور رواداریاں

لوگوں کو طویل مقدمہ بازی کے جھنجھٹ سے بچالیا گیا تھا۔ اس طرح فیصلے بہت جلد اور اُن پر عمل درآمد فوری ہوتا تھا لیکن اقربا پروری و رشوت ستانی کے جراثیم ابتدا ہی سے اس نظام میں موجود تھے۔ عدالتی اختیارات والے سرکاری حکام اور قاضی حضرات کا دامن رشوت کی چھینٹوں سے ہمیشہ پاک نہیں رہتا تھا۔ اسی طرح ذاتی اغراض و مقاصد بھی ان کے فیصلوں پر اثر انداز ہوتے تھے۔ باچا صاحب نے بعض قاضیوں کے خلاف رشوت کے الزام پر کچھ کارروائی بھی کی لیکن یہ بگاڑ بہ ہرکیف موجود رہا۔ اور وقت گذرنے کے ساتھ اس میں اضافہ بھی ہوتا گیا۔ حکمران اس مسئلہ کا قلع قمع کرنے کے لئے مناسب اقدام سے کچھ وجوہات کی بناء پر گریزاں رہے۔

حکمران بذات خود تو رشوت ستانی میں ملوث نہیں تھے لیکن وہ اس سلسلہ میں اپنے مفادات کو مدِ نظر رکھتے رہے۔ فریڈرک بارتھ اس بات کی نشان دہی کرتے ہوئے کہتا ہے کہ 'والی کی روئیداد میں اس بات پر بہت زور دیا گیا ہے کہ مقدمات پر صحیح اور بروقت فیصلوں سے قیام انصاف ہی دراصل حکمران کا بنیادی کام ہے۔' والی صاحب ہر قسم کے مقدمات نمٹا دیتے تھے جیسا کہ وہ کہتے ہیں۔

''اپنے دور کے آخری پانچ سالوں میں میں نے محسوس کیا کہ مجھ پر کام کا بوجھ بہت بڑھ گیا ہے، خصوصاً عدالتی کام کا۔ صرف بڑی نوعیت کے مقدمات ہی نہیں بلکہ ہر قسم کے چھوٹے بڑے جھگڑے... اس کام میں میرے وقت کا بڑا حصہ نکل جاتا تھا۔ آبادی میں اضافہ ہوتا گیا، تنازعات بڑھتے گئے اور لوگوں کو عدالتی چارہ جوئی کا چسکا بھی پڑ گیا۔''

لیکن فریڈرک بارتھ اس بات کا تجزیہ کرتے ہوئے رقم طراز ہے کہ 'مقامی سطح کی سیاست کو ایک باقاعدہ ڈگر پر چلانے کے لئے معاملات کو نمٹانے کا ذریعہ بہت اہم کردار ادا کرتا رہا۔ اس طریقہ سے ریاست اپنے وجود کو گاؤں کی سطح سے اٹھنے والے سیاسی مدوجزر کے تھپیڑوں سے محفوظ رکھنے میں کامیاب رہی۔' میاں گل جہان زیب اپنی ولی عہدی کے دور کی بابت بتاتے ہوئے اس نظام کے مختلف پہلوؤں کی یوں وضاحت کرتے ہیں۔

''وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ مجھے فیصلہ کرنے کے لئے زیادہ مقدمات دیئے جانے لگے اور زیادہ لوگ میرے پاس آنے لگے لیکن بڑے خان جیسے خان بہادر اور دارئی خان وغیرہ اپنے مقدمات میرے پاس نہیں لاتے تھے، وہ سیدھے میرے باپ کے پاس جاتے۔ وزیروں کے پاس بھی نہ جاتے۔ ان کے مقدمات زیادہ تر سیاسی یا جاگیردارانہ سیاست سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن 1934ء میں یہ مقدمات میرے لئے اتنے بڑھ گئے کہ میں تھکاوٹ محسوس کرنے لگا۔ اس لئے کہ اب وزیروں کے پاس کوئی نہیں جاتا تھا۔ سب میرے پاس آتے تھے۔ میرے والد معمولی نوعیت کے مقدمات صرف اُسی صورت میں لیتے تھے جب اُن سے انہیں کوئی خاص دل چسپی ہوتی یا انہیں ان کے پاس بھیج دیا جاتا۔ میں نے لوگوں سے نہیں کہا تھا کہ وہ میرے پاس آئیں لیکن چوں کہ اختیارات کی تقسیم موجود نہیں تھی، لہٰذا لوگ اپنی مرضی سے وزیروں یا میرے پاس آسکتے تھے لیکن وہ میرے طرزِ انصاف کے قائل تھے اس لئے کہ میری کوئی ذاتی اغراض نہیں تھیں۔ مجھے یقین ہے کہ صرف اُس وقت کی

بات نہیں بلکہ بعد میں جب میں حکمران بن گیا تب بھی جب فریقین میرے پاس آتے تو میں دھڑے بندی (ڈلہ سیاست) سے خود کو الگ رکھتا اور انصاف کے تقاضوں کے مطابق فیصلہ کرتا۔ کسی کو شکایت پیدا نہ ہوتی لیکن سوات دو دھڑوں (ڈلوں) میں تقسیم تھا اس لئے کچھ لوگ میرے پاس آتے کچھ وزیروں کے پاس جاتے۔ یہ کوئی لازمی امر نہیں تھا کہ ایسا صرف دھڑا بندی کی وجہ سے ہو بلکہ مقامی طور پر بھی یہ ہو سکتا تھا کہ اگر کوئی خان کسی وزیر کا رشتہ دار یا حمایت یافتہ ہو تو فریق مخالف قدرتی طور پر میرے پاس آتا۔ اس لئے کہ دشمن کا دشمن دوست ہوتا ہے۔"

والی صاحب کے اس بیان سے بھی دھڑابندی والی سیاست کا پتہ چلتا ہے:

"میرے کچھ حکام انتہائی دیانت دار تھے۔ ان کے خلاف رشوت لینے کا کوئی شائبہ تک موجود نہیں تھا لیکن وہ سخت ڈلہ باز تھے (دھڑے بندی کی سیاست میں لت پت)۔ وہ ہمیشہ اپنے ... ت یا دھڑے کی حمایت کرتے۔ وہ پیسہ تو نہیں لیتے تھے لیکن جب کوئی مقدمہ ان کے پاس آتا تو اس میں وہ ہمیشہ اپنے دھڑے کی حمایت پر مبنی فیصلہ کرتے۔"

دراں حالیکہ والی صاحب کا دعویٰ ہے کہ وہ خود کو ہمیشہ دھڑے بندی کی سیاست سے اوپر رکھتے تھے اور حق و انصاف پر مبنی فیصلے کرتے تھے لیکن یہ صرف ادھورا سچ ہے۔

فریڈرک بارتھ ریاست سوات میں عمومی انتظامی صورت حال کا انتہائی خوب صورتی سے جائزہ لیتے ہوئے کہتا ہے۔

"یہ ایک نئے ابھرنے والے نظام کا ڈھانچہ تھا۔ اس کی تنظیم کہیں اور سے درآمد کردہ نظام کی نقل نہیں تھی..... یہاں یہ کہنا کافی رہے گا کہ بالکل ایسا نظام قرب و جوار کی کسی ریاست میں موجود نہیں تھا۔ اگر بڑے علاقہ کو سامنے رکھ کر بات کریں تو اس تنظیم کے بہت سے عناصر دیگر علاقائی تنظیموں میں مل جائیں گے جیسے ذاتی محافظین کا نظام پڑوسی ریاست دیر سے لیا گیا۔ محصولات کی نیلامی کا تصور مغل عہد سے، عشر کا ادارہ اسلامی دور اور تحصیل کی سطح پر تقسیم اور حکام کا تصور برطانوی ہند سے لیا گیا۔ عبدالجبار شاہ کی طرف سے جلد عوامی فوج کی تشکیل کا طریق خاصا اختراعی نوعیت کا قرار دیا جا سکتا ہے۔ کم از کم بادشاہ اس سے واقف نہیں تھا... لیکن ممکن ہے یہ خیال ریاست امب سے لیا گیا ہو لیکن ریاست سوات کا بنیادی ڈھانچہ جو اس کی زندگی کی ضمانت تھا، وہ کسی دوسری ریاست کے کسی نظام کا چربہ ہرگز نہیں تھا۔ نہ تو ریاست دیر کا کثرتیت پسند جبری خانی والا نظام تھا... نہ چترال کا پیچیدہ مرکز پسند جاگیردارانہ نظام تھا... نہ ہنزہ کا کنٹر رسموں کے تابع نظام... اور نہ ہی برطانوی ہند کا نوآبادیاتی نوکر شاہی والا نظام۔"

نوٹس

1954ء نے سوات کے حکمران کے اوپر کوئی وزیر اعلیٰ مسلط نہیں کیا لیکن اس میں اس بات کا بھی کوئی ذکر نہیں تھا کہ حکمران ہی ریاست کا وزیر اعلیٰ ہوگا۔ (دیکھیں گورنمنٹ آف سوات (انٹرم کانسٹی ٹیوشن) ایکٹ، 1954ء، ٹرائبل افیئرز ریسرچ سیل، ہوم اینڈ ٹرائبل افیئرز ڈیپارٹمنٹ، گورنمنٹ آف این ڈبلیو ایف پی، بک نمبر 15۔

گایوں اور بھینسوں سے جس تناسب سے 'سیر' لیا جاتا تھا اُس کی تفصیلات جاننے کے لئے شاہی فرمان نمبر 53، 7 اکتوبر 1963ء (ڈسٹرکٹ ریکارڈ روم، گل کدہ، سوات، بنڈل نمبر ندارد، فائل نمبر ندارد، اور مصنف کا ذاتی ذخیرہ کتب و دستاویزات) ملاحظہ کریں۔

امیر زمان، بالمشافہ گفتگو، زبانی، ہزارہ، سوات، 15 مارچ 1987ء۔ ریاستی دور کے آخری برسوں میں جن اشیاء پر عشر لگایا جاتا تھا اور جو اُس سے مستثنیٰ تھیں اور اس کا تناسب جاننے کے لئے 22 دسمبر 1967ء کو مشیر مال کی جانب سے تقسیم کئے جانے والے شاہی فرمان کو ملاحظہ کریں۔ (مصنف کا ذاتی ذخیرہ کتب و دستاویزات اور ضلعی ریکارڈ روم، گل کدہ، سوات، بنڈل نمبر ندارد، فائل نمبر ندارد۔)

ان دونوں میں بنیادی فرق یہ تھا کہ ایک بڑی رقم یا قرضہ کی وصول کے لئے ریاستی ملیشا کی ایک پوری سوئی (چوکی) کی نفری نادہندہ یا مقروض کے گھر پر بٹھادی جاتی۔ اسے 'سوئی کینول' کہا جاتا تھا۔ جب کہ اگر مطلوبہ رقم یا قرضہ زیادہ نہ ہوتا تو ملیشا کے چند افراد ایک یا دو یا تین کی تعداد میں نادہندہ یا مقروض کے گھر پر بٹھادئے جاتے۔ اس کو نوکران کینول (بٹھانا) کہتے تھے۔

قاضی یوں تو جج یا مجسٹریٹ کو کہتے ہیں لیکن ریاست سوات کے معاملہ میں یہ ضروری نہیں کہ اس سے اسی مرتبہ کے لوگ مراد ہوں۔

نواں باب

سماجی اور ثقافتی پہلو

کسی بھی معاشرہ کے سماجی و ثقافتی پہلوؤں کو جانچنے پرکھنے سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ معاشرہ پس ماندہ ہے یا ترقی یافتہ۔ اسی لئے ریاست سوات عہد کا سماجی و ثقافتی مطالعہ تفصیل طلب ہے۔ یہاں تعلیم، زبان، مذہب، صحت، مستقل بندوبست اراضی، مواصلات، صنعت و تجارت، زراعت، قیادت اور حقوق نسواں وغیرہ کا جائزہ لیا گیا ہے۔

تعلیم

عالمی سطح پر تعلیم کی اہمیت ایک تسلیم شدہ امر ہے۔ ریاست سوات میں شامل علاقے ریاست کی تشکیل سے قبل تعلیمی لحاظ سے انتہائی پس ماندہ تھے۔ اس لحاظ سے ان کی صورت حال شمال مغربی سرحدی صوبہ کے قبائلی علاقہ کے لوگوں سے مختلف ہرگز نہیں تھی۔ اپنے جغرافیائی محل وقوع اور قبائلی نظام کی وجہ سے یہاں جدید دور کے اثرات نہیں پہنچے تھے۔ آبادی کا ایک بہت چھوٹا حصہ بنیادی روایتی مذہبی تعلیم سے بہرہ ور ہو رہا تھا۔ صوبہ میں حکومت کے زیر انتظام اضلاع کی طرح جدید تعلیم کے لئے نہ کوئی تحریک تھی اور نہ قابل ذکر کوشش۔ لوگوں نے بھی اس ضمن میں ایسی کسی دل چسپی کا اظہار نہیں کیا تھا کہ اپنے بچوں کو جدید تعلیم سے روشناس کرانے کے لئے ملک کے دیگر علاقوں کی طرف بھیجیں۔

میاں گل عبدالودود اور میاں گل جہان زیب کے اپنے بیانات سے بھی یہ پتہ چلتا ہے کہ سوات میں تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ تاہم سوات اور برطانوی ہند کی حکومت کے درمیان ہونے والی خط و کتابت سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ یہاں خال خال کچھ لوگ ضرور ایسے تھے جو کسی حد تک روایتی طرز تعلیم سے واقفیت کی وجہ سے عربی اور فارسی زبانوں سے آگاہ تھے۔

میاں گل عبدالودود کے عہد میں جدید تعلیم

جب ریاست معرضِ وجود میں آئی اور عبدالودود نے اسے کسی حد تک مستحکم کر دیا تو جدید تعلیم اور جدید طرزِ زندگی سے لوگ متعارف ہونے لگے۔ حالاں کہ وہ خود اَن پڑھ تھا لیکن اُسے جدید تعلیم کی اہمیت کا بہ خوبی اندازہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بغیر جدید تعلیم کے ریاست کو جدید خطوط پر کامیابی سے چلانا ممکن نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اہم عہدوں پر اعلیٰ قابلیت کے لوگوں کی خدمات حاصل کرنے کی ضرورت نے اُس کے اس خواب اور خواہش کے لئے مہمیز کا کام کیا کہ وہ ریاست میں ایسے تعلیمی ادارے قائم کرے جہاں سے ریاست کی ضروریات پوری کرنے کے لئے مختلف علوم وفنون کے ماہر افراد کی فصل تیار ہو سکے۔

سیدو شریف میں پہلا پرائمری اسکول مارچ 1922ء کے قریب کھلا نہ کہ 1925ء یا 1926ء میں، جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ ہفتہ وار صوبائی خفیہ ڈائری (سیاسی) جس پر نومبر 1923ء کی تاریخ درج ہے کا کہنا ہے کہ میاں گل نے اپنے سیدو کے اسکول میں ادینہ مردان کے ایک باشندے شمس الحق کو (جو کہ تورلانڈئی، کوہ نہ، جبی، اور کوہاٹ میں معلمی کے فرائض سرانجام دے چکے تھے) معلم مقرر کیا۔ کہا جاتا ہے کہ اُسے شعبہ تعلیم سے نکال دیا گیا تھا۔ اس سے اس بات کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ یہ اسکول 1923ء سے پہلے قائم کیا گیا تھا۔

ان خفیہ رپورٹوں کو پڑھنے کے بعد آدمی کو حیرت ہوتی ہے کہ آخر کس پروگرام کے تحت اور کس مقصد کے سوات میں یہ پہلا اسکول کھولا گیا۔ خفیہ محکمہ کی رپورٹوں میں الزام لگایا گیا ہے کہ بالشویک تحریک کے زیرِ اثر اور امداد سے ایک نئی جماعت کی داغ بیل ڈالی گئی ہے جو کہ مقامی سطح پر ہندوستانی انقلابی تنظیم کی نمائندہ ہے۔ جس کے ارکان کی منظوری اور مالی امداد مولوی عبیداللہ اور احمد حسن المعروف احمد علی کرتے ہیں۔ یہ لاہور کا ایک نوجوان ہے جو 1915ء میں لاہور میڈیکل کالج سے فرار ہونے والوں میں شامل تھا۔ اس نوٹ میں مزید بتایا گیا ہے کہ۔

"مخفی کے اس جماعت کے مقاصد یقیناً بالشویک نظریات پر مبنی ہیں۔ ان کا ارادہ ہے کہ پورے قبائلی علاقے میں اسکول کھولے جائیں اور مختلف ذرائع سے پتہ چلا ہے کہ اس قسم کے تین اسکول دو باجوڑ اور ایک سوات میں پہلے ہی کھولے جا چکے ہیں۔ ان اسکولوں میں سب کچھ مفت ہوگا۔ باقاعدہ تعلیم دی جائے گی لیکن آئرلینڈ کے شِن فین طریقہ پر طلبہ کو تاریخ اور دیگر مضامین مسخ شدہ انداز میں پڑھائے جائیں گے جس سے طلباء میں انتہا پسندی، فرقہ واریت اور انگریز دشمنی پر مبنی خیالات کو پروان چڑھایا جا سکے۔ تاکہ پھر وہ ان کو قبائل میں پھیلا سکیں۔"

اس جماعت کے مولوی عبدالعزیز (جو کہ صوبہ کے اضلاع زیریں میں بابا عبدالغفار خان کے تعلیمی منصوبوں سے منسلک رہا تھا) کی عبدالودود کے ساتھ سیدو میں موجودگی اور ان کے درمیان قریبی تعاون سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ سیدو شریف سوات میں عبدالودود کے ساتھ مل کر اس نے مارچ 1922ء سے قبل وہاں پہلا اسکول قائم کیا جو کہ

ہند کے انقلابی رہنماؤں سے رابطہ اور تاشقند سے آنے والی امداد کا نتیجہ تھا۔

جولائی 1925ء میں مردان کے اسسٹنٹ کمشنر نے ایک رپورٹ میں بتایا کہ میاں گل عبدالودود کے وزیر نے ایک ملاقات کے دوران بتایا ہے کہ میاں گل (عبدالودود) اپنے علاقہ (بونیر) میں پرائمری اسکول کھولنے کے ایک منصوبہ پر عمل درآمد کرنا چاہتا ہے۔ حالانکہ جولائی 1925ء سے پہلے بونیر میں اسکول نہیں کھلے لیکن اس سے باچا صاحب کے ذہن میں اس علاقہ کے مستقبل کے منصوبوں کے بارے میں پتہ چلتا ہے۔ عبدالودود کا دعویٰ ہے کہ لوگوں کو جدید تعلیم کی طرف راغب کرنے کے لئے اُس نے پہلے مذہبی تعلیم پر زور دیا تا کہ وہ کچھ پڑھنے لکھنے کے قابل ہو جائیں۔ خود اُس کا کہنا ہے۔

''حالانکہ میرے عہد حکومت کے ابتدائی بیس سال زیادہ تر جنگ و جدل اور دیگر ہنگامی اُمور کو نمٹانے میں گذر گئے لیکن اس دوران میں لوگوں کی تعلیمی ضروریات سے مکمل طور پر لاتعلق نہیں تھا۔ جیسے ہی کوئی نیا علاقہ ریاست کا حصہ بنتا، میں وہاں اچھے پڑھے لکھے مولوی کا تقرر کر دیتا تا کہ وہ اسلامی اصولوں کے مطابق لوگوں کی راہنمائی کریں اور انہیں پڑھنے لکھنے کی طرف راغب کریں۔ دینی معاملات میں لوگوں کی راہنمائی پر اس لئے زور دے رہا تھا کہ اُس وقت سوات کے عام لوگ اپنے دین کے بارے میں بہت کم جانتے تھے۔ حتیٰ کہ انہیں مسجد کے احترام کا بھی کوئی خاص خیال نہیں تھا۔ دوسری جدید عصری اور مغربی تعلیم کے لئے اُن کے اس طرح ذہن ہموار کرنا ضروری تھا تا کہ لوگ جذباتی اور ذہنی طور پر اس کے لئے تیار ہو جائیں اور اس کے لئے اُن کے اندر ایک لگن پیدا ہو جائے۔''

سیدو شریف کے پرائمری اسکول کے علاوہ بری کوٹ، چار باغ، چکیسر، ڈگر اور باچا کلے میں بھی پرائمری اسکول کھولے گئے۔ پولیٹیکل ایجنٹ نے دسمبر 1927ء میں اس بارے میں لکھا کہ:

''برطانوی ہند حکومت کی کچھ مدد کے ساتھ (عبدالودود) نے سیدو میں ایک اے وی مڈل اسکول کھولا ہے اور اسی طرح ریاست میں مزید 12 پرائمری اسکول کھولے ہیں۔ وہ تعلیم پر سالانہ اندازہ ہزار روپے خرچ کرتا ہے۔ والی (باچا صاحب) کی درخواست پر محکمہ تعلیم کا ایک افسر باقاعدگی سے ان اسکولوں کا معائنہ کرتا ہے۔''

اس طرح 1927ء میں سیدو شریف میں پہلا مڈل اسکول کھلا اور پرائمری اسکولوں کی تعداد بھی 12 تک پہنچ گئی۔ مخدوم تصدق احمد دعویٰ کرتا ہے کہ باچا صاحب نے برطانوی انداز کے اسکولوں کے طرز پر اسکول کھول کے جدید مغربی تعلیم کا آغاز کیا اور لوگوں کے گھروں پر فوجی بھیج کر انہیں اپنے بچے اسکولوں میں داخل کرنے پر مجبور کیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان اسکولوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ مختلف عوامل جیسے لوگوں کی نفسیات اور ان کو سنبھالنے کے لئے باچا صاحب کے طریقِ کار کو مدنظر رکھتے ہوئے تصدق احمد کے اس دعویٰ سے اتفاق کرنا مشکل ہے کہ باچا صاحب کو لوگوں کو اپنے بچے اسکول بھیجنے کے لئے فوجی بھیجنے پڑے ہوں۔

مغربی تعلیم کی طرف لوگوں کو مائل کرنے کے لئے باچا صاحب کی کوششوں اور لوگوں کی اس سے لاتعلقی اور

اس ضمن میں ملاؤں کے منفی کردار کا اچھی طرح تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے بونیر خان بیان کرتا ہے کہ 'ان وجوہات سے سیدو اسکول کے علاوہ باقی سارے اسکول طلباء کی عدم دست یابی کی وجہ سے بند کرنے پڑے۔ ہاں ایک اور اسکول بریکوٹ کے مقام پر طلباء کی بہت کم تعداد کے باوجود کھلا رہا۔' تاہم ریاست میں اسکولوں کی بندش کی وجہ طلباء کی عدم دست یابی ہرگز نہیں تھی، اس کے پیچھے دراصل ایک بہت ہی قبیح سوچ کارفرما تھی۔ 1930ء کی دہائی کے ابتدائی برسوں میں ہندوستان میں انگریز مخالف احتجاج کے بعد پولیٹیکل ایجنٹ نے باچا صاحب کو متنبہ کیا کہ لوگوں کو تعلیم دلانے کا اُس کا جو بھی مقصد ہو لیکن اُس سے وہی خطرہ اُسے بھی ہوگا جو کہ تعلیم دلانے کے بعد برطانوی ہند کی حکومت کو درپیش ہے۔ مطلب یہ کہ انگریز حکومت کی فراہم کردہ سہولتوں سے فائدہ اٹھا کر تعلیم حاصل کرنے والے جس طرح اُس حکومت کے خلاف احتجاج کر رہے ہیں، اس طرح اُس کی رعایا بھی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اُس کے خلاف اٹھ کھڑی ہوگی۔[2] اسی لئے باچا صاحب نے سیدو شریف اور بریکوٹ کے اسکولوں کے علاوہ باقی سارے اسکول بند کر دیئے۔ اس کے علاوہ ان میں 1930ء کی دھائی میں نہ تو کوئی نیا اسکول کھولا گیا اور نہ ہی پرانے بند اسکول کھولے گئے۔ 1940ء کی دھائی میں سیدو شریف میں قائم ودودیہ اسکول کو ہائی اسکول کا درجہ دے دیا گیا اور نئے اسکول بھی کھولے گئے۔ اُس کے عہدِ حکومت کے آخری سال 1949ء میں مصنفین نے اسکولوں کی تعداد کے بارے میں اختلاف رائے کا اظہار کیا ہے۔ ایک کے مطابق ایک ہائی اسکول، 7 لوئر مڈل اسکول اور 28 پرائمری اسکو' اس طرح اسکولوں کی کل تعداد 36 بنتی ہے۔ دوسرے کے مطابق ایک ہائی اسکول، تین مڈل، نو لوئر مڈل او پرائمری اسکول۔ اس طرح کل تعداد 25 بنتی ہے۔

اولف کیرو نے عبدالودود کے عہد حکومت میں صحت و تعلیم کے شعبوں میں ترقی کے بارے میں یہ بات کرتے ہوئے مبالغہ سے کام لیا ہے کہ 'وہ ہر جگہ اسکول اور اسپتال تعمیر کر رہا تھا۔' درحقیقت ان دونوں شعبوں میں زیادہ تر کام اُس کے بیٹے میاں گل جہان زیب کے دورِ حکومت میں ہوا ہے۔

تاکہ اس ضرورت کو پورا کیا جاسکے۔

اس سے پہلے تعلیم کا کوئی علاحدہ محکمہ موجود نہیں تھا۔ وودوڈ یہ ہائی اسکول کا ہیڈ ماسٹر ہی سارے اسکولوں اور تعلیمی امور کا نگران تھا۔ وہ انسپکٹر کی مہر بھی استعمال کرتا تھا۔ والی صاحب نے ڈائریکٹر ایجوکیشن کے ماتحت تعلیم کا الگ محکمہ قائم کیا۔ اس محکمہ کے اُمور والی صاحب اپنے پرائیویٹ سیکرٹری (جسے بعد میں ڈپٹی سیکرٹری اور اسسٹنٹ سیکرٹری کی مدد حاصل تھی) کی مدد سے خود چلاتے تھے۔ ہر سال نئے اسکول کھلتے تھے اور پرانے اسکولوں کا درجہ بڑھایا جاتا تھا۔ والی صاحب ریاست میں قائم تعلیمی اداروں کا بہ ذاتِ خود جائزہ لیتے رہتے تھے۔

حکومت سنبھالنے کے دو ماہ کے اندر، 1950ء میں انہوں نے اپنے نام پر ایک کالج قائم کرنے کے کام کا آغاز کر دیا۔ اصل دو منزلہ عمارت کی تعمیر کے بعد 1951ء میں وودوڈ یہ ہائی اسکول کے نویں اور دسویں جماعت کے طلبا کو یہاں منتقل کر دیا۔ 1952ء میں آئندہ سیشن کے لئے سالِ اول (گیارہویں جماعت) میں طلبا کو داخلے دے دئے گئے۔ بعد میں کالج میں کندہ کی گئی تحریر میں بیان کردہ یہ بات کہ میاں گل جہان زیب نے 15 ستمبر 1952ء کو کالج کی بنیاد رکھی غلط ہے۔ گیارہویں جماعت میں داخلے ستمبر 1952ء میں دیئے گئے جب کہ اسکول کی کلاسیں ایک سال پہلے اس عمارت میں منتقل کی گئی تھیں۔ جس کی تصدیق جہنز ڈبلیو پیپن کے براہِ راست بیان سے عیاں ہے جسے نیچے دیا گیا ہے۔ کالج کی تعمیر کا کام جنوری 1950ء میں شروع ہوا یا بالفاظِ دیگر کالج کی بنیاد 1950ء میں ڈالی گئی اور اس کی اصل دو منزلہ عمارت 1951ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی۔ کالج کی کلاسوں کا افتتاح ستمبر 1952ء میں کیا گیا۔ اس کالج کی عمارت کا ڈیزائن انگریزی حرف ''ای'' سے مماثل ہے جس کا (خیال کیا جاتا ہے کہ) تعلیمی اشارہ ایجوکیشن (تعلیم) کی طرف ہے۔ بعد میں اس میں ایک تیسری منزل کا اضافہ کیا گیا اور ایک علاحدہ سائنس بلاک بھی تعمیر ہوا۔

علاقہ میں جدید تعلیم کے فروغ میں اس کالج کا اہم کردار ہے۔ سوات اور بیرونِ سوات کے طلبا، یہاں حصول تعلیم کی غرض سے آتے تھے۔ مزہ کی بات یہ ہے کہ گیارہویں اور تیرہویں جماعت میں داخلہ لینے والے پہلے طالب علم ہونے کا اعزاز بیرونِ ریاست سے تعلق رکھنے والے طالب علم بالترتیب سید احمد جان (اسماعیلیہ) اور محمد اقبال (اتمان زئی) کو حاصل ہے۔ حکومت پاکستان نے 'سماج بہتری اسکیم' کے تحت ریاست کو ایک لاکھ روپے دئے تاکہ کالج کی تعمیر اور یہاں سائنس لیبارٹری کے قیام میں مدد دی جاسکے۔ جن کا تم یہ ادائیگی ایک طویل کارروائی اور نہ ختم ہونے والے تاخیری حربوں کے بعد ممکن ہوسکی۔ شکرگزاری کا اظہار یوں کیا گیا: 'سوات کا حکمران انتہائی مسرت کے ساتھ اس مختص کردہ رقم کے اجراء پر شکرگزاری کے جذبات کا اظہار کرتا ہے۔ یہ رقم اس کالج کی تعمیر کے منصوبہ کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے کام میں مددگار ثابت ہوگی۔ جہنز ڈبلیو پیپن کالج کی نو تعمیر شدہ عمارت اور آنے والے وقتوں

کے لئے والی کے تعلیمی منصوبوں کے بارے میں یوں بیان کرتا ہے۔

''اسکول کی تازہ پلستر شدہ دیواروں پر کیا گیا رنگ ابھی گیلا تھا۔ پرنسپل نے ہمیں بتایا کہ اسے ٹی ایل اسکول کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے۔ آئندہ سال ان میں سے جو تعلیم جاری رکھنا چاہیں کے کالج کی کلاسوں میں چلے جائیں گے۔ جن کا قیام عمل میں لایا جا رہا ہے۔ بعد ازیں یہ کالج اُس تعلیمی اہرام کی چوٹی کا کام کرے گا جو کہ ریاست کے ہر گاؤں میں قائم اسکول کی شکل میں ہوگا۔''

سپین کا خیال تھا کہ اُس نے ایشیا کی ایک عظیم تعلیمی خام خیالی کا مشاہدہ کرلیا ہے جس کا آغاز اوپر سے ہوا ہے۔ لیکن حقیقت میں یہ خام خیالی نہیں تھی بلکہ یہ ایک حقیقت تھی جس کے حصول کی جد وجہد کا آغاز ہو چکا تھا۔ سپین کے اس سوال کہ گاؤں میں اسکول کھولنے کے منصوبہ کا آغاز کب ہوگا کے جواب میں پرنسپل نے بتایا کہ والی صاحب کافی عرصہ سے اس کام کے لئے کوشاں رہا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اب ہر گاؤں میں کم سے کم ایک اسکول مکمل چکا ہے۔ جب کہ سیدو میں کئی اسکول کام کر رہے ہیں۔ لیکن یہ بات غلط تھی اس لئے کہ 1952 میں بتایا گیا کہ اسکولوں کی کل تعداد 49 ہے جو کہ ریاست میں موجود گاؤں کی تعداد سے بہت کم تھی۔ درحقیقت منزل ابھی کوسوں دور تھی۔

بہ ہر حال اس سلسلہ میں حقیقی صورت حال کا اندازہ اعداد و شمار سے لگایا جاسکتا ہے۔ 1949ء میں چار ہزار مربع میل کے علاقے پر پھیلی ہوئی ریاست میں صرف ایک ہائی اسکول، تین مڈل اسکول، نو لوئر مڈل اسکول اور 12 پرائمری اسکول تھے۔ جب کہ اگر 1944ء سے اس کا موازنہ نہ کریں تو اُس وقت پوری ریاست میں ایک اسکول، ایک مڈل اسکول اور دو پرائمری اسکول تھے۔ آنے والے برسوں میں تعلیمی میدان میں زبردست ترقی ہوئی۔ 1959ء میں یہاں ایک کالج، نو ہائی اسکول، 25 مڈل اسکول، 19 لوئر مڈل اسکول، 53 پرائمری اسکول اور 34 پرائمری اسکول تھے۔ 1969ء میں ایک کالج، 37 ہائی اسکول، 33 مڈل اسکول، 14 لوئر مڈل اسکول، 164 پرائمری اسکول اور 120 لوئر پرائمری اسکول تھے۔ 1967ء میں والی نے دو اور کالج ایک ڈگر (بونیر) اور دوسرا مٹہ (سوات بالا) میں قائم کرنے کی منظوری دی۔ اس کے لئے والی مالی سال 68-1967ء کے بجٹ میں رقوم مختص کی گئیں۔ تعمیر کا کام تو والی کے عہد حکومت میں مکمل ہو گیا لیکن ان دونوں کا باقاعدہ افتتاح ریاست کے ادغام کے بعد عمل میں آیا۔

تعلیمی اداروں کی تعداد کے ساتھ ساتھ اساتذہ کی کارکردگی اور تعلیمی معیار کی طرف توجہ دینا بھی لازم ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے قابل طلبا کو وظائف دیئے جاتے تھے اور اساتذہ کو اچھی کارکردگی پر انعام اور بری کارکردگی پر سزا دی جاتی تھی۔ والی صاحب اس ضمن میں کہتے ہیں کہ

''میں نے اچھے کام اور اعلیٰ معیار کے حصول کے لئے مناسب انتظامات کیے۔ سالانہ امتحان میں اگر کسی استاد کا نتیجہ اوسطاً 90 فی صد یا اس سے زیادہ ہوتا تو اسے بطور انعام ایک ماہ کی اضافی تنخواہ دی جاتی اور جس استاد کی کلاس کا نتیجہ اوسطاً 30 فی صد یا

اس سے کم ہوتا تو اسے بطور سزا اس سال کی تنخواہ میں دیئے جانے والے سالانہ اضافہ سے محروم رہنا پڑتا۔ اس طرح میں نے اساتذہ کے لئے جزا و سزا کا ایک باقاعدہ نظام بنا دیا جس کی وجہ سے وہ حتی الوسع بہترین نتائج کے لئے کوشاں رہتے۔''

ریاست میں سنگوٹہ کے عیسائی مشنری اسکول کے علاوہ کوئی غیر سرکاری اسکول موجود نہیں تھا۔ اسے 1950ء کی دہائی کے اواخر میں کھولنے کی حوصلہ افزائی کی گئی تھی۔ اس کے لئے زمین بھی ریاست کے پیسوں سے خریدی گئی اور عمارت کی تعمیر بھی ریاستی پیسوں سے کی گئی۔

اسسٹنٹ ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن (فرنٹیئر ریجنز) نے ریاست میں تعلیمی میدان میں کثیر الجہت ترقی کی تعریف کی اور اس پر اپنے اطمینان کا اظہار کیا۔ اُس نے پرزور الفاظ میں سفارش کی کہ 'کم از کم ایک لاکھ روپے کی امداد ریاست کو اس ضمن میں دی جائے' تاکہ یہاں تعلیم کے فروغ کے لئے مزید رقم خرچ کی جاسکے۔

ریاست میں فروغ تعلیم کے لئے ان کی مساعی کے اعتراف کے طور پر والی کو 'سلطان العلوم' کے خطاب سے نوازا گیا اور جامعہ پشاور نے ایل ایل ڈی (ڈاکٹر آف لا) کی اعزازی سند سے نوازا۔ والی صاحب نے دعویٰ کیا کہ وہ 'یہ اعزاز پانے والے پہلے پاکستانی ہیں'۔

لوگوں کی شراکت

تعلیمی اداروں کے قیام اور وہاں کھیلوں کے میدانوں کے لئے زمین مقامی باشندے مفت فراہم کرتے تھے۔ تعمیر کا کام بھی ریاستی ملیشا اور مقامی باشندے مل کر کرتے تھے۔ برگانشال کے کچھ باشندوں نے کمسنے کے مقام پر مجوزہ اسکول کے بارے میں تحریری ضمانت دی کہ انہیں اس اسکول کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور یہ کہ وہ اس کی تعمیر کے کام میں میاں گل جان ملک کے ساتھ کوئی تعاون نہیں کریں گے اور اگر یہ بن گیا تو اس میں اپنے بچے حصول تعلیم کے لئے نہیں بھیجیں گے اور اگر وہ اپنے بچے اسکول بھیجنا چاہیں گے تو میاں گل جان ملک کو اسکول کی تعمیر پر خرچ ہونے والی ساری رقم بلا عذر ادا کردیں گے۔ ریاست کے آخری برسوں میں اسکولوں کی تعمیر کا سارا کام ٹھیکہ دار کیا کرتے تھے اور اس کے لئے اُنہیں ریاست کی طرف سے ادائیگی کردی جاتی تھی۔ لوگ اور ریاستی ملیشا اس کام میں کوئی حصہ نہیں لیتے تھے۔

ابتدائی برسوں میں مرکزی علاقہ سے باہر کے اسکولوں کے عملہ کی تنخواہ بھی مقامی باشندے چندہ کرکے دیتے تھے۔ پولیٹیکل ایجنٹ دیر، سوات اور چترال، ڈبلیو آر ہے، کہتا ہے۔

''سیدو، بریکوٹ، پنجکی اور کبل میں قائم اسکولوں کے عملہ کی تنخواہ ریاستی خزانہ سے دی جاتی ہے۔ جب کہ دیگر اسکولوں کے اساتذہ کی تنخواہ فی گھر آٹھ آنے کا ٹیکس جمع کرکے ادا کی جاتی ہے۔ اس میں لوگوں کی مرضی شامل ہوتی ہے۔ چار اسکول، تین

چملہ میں اور ایک اباسین کے قریب اس وجہ سے بند کر دیئے گئے کہ وہاں کے باشندے یہ ٹیکس ادا کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ سیدو میں دو سینئر اساتذہ کی خدمات برطانوی حکومت سے مستعار لی گئی ہیں۔"

علاوہ ازیں طلباء نے ٹیوشن فیس بھی ادا کی جو کہ 1954ء میں تقریباً 3115 روپے بنی جب کہ 1955ء اور 1956ء میں بالترتیب اس کا اندازہ 9 ہزار روپے اور 12 ہزار روپے لگایا گیا۔

ابتداء میں دارالحکومت میں واقع اسکولوں اور چند دیگر منتخب اسکولوں میں تعلیم مفت تھی لیکن باقی اسکولوں میں لوگ فیس ادا کرتے تھے۔ حالاں کہ بعد میں برائے نام فیس لی جاتی تھی لیکن بالعموم تعلیم مفت تھی۔ غریب طلباء ہر قسم کی فیس سے مستثنیٰ تھے۔ ان کی کتابوں اور یونی فارم کا خرچہ ریاست اٹھاتی تھی لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ساری آبادی کو مفت تعلیم کی سہولت حاصل تھی یا یہ کہ تعلیم لازمی تھی جیسا کہ بعض پروپیگنڈہ کرنے والوں نے بتایا ہے۔

تعلیم نسواں

لڑکیوں کی تعلیم کو نظر انداز نہیں کیا گیا اور 1926ء میں لڑکیوں کے لئے پہلا اسکول کھولا گیا۔ صوبہ سرحد کی خفیہ ڈائری (سیاسی) اندراج فروری 1926ء میں لکھا ہے کہ میاں گل عبدالودود نے 'سیدو میں لڑکیوں کا ایک ہائی اسکول کھولا ہے۔' تاہم آنے والے برسوں کی رپورٹوں میں جہاں ریاستی تعلیمی اداروں کا حوالہ موجود ہے وہاں لڑکیوں کے لئے کسی علاحدہ اسکول کا کوئی تذکرہ موجود نہیں۔ اس لئے لگتا ہے کہ یہ علاحدہ اسکول کھلنے کے بعد جلد ہی بند ہو گیا ہوگا۔

لڑکیوں کے لئے علاحدہ اسکول نہ ہونے کی وجہ سے مخلوط تعلیم کا رواج تھا۔ ڈائریکٹر آف ایجوکیشن پشاور ریجن اور اسسٹنٹ ڈائریکٹر آف پبلک انسٹرکشن (فرنٹیئر ریجنز) نے 1958ء میں کچھ ریاستی اسکولوں کے معائنہ کے بعد مشورہ دیا کہ 'اساتذہ اور طلباء کی بہتری کی غرض سے لڑکوں کے اسکولوں میں زیرِ تعلیم سیکنڈری اسکول لڑکیاں جتنا جلد ممکن ہو سکے لڑکیوں کے لئے قائم کردہ علاحدہ ہائی اسکول سیدو شریف میں منتقل ہو جائیں۔' لڑکیوں کے لئے علاحدہ اسکولوں کا قیام اُس رفتار سے نہیں ہوا جس رفتار سے لڑکوں کے لئے اسکول قائم کئے گئے۔ اسکولوں کی تعداد میں یقیناً اضافہ ہوا لیکن لڑکیوں کے لئے صرف تین علاحدہ اسکول قائم ہوئے وہ بھی صرف سیدو شریف اور مینگورہ میں۔

سیف الملوک حاکم نے 1962ء میں منعقدہ ایک پریس کانفرنس میں دعویٰ کیا کہ 'لڑکیوں کے لئے ایک کالج قائم کیا گیا ہے۔' یہ صرف ایک پروپیگنڈہ تھا اس لئے کہ ریاست کے دوران میں لڑکیوں کے لئے کوئی کالج قائم نہیں ہوا۔ ریاست کے ادغام کے وقت پوری ریاست میں لڑکیوں کے لئے صرف تین علاحدہ اسکول موجود تھے۔

شرحِ خواندگی

پاکستان میں 1951ء میں کی گئی مردم شماری کے مطابق ریاست سوات اور کرّم ایجنسی، فرنٹیئر ریجنز میں دو ایسے علاقے تھے جہاں پرائمری اور اُس سے اوپر تعلیم حاصل کرنے والے لوگوں کی شرح دیگر علاقوں کے مقابلہ میں قابل ذکر حد تک زیادہ تھی۔ ریاست سوات میں لڑکیوں کی تعلیم کی شرح بھی خاصی بہتر تھی۔ 1961ء کی مردم شماری کے مطابق ریاست سوات میں شرحِ خواندگی 12 فی صد تھی۔ والی صاحب کا دعویٰ ہے کہ 'ریاست کے ادغام کے وقت یہاں شرحِ خواندگی 20 فی صد تک تھی۔ یعنی چالیس برسوں میں اسے صفر سے 20 فی صد تک لے جایا گیا۔ اور یہ سب کچھ ہماری اپنی کوششوں کا نتیجہ ہے۔'

یاد رہے کہ ریاست کے قیام سے قبل جدید تعلیم تو یقیناً یہاں موجود نہیں تھی لیکن شرح خواندگی کسی صورت بھی صفر نہیں تھی۔ 1972ء کی مردم شماری رپورٹ میں جو اعداد و شمار ہیں اُس سے یہ عیاں ہے کہ ضلع سوات یعنی سابقہ ریاست سوات میں شرح خواندگی جو 1961ء کی مردم شماری کے مطابق 12 فی صد تک بتائی گئی تھی اور جسے والی صاحب نے 20 فی صد بتایا تھا دونوں صحیح نہیں تھے بلکہ مرد و زن دونوں کی مشترکہ شرح صرف 7.1 فی صد تھی (12.4 فی صد مرد اور 1.3 فی صد عورتیں تعلیم یافتہ تھیں)۔ شہری علاقوں میں یہ شرح 25.3 فی صد تھی (38.7 فی صد مرد اور 9.7 فی صد عورتیں خواندہ تھیں) جب کہ دیہی علاقوں میں شرح خواندگی صرف 6.1 فی صد تھی (10.8 فی صد مرد اور 0.8 فی صد عورتیں خواندہ تھیں)۔ یقیناً یہ سب کچھ حکمرانوں کی کوششوں کا نتیجہ تھا لیکن اس کام میں انہیں یہاں کے باشندوں، برطانوی اور بعد ازیں حکومت پاکستان اور صوبائی حکومت کی مدد بھی حاصل تھی۔

وظائف

ایک عام خیال یہ ہے کہ والی صاحب ریاستی طلباء کو بیرون ریاست حصول تعلیم میں ریاستی خزانہ یا اپنی جیب سے وظائف دیا کرتے تھے۔ والی صاحب کی جانب سے دیئے جانے والے یہ وظائف درحقیقت اُس امدادی رقم میں سے دیئے جاتے تھے جو پہلے برطانوی حکومت اور بعد میں حکومت پاکستان ریاستی حکومت کو دیا کرتی تھی جس سے باچا صاحب یہ کہہ کر دست بردار ہو گئے تھے کہ 'اسے قائد اعظم پاکستان میں تعلیمی مقاصد کے لئے استعمال کریں'۔

یوں تو یہ پیش کش قبول کر لی گئی لیکن صوبائی حکومت نے اس رقم کے بارے میں یہ فیصلہ کیا کہ اسے ان ریاستی طلباء کے لئے وظائف کی صورت میں استعمال کیا جائے گا جن کی سفارش والی صاحب کریں گے۔ اس طرح یہ وظائف صوبائی حکومت دیتی تھی۔ والی صاحب صرف ان طلباء کی سفارش کیا کرتے تھے۔ ستم ظریفی کی بات یہ ہے کہ والی صاحب نے اس رقم کو مناسب طریقہ سے استعمال نہیں کیا جس کی وجہ سے 52-1951ء میں پولیٹیکل ایجنٹ ملاکنڈ کے دفتر میں اس میں 20 ہزار روپے کی خرد برد کا واقعہ پیش آیا۔ والی صاحب نے اپنے بیان میں کچھ ایسا تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ جیسے انہوں نے اس امدادی رقم سے دست بردار ہونے کی قربانی دی ہو۔ جیسا کہ وہ کہتے ہیں۔

''میں نے فروغ تعلیم کے لئے ہر ممکن کوشش کی ہے۔ میں نے اسے اُس امدادی رقم سے گلو خلاصی کے لئے بطور اک بہانہ استعمال کیا جسے ہم وجہ شرمندگی گردانتے تھے..... جب میں حکمران بنا تو میں حکومت پاکستان کے لئے اس سے دست بردار ہو گیا لیکن جب حکومت پاکستان کی طرف سے یہ کہا گیا کہ ہم اسے ختم نہیں کر سکتے آپ اسے کسی مقصد کے لئے مختص کریں تو جواب میں میں نے کہا تعلیم: اسے تعلیمی وظائف کے لئے استعمال کیا جائے۔ وہ اسے ختم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ یہ رقم ابھی تک میرے نام جاری ہوتی ہے جسے وظیفوں کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔''

مندرجہ ذیل اقتباس سے اس بات کی وضاحت ہو جائے گی کہ درحقیقت اس امدادی رقم سے دست بردار ہونے کا فیصلہ والی صاحب کی جگہ باچا صاحب نے کیا تھا، اور اس رقم کو ریاستی طلباء کے لئے وظائف کی شکل میں استعمال کرنے کا فیصلہ بھی صوبہ سرحد کی حکومت نے کیا تھا۔ والی صاحب نے اس بات کی صحیح وضاحت نہیں کی ہے۔ مغربی پاکستان کے سیکرٹری داخلہ کے بیان کے مطابق:

''مجھے یہ کہنے کے لئے کہا گیا ہے کہ حکومت پاکستان اور ریاست سوات کے درمیان طے شدہ معاہدہ کے مطابق والئی سوات (باچا صاحب) حکومت پاکستان کی جانب سے سالانہ دس ہزار روپے امدادی رقم لینے کا حق دار ہے۔ تقسیم کے بعد جب 1948ء میں قائد اعظم پہلے گورنر جنرل کی حیثیت سے صوبہ سرحد کا دورہ کرنے آئے تو والئی سوات نے صوبائی حکومت کی وساطت سے قائد اعظم کو یہ تحریر ارسال کی۔

'مجھے اس بات کا پوری طرح سے احساس ہے کہ نوزائیدہ مملکت پاکستان کو شدید مالی مشکلات کا سامنا ہے۔ میں یہ

معاملہ میں اسے اپنا بھرپور تعاون پیش کرتا ہوں۔

حکومت پاکستان مجھے سالانہ دس ہزار روپے بطور امداد دیتی ہے۔ میں اپنی جانب سے ایک چھوٹی سی امداد کے طور پر رضا کارانہ اپنے خلوص اور اعانت کے اظہار کے لئے اس سالانہ امدادی رقم سے ہمیشہ کے لئے دست بردار ہوتا ہوں اور درخواست کرتا ہوں کہ قائداعظم اسے پاکستان کے عوام کے لئے کسی تعلیمی منصوبہ کی تکمیل کے لئے استعمال میں لائیں۔

اس پیشکش کو قبول کر لیا گیا اور سابقہ صوبہ سرحد کی حکومت نے حکم دیا کہ پولیٹیکل ایجنٹ ملاکنڈ ہر سال یہ رقم نکال لیا کریں اور اسے بطور امانت رکھ دیا کریں اور پھر اسی میں سے سوات کے طلباء کو والی کی سفارش پر وظائف دے دیا کریں۔ اس کے بعد سے والی طلباء کی سفارش کرتے ہیں۔ پولیٹیکل ایجنٹ ان ناموں کو صوبائی حکومت یا کمشنر پشاور کو ارسال کرتا ہے جو اسی رقم میں سے وظائف کی منظوری دیتا ہے۔"

والی صاحب نے سیاسی اختلافات کی وجہ سے بعض طلباء سے منظور شدہ وظائف واپس لے لئے۔ یہ امدادی رقم دیر اور چترال کے حکمرانوں کو دی جانے والی امدادی رقومات کے مقابلہ میں بہت کم تھی۔ عبدالودود نے اس سلسلہ میں بہت کوشش کی کہ اسے ریاست دیر کو دی جانے والی رقم کے برابر کر دیا جائے لیکن برطانوی حکومت راضی نہیں ہوئی۔ اس لئے موقع ملتے ہی اس سے جان چھڑائی گئی۔ والی صاحب نے بھی ریاست دیر کو دی جانے والی رقم کے مقابلہ میں اسے ایک شرم قرار دیا ہے۔

پشتو زبان کی خدمات

ریاست سوات کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس نے پشتو کو واحد سرکاری زبان قرار دیا۔ افغانستان میں بھی پشتو واحد سرکاری زبان نہیں تھی۔ وہاں اس کے ساتھ ساتھ دری زبان کو بھی سرکاری زبان کی حیثیت سے استعمال کیا جاتا تھا۔ باچا صاحب کے روداد کے انگریزی ترجمہ کے مطابق "اقتدار سنبھالنے کے بعد میں نے پشتو زبان کو ریاست کی سرکاری زبان قرار دے دیا اور اس کی تحریر کے لئے اُردو رسم الخط کو اختیار کیا۔" لیکن اسی روداد کی پشتو اشاعت میں انہوں نے کہا ہے کہ اقتدار میں آنے کے کچھ عرصہ بعد انہوں نے پشتو کو سرکاری زبان بنایا۔ اس کا مشورہ انہیں دیوتی، ٹیک پی خیل، کے ایک باشندہ ذوالفقار ملک نے دیا تھا جو کہ ان کا قریبی دوست اور ان کے لئے خفیہ ایجنٹ کا فریضہ سرانجام دیتا تھا اور اسی نے انہیں بتایا کہ افغانستان میں پشتو کو سرکاری زبان بنا دیا گیا ہے۔

جون 1937ء سے پہلے ریاست میں فارسی کو سرکاری زبان کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ کتاب نمبر 74 بلا عنوان از 21-8-1935 تا 1940-7-2 سے یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے (جو کہ گل کدہ میں قائم ڈسٹرکٹ ریکارڈ روم میں ریاست سوات کے ریکارڈ میں موجود ہے) جہاں 8 شعبان 1356 ہجری سے اندراجات کی زبان پشتو ہے جب

کے رجسٹر نمبر 138 اور 168 میں 8 جون 1937 ء اور اُس کے بعد سے اندراجات پشتو میں ہیں۔ جب کہ بے نمبر رجسٹر عنوان رجسٹر برائے تمسکات از کیم مئی 1936 ء میں اندراج نمبر 399، 6 جون 1937 ء اور اس کے بعد کے اندراجات پشتو میں ہیں۔

پشتو سرکاری زبان قرار دینے کے بعد عدالتی، فوجی اور شہری محکموں کے رجسٹروں میں سب اندراجات پشتو زبان میں ہوتی تھیں جو کہ ڈسٹرکٹ ریکارڈ روم (گل کدہ)، ڈسٹرکٹ مال خانہ (سیدو شریف) اور تحصیل سطح کے دفاتر میں موجود رجسٹروں سے عیاں ہے۔ اس دوران کسی قسم کی کاغذی کارروائی کا وجود نہیں تھا۔ 3 میاں گل عبدالودود کے عہد حکومت میں حکمران اور سرکاری افسران کے درمیان رابطہ زبانی ہوتا تھا۔ اس مقصد کے لئے زیادہ تر ٹیلی فون کے ذریعہ کو استعمال کیا جاتا تھا۔ خط و کتابت کا استعمال نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس لئے پشتو زبان ریاست کے اندر سرکاری خط و کتابت کے لئے استعمال میں نہیں تھی جب کہ برطانوی حکومت اور بعد میں حکومت پاکستان سے خط وکتابت کے لئے انگریزی زبان کو استعمال کیا جاتا تھا۔ میاں گل عبدالودود پڑھ لکھ نہیں سکتے تھے لیکن میاں گل جہان زیب پشاور سے تعلیم حاصل کرنے کی وجہ سے فارسی، اردو اور انگریزی پر عبور رکھتے تھے۔ انہیں پشتو زبان پڑھنے اور لکھنے پر بھی قدرت حاصل تھی۔ اس بات پر وہ بے جا طور پر فخر کرتے تھے۔ باپ ہی کی طرح وہ بھی اپنے احکام زیادہ تر زبانی احکامات و ہدایات دیا کرتے تھے لیکن ریاست کے ریکارڈ میں موجود بعض کاغذات پر ان کے دفتری کلرکوں کی ہاتھ سے لکھی تحریریں موجود ہیں جن پر انہوں نے دستخط کئے ہیں۔ ان میں سے بعض کو اور خام کے بعد ڈسٹرکٹ ریکارڈ روم میں محفوظ کیا گیا ہے اور زیادہ تر عرض داشتوں اور درخواستوں پر اُن کے دئے گئے جوابات پر مشتمل ہیں۔ وقتاً وقتاً وہ فرمان جاری کرتے تھے جنہیں پشتو میں طبع کیا جاتا تھا۔ سوات سے باہر کے لوگوں کے لئے اُن کے فرمانوں پر زبان اردو تھی جب کہ تعلیم اور صحت کے محکموں کی کچھ فائلوں کی زبان انگریزی ہے۔ اس سرکاری ریکارڈ روم میں موجود کاغذات میں ان کا کوئی ایسا ذاتی خط کسی اعلیٰ مرتبت شخصیت کے نام موجود نہیں ہے جو اُس دوران، جب ریاست کی سرکاری زبان پشتو تھی، لکھا گیا ہو۔

ابتداً میں رسم الخط بھدا اور سادہ تھا۔ زبان میں ناپختگی تھی اور یہ لطیف پیرایۂ اظہار سے عاری تھی۔ بہرحال اس نے سرکاری کام میں آسانی فراہم کی اور پشتو زبان کے ارتقاء میں نمایاں کردار ادا کیا۔ 1951 ء میں فرنٹیئر رجسٹر میں شرح خواندگی کے لحاظ سے پشتو کا نمبر تیسرا تھا۔ اور اس کی خواندگی کا مرکز ریاست سوات اور ملاکنڈ کا زیرِ حفاظت علاقہ تھا۔

بہت سی کتابوں جیسے کلیلہ و دمنہ، تاریخ فرشتہ / تاریخ ہندوستان کا پشتو زبان میں ترجمہ کیا گیا اور انہیں شائع کر کے لوگوں میں مفت بانٹا گیا۔ کچھ کتابیں پشتو زبان میں لکھی گئیں جیسے تاج محمد خان زیب سرکی مروج افغان،

عبدالغفور قاسمی کی تاریخِ ریاستِ سوات، محمد آصف خان کی تاریخ ریاست سوات وسوانح حیات بانئ ریاست سوات حضرت میاںگل گل شہزادہ عبدالودود خان بادشاہ صاحب۔ اسی طرح اسلامی فقہ پر مشتمل ایک کتاب فتاویٰ ودودیہ کے نام سے دو جلدوں میں شائع کی گئی۔ اُس کتاب کی زبان پشتو تھی۔

بہ ہر صورت ریاستی تعلیمی اداروں میں ذریعۂ تعلیم پشتو نہیں تھی بلکہ برطانوی ہند اور بعد از تقسیم پاکستان میں رائج ذریعہ تعلیم یہاں بھی رائج تھا۔ ان تعلیمی اداروں کا الحاق اور نصاب مُلک کے دیگر حصوں جیسا تھا۔ تاہم ان ریاستی اداروں سے فارغ ہونے والے پشتو لکھنے اور پڑھنے میں کوئی دقت محسوس نہیں کرتے تھے۔

صحت کی سہولیات

ملاکنڈ میں 1895ء میں فوجی پڑاؤ کی قیام گاہ کے بعد وہاں ایک جدید نوعیت کا اسپتال قائم کیا گیا لیکن سوات بالا میں لوگوں کو صحت کی سہولیات بہم پہنچانے کے لئے کوئی ادارہ موجود نہیں تھا۔ لوگ روایتی طرزِ علاج پر تکیہ کرنے پر مجبور تھے۔

اسپتالوں کا قیام

1915ء میں ریاست سوات کے وجود میں آنے اور 1917ء میں عبدالودود کے اقتدار میں آنے کے بعد صحت کے شعبہ کی طرف توجہ مرکوز کی گئی تاکہ لوگوں کو صحت کی جدید سہولتوں کی فراہمی ممکن بنائی جاسکے۔ 1927ء میں ریاست کے دارالحکومت سیدوشریف میں پہلی باقاعدہ ڈسپنسری کھولی گئی۔ پولیٹیکل ایجنٹ ملاکنڈ نے دسمبر 1927ء میں اس سلسلہ میں کہا کہ سواتی حکمران نے

''حال ہی میں سیدو میں ایک اسپتال کھولا ہے۔ لیڈی منٹو سوات اسپتال ملاکنڈ کے ریٹائرڈ سب اسسٹنٹ سرجن کے ایس رستم علی کو اس کا نگران مقرر کیا ہے جو ایک عرصہ تک مذکورہ بالا اسپتال کے نگران رہے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ مطلوبہ رقم ملتے ہی وہ اس کے لئے باقاعدہ عمارت تعمیر کریں گے۔''

صحت کے شعبہ کے فروغ کے لئے عبدالودود نے شمال مغربی سرحدی صوبہ کی حکومت کو درخواست کی کہ سیدوشریف میں قائم شدہ ڈسپنسری کا صوبائی محکمہ صحت کے ساتھ الحاق کر دیا جائے اور یہ کہ وہ ڈسپنسری کے عملہ کی تعطیلات و پنشن اور دیگر الاؤنسوں کی مد میں رقم جمع کرانے کے ضابطوں کی پابندی پر رضامند ہیں۔ مختلف سرکاری محکموں میں تفصیلی خط وکتابت کے بعد 20 اپریل 1929ء سے اس الحاق کی منظوری دے دی گئی۔ ملٹری سب

اسسٹنٹ سرجن غلام محمد آئی ایم ڈی کو ریاستی شہری ڈسپنسری سیدوشریف میں مقرر کیا گیا تاکہ عام شہری آبادی کی طبی ضروریات پوری کی جاسکیں۔ چھینیوں اور پنشن کی مد میں دی جانے والی رقم کو باچا صاحب کی درخواست پر بعد میں معاف کردیا گیا، تاکہ اس ضمن میں اُس کی طرف سے کی جانے والی اُن مساعی کی حوصلہ افزائی کی جاسکے جو اُس نے ایک اچھے خیراتی اسپتال کے قیام کے لئے کی ہیں اور جس پر اُس نے اچھی خاصی رقم خرچ کردی ہے۔ جب ڈاکٹر غلام محمد کی بجوزہ ترقی کے نتیجہ میں ان کی تنخواہ اور دیگر مراعات میں اضافہ کا سوال اٹھا، تو ریاست نے ان سب کو تسلیم کرتے ہوئے ان کی خدمات کو جاری رکھا۔

1947ء تک ریاست میں تین اسپتال (سینٹرل سٹیٹ اسپتال، سیدوشریف اسپتال، اور ایک ڈگر بونیر میں) قائم ہو چکے تھے۔ مردوں اور عورتوں کے لئے علاحدہ علاحدہ اسپتال قائم کئے گئے۔ سینٹرل اسپتال مردوں کے لئے اور سیدو اسپتال عورتوں کے لئے تھا۔ جب ڈاکٹر نجیب اللہ نے محکمہ صحت اور دونوں اسپتالوں کی سربراہی سنبھالی تو علیحدہ اسپتالوں کے اس نظام کو ختم کردیا گیا۔ ڈاکٹر نجیب اللہ نے اس کے لئے یہ جواز پیش کیا کہ عورتوں کو علاحدہ اسپتال چلانے کے لئے کافی زنانہ عملہ موجود نہیں تھا۔ ڈاکٹر نجیب اللہ نے اس ضمن میں کنزرووائل کا سہارا لیا اس لئے کہ بیرون ریاست سے زنانہ عملہ لیا جاسکتا تھا۔ جس طرح حکمرانوں نے دیگر شعبوں میں مطلوبہ افراد بیرون ریاست سے لاکر یہاں بسائے۔ غلام محمد اور ڈاکٹر نجیب اللہ خود اس بات کی زندہ مثال ہیں۔

ان تینوں اسپتالوں میں کل 140 بستروں کی سہولت موجود تھی۔ ایک کثیر تعداد میں بیرونی مریضوں کو روز کی بنیادوں پر علاج معالجہ کی سہولیات فراہم کی جاتی تھیں۔ 1954ء میں سینٹرل اسپتال میں کل 83052 کا علاج کیا گیا۔ بیرونی اور داخل ہر دو قسم کے مریضوں کا بالکل مفت علاج کیا جاتا تھا جب کہ داخل مریضوں کو کھانا اور چائے بھی مفت فراہم کی جاتی تھی۔ میاں گل جہان زیب دعویٰ کرتے ہیں کہ: جب میں نے زمام اقتدار سنبھالا تو میں نے مزید اسکول، اسپتال اور سڑکیں بنانی شروع کردیں۔' 1958ء تک نئے اسپتالوں اور ڈسپنسریوں کے قیام کے سلسلہ میں کوئی پیش رفت نہیں کی گئی۔ ان کی اپنی تعداد اور ان میں بستروں کی تعداد جوں کی توں رہی لیکن ہفت روزہ جمہور کے مطابق 1958ء میں '6 اسپتال، 17 ڈسپنسریاں، ایک مرکز حیوانات اور دو موبائل ڈسپنسریاں موجود تھیں۔' جب کہ مخدوم تصدق احمد 1954ء میں اسپتالوں کی تعداد 7 بتاتا ہے۔ آنے والے دس برسوں میں ان سہولتوں میں قابل ذکر اضافہ ہوا۔ 1968ء میں 611 بستروں پر مشتمل 16 اسپتال تھے اور 45 ڈسپنسریاں تھیں۔ ان کے علاوہ ریڈ کراس سینٹرل ہوم، ایک ڈینٹل کلینک، ایک جذام کلینک، اور دو عدد حیوانی صحت کے مراکز تھے۔

شروع میں موزوں اہلیت کے حامل ڈاکٹروں کی کمی کی وجہ سے کچھ اسپتالوں اور ڈسپنسریوں کی نگرانی کا کام کمپوڈروں کے ہاتھ میں تھا۔ ڈاکٹروں کی مرحلہ وار فراہمی کے بعد اسپتالوں کی نگرانی انہیں سونپ دی گئی جب کہ

ڈسپنسریاں پھر بھی کمپوڈروں کے حوالے رہیں۔

صحت کا شعبہ

حکمران محکمہ صحت کا سربراہ اعلیٰ ہوتا تھا لیکن اس محکمہ کی نگرانی کا کام کسی وزیر یا مشیر کی جگہ سید دشریف اسپتال کے طبیب اعلیٰ پہلے غلام محمد اور پھر ڈاکٹر نجیب اللہ سرانجام دیتے تھے۔ تمام اسپتالوں اور ڈسپنسریوں کی نگرانی اور ان میں دواؤں کی تقسیم و فراہمی ان کی ذمہ داری تھی۔ پرائیویٹ سیکرٹری جسے بعد میں ڈپٹی سیکرٹری اور اسسٹنٹ سیکرٹری کی مدد بھی حاصل تھی اس محکمہ کو چلانے میں حکمران کی مدد کیا کرتا تھا۔

صحت کی خدمات کو باقاعدہ بنانے کے لئے اقدامات

شعبہ صحت کی خدمات کو باقاعدہ بنانے کے لئے فرمان جاری کیا گیا کہ جن افراد نے طبیہ کالج دہلی یا طبیہ کالج لاہور یا گورنمنٹ آف پاکستان کے تحت لئے جانے والے کمپوڈروں کے تیسرے درجہ کے امتحانات کو پاس نہ کیا ہو انہیں ریاست سوات کے محکمہ صحت کے تحت لئے جانے والے دوسرے درجہ کے کمپوڈری امتحان کو پاس کرنا ہوگا۔ اس مطلوبہ اہلیت کے بغیر مغربی اور یونانی دونوں طرح کے طرز معالجہ پر پابندی ہوگی۔ دو سال کے عرصہ میں مطلوبہ اہلیت کے حصول میں ناکامی کی صورت میں ان کی اسناد ضبط کر لی جائیں گی۔ غیر سند یافتہ معالجین نے تحریری ضمانتیں جمع کرائیں کہ وہ ریاست کی حدود میں علاج معالجہ کا کام ہرگز نہیں کریں گے۔ ورنہ انہیں جرمانہ ادا کرنا پڑے گا۔

دواؤں کی فروخت بغیر لائسنس کے ممنوع تھی اور خلاف ورزی کرنے والے کو ڈائریکٹر آف ہیلتھ 100 روپے تک جرمانہ کر سکتا تھا۔ ایک دوسرے فرمان کے مطابق جنہوں نے چیچک کا ٹیکہ نہ لگوایا ہو اور ان کے گھرانہ کے کسی فرد کو چیچک کا مرض لاحق ہوا تو اُسے 50 روپے جرمانہ ادا کرنا پڑے گا۔

مذہبی تعلیم

حالاں کہ عبدالودود نے تمام با اثر مذہبی شخصیات کو ریاست بدر یا خاموش کر دیا جن سے اُس کے اقتدار کو ذرا سا خطرہ لاحق ہو سکتا تھا لیکن اُس نے اپنے طور پر مذہبی علوم کی ترویج کے لئے بھی کوشش کی۔ اسی سلسلہ میں اُس نے میاں گل جہان زیب کے مشورہ پر بت کدہ (اب گل کدہ) کے مقام پر 1943ء میں ایک دارالعلوم قائم کیا۔ دارالعلوم کے لئے عمارت اُس مقام پر تعمیر ہوئی جہاں اب سوات میوزیم قائم ہے۔ ابھی تک وہ عمارت اس میوزیم کی حدود میں موجود ہے۔ بعد میں دارالعلوم کو گراسی گراونڈز کے مقابل ایک نئی عمارت میں منتقل کر دیا گیا جہاں آج تک یہ موجود ہے۔ 1945ء میں چار باغ کے مقام پر اس کی ایک شاخ قائم کی گئی۔ ان دونوں درس گاہوں سے سوات، فرنٹیئر ریجنز اور افغانستان کے طلبہ کی ایک بڑی تعداد مستفیض ہوئی۔

طلبہ کے رہن سہن، کتابوں اور ان کے دیگر اخراجات ریاستی حکومت برداشت کرتی تھی۔ اور نامور علماء تدریس کے فرائض سرانجام دیتے تھے۔ آخری والی کہتے ہیں کہ

> ''ہمیں یہاں اچھی قابلیت واہلیت کے مالک مدرسین دست یاب ہوئے۔ ایسے افراد جو دیو بند، دہلی، فتح پور سیکری اور لکھنؤ سے فارغ التحصیل ہیں اور اپنے مضامین میں مردِ میدان ہیں۔ حالاں کہ یہ میری تجویز تھی لیکن میرے باپ نے اس طرز تعلیم کے فروغ میں ذاتی دل چسپی لی۔ اور (مارتونگ) چکیسر جیسے دور اُفتادہ علاقوں سے بھی ایک دو قابل مولویوں کو بلایا اور انہیں اپنے پاس رکھا۔''

دارالعلوم کا نصاب عربی صرف ونحو، منطق، فقہ اسلامی (جیسا کہ حدایہ میں مذکور ہے)، حدیث اور تفسیر قرآن پر مشتمل تھا۔ طلباء کو تاریخ، جغرافیہ، جنرل سائنس، حالات حاضرہ اور دنیاوی مسائل کے بارے میں کچھ نہیں پڑھایا جاتا تھا۔ ان کی ساری نصابی کتب سترھویں صدی یا اس سے بھی پہلے کی لکھی ہوئی تھیں۔

کچھ غیر اسلامی رسوم ورواج کو ختم کرنے کی بھی کوشش کی گئی جیسے ایک فتویٰ کے ذریعہ اسقاط کے عمل کو غیر

اسلامی قرار دیا گیا۔ اس سے پہلے ابتدائی قدم کے طور پر اسقاط کے ضمن میں خرچ کی جانے والی رقم کی حد بندی کی گئی اور تجہیز و تکفین سے متعلق کچھ دیگر معاملات میں اصلاح کر دی گئی۔ اسی طرح عیدالاضحیٰ کے موقع پر کی جانے والی قربانی کے بارے میں ضابطے طبع کیے گئے۔ مزید یہ کہ لوگوں کو حنفی فقہ کی روشنی میں اسلامی احکام و ہدایات سے روشناس کرانے کے لئے، اسی طرح قاضیوں کا کام آسان بنانے کی خاطر اور ان کی مدد اور رہنمائی کے لئے فتاویٰ وودودیہ کے نام سے دو جلدوں میں ایک کتاب مرتب کی گئی۔ اس کا نام میاں گل عبدالودود کے نام پر رکھا گیا۔ اس کی زبان پشتو تھی۔ تخت سے دست برداری کی وجوہات بیان کرتے ہوئے عبدالودود اس سلسلہ میں اپنی ناکامی کا اعتراف کرتے ہوئے کہتا ہے۔

"دوسری بات یہ تھی کہ میں چاہتا تھا کہ سواتیوں کی روحانی اور اخلاقی اصلاح کے لئے کچھ کروں۔ اس مقصد کے لئے میں روشن خیال فہمیدہ علماء کے ایک گروہ کے ہم راہ قریہ قریہ گھوم کر ان کی کردار سازی اسلامی اصولوں کے مطابق کرنا چاہتا تھا تاکہ وہ اچھے باعمل مسلمان بن سکیں۔"

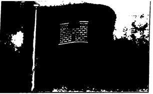
دارالعلوم کا قیام میاں گل جہان زیب کے مشورہ سے عمل میں آیا تھا۔ اُس کا یہ دعویٰ تھا کہ اُس نے اسکندر مرزا اور ایوب خان کے ساتھ بھی پاکستان میں حکومت کی سرپرستی میں مذہبی اداروں کے قیام کے موضوع پر بات چیت کی۔ تاہم اُس کے اپنے دورِ حکومت میں جدید تعلیم کے لئے تو کئی ادارے بنائے گئے لیکن اسلامی تعلیم کے فروغ کا ایک ادارہ بھی نہیں بنایا گیا۔

مستقل بندوبست اراضی

یوسف زئی اور مندنڑ قبائل پندرھویں صدی عیسوی کے آخری ربع حصہ میں کابل کے قرب و جوار سے ہجرت کر کے آئے اور شمال مغربی سرحدی صوبہ کے بعض علاقوں پر قابض ہو گئے۔ پھر زیرِ قبضہ علاقوں کی تقسیم پر اُن میں ہلاکت آفریں جنگوں کا ایک سلسلہ چھڑ گیا۔ تاہم "ہملہ، خدو خیل اور دریائے کابل تک کے کچھ اضلاع سے مندنڑ قبائل کے حق میں دست بردار ہونے کے بعد امن قائم ہوا۔ جب کہ یوسف زئی قبائل نے اپنے قبضہ کو پوران، چکیسر، کانڑا، غور بند... اور سوات (ریاست) کے کچھ دیگر ذیلی علاقوں تک پھیلا دیا"

روایتی تقسیم اراضی نظام

مقبوضہ علاقوں کو یوسف زئی قبیلہ کے ایک سربراہ شیخ ملی نے قبیلہ کی مختلف شاخوں میں بانٹ دیا لیکن قطعات



ریاست سوات کا جھنڈا۔ بہ شکریہ جارج کیلے، سوات: سوئٹزر لینڈ آف دی ایسٹ

(مقام اشاعت ندارد، 1963ء)



کوٹہ قلعہ 1956ء کا ایک منظر۔ 1990ء کی دہائی کے وسط میں انہدام سے پہلے

بہ شکریہ ماہر تعمیرات شوکت علی شرار

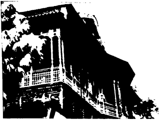


والی صاحب کی رہائش گاہ، سیدو شریف، کا ایک منظر۔ بہ شکریہ محمد اسماعیل ذبیح

مناظر سوات (مقام اشاعت ندارد، 1954ء)



شاہ وزیر خان کے ڈیرہ کا ایک منظر (اب منہدم)، توتانو بانڈئی (1987ء)
بہ شکریہ پروفیسر خورشید



بہرام خان کے ڈیرہ کا ایک منظر، شاہ ڈھیرئی (1987ء)۔ بہ شکریہ پروفیسر خورشید

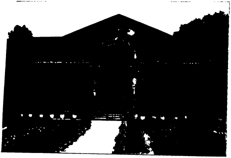


قلندر ملک کے ڈیرہ کا ایک منظر، جنگرامہ (1987ء)۔ بہ شکریہ پروفیسر خورشید



دارالعلوم کی پہلی عمارت کا ایک منظر۔اب سوات میوزیم کی حدود میں (2005ء)

بہ شکریہ پروفیسر عبدالوہاب خان



سوات میوزیم کے سامنے کا منظر (2005ء)۔ بہ شکریہ پروفیسر عبدالوہاب خان

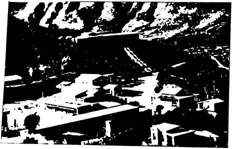


جہان زیب کالج کے سامنے کا منظر (2005ء)۔ بشکریہ پروفیسر عبدالوہاب خان





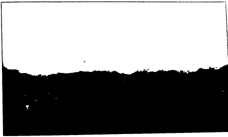
موتی محل مرغزار، باچا صاحب کی گرمائی قیام گاہ کا ایک منظر۔ بشکریہ محمد اسماعیل ذبیح
مناظر سوات (مقام اشاعت ندارد، 1954ء)



عقبی سیدو شریف میں واقع باچا صاحب کی رہائش گاہ اور دفتر کا ایک منظر
بشکریہ محمد اسماعیل ذبیح، مناظر سوات (مقام اشاعت ندارد، 1954ء)



شانگلہ ریسٹ ہاؤس، شانگلہ۔ بہ شکریہ جارج کیتھلے سوات، ہسٹری اینڈ آف دی ایسٹ
(مقام اشاعت ندارد، 1963ء)



کانجو کے قریب دریائے سوات پر واقع پل (چوبی)، تکمیل 1928ء۔ بہ شکریہ عبدالغفور قاسمی
دی ہسٹری آف سوات (طابع ڈی۔سی۔آنند اینڈ سنز، 1940ء)



والی صاحب کی رہائش گاہ سیدو شریف سوات کا ایک منظر (2006ء)
بہ شکریہ اختر ایوب ایڈووکیٹ اور سرجن محمد عثمان (ایف آر سی ایس)



والی صاحب کی رہائش گاہ سیدو شریف سوات کے سامنے (2006ء)
بہ شکریہ اختر ایوب ایڈووکیٹ اور سرجن محمد عثمان (ایف آر سی ایس)



سیدو بابا مسجد سیدو شریف سوات کا ایک منظر (2006ء)
بشکریہ اختر ایوب ایڈووکیٹ اور سرجن محمد عثمان (ایف آر سی ایس)



وودود یہ ہال سیدو شریف سوات کا ایک منظر (2006ء)
بشکریہ اختر ایوب ایڈووکیٹ اور سرجن محمد عثمان (ایف آر سی ایس)

راضی میں زرخیزی، فراہمیِ آب، محل وقوع اور قابلِ رسائی ہونے یا نہ ہونے کی وجہ سے بہت زیادہ فرق موجود تھا۔ شیخ ملی نے اس ارادے سے کہ سب کو ان زمینوں سے یکساں فائدہ اٹھانے کا موقع ملے تقسیم اراضی کا ایک انوکھا نظام متعارف کرایا۔[4] جس کے مطابق یہ تقسیم (ویش) عارضی بنیادوں پر ایک متعین وقت کے لئے ہوتی تھی۔ اُس وقت کے گذرنے کے ساتھ زمین کے مالکان کے درمیان زمین کا تبادلہ ہوتا تھا۔ اس کے لئے حسنزے (قرعہ اندازی) یا ویش (تقسیم) کے لفظ استعمال کئے جاتے تھے۔

یوں تو ویش کا مطلب تقسیم ہے لیکن اس کے لئے زیادہ موزوں لفظ تفویض (یا الاٹمنٹ) بنتا ہے۔ اس نظام کے تحت قبیلہ کی بڑی شاخوں کو تفویض شدہ اراضی اُن کی ذیلی شاخوں کے درمیان ازل بدل کے قانون کے تحت ان کے ہاتھوں میں 5، 7 یا 10 سال کے لئے ہوتی تھی۔ اس دورانئے میں یہ ذیلی شاخیں اپنی رضامندی سے ردو بدل کر سکتی تھیں۔ مالکان کے درمیان تبادلہ زمین کا طریقہ کار حسنزے یعنی قرعہ اندازی تھی۔ ہر نئی تفویض یا تبادلہ کے موقع پر حصہ دار نئے قطعات اراضی میں اپنے اپنے حصوں کے مطابق نئے گھروں میں منتقل ہو جاتے تھے۔ ہر گاؤں میں موجود زمینیں اپنی نوعیت کے مطابق مختلف درجات رکھتی تھیں۔ اس لئے حصہ داروں میں اس کی تقسیم اس طرح سے کی جاتی تھی کہ نفع اور نقصان میں ان کی شراکت یکساں ہو۔[5] اس نظام کو گرزندہ ویش (موبائل نظام تقسیم) کہا جاتا تھا۔ شیخ ملی نے اس نظام تقسیم کی پوری تفصیل جزئیات کی حد تک اپنی مستند کتاب دفترِ شیخ ملی میں محفوظ کر لی تھی لیکن زمانے کے دست برد سے اسے محفوظ نہیں رکھا جا سکا اور اس کا کوئی ایک نسخہ بھی موجود نہیں ہے صرف نام موجود ہے۔ خوشحال خان خٹک نے سترھویں صدی میں اپنے مندرجہ ذیل شعر میں اس کا حوالہ دیا ہے۔

دوہ کارہ دی پہ سوات کے کہ خفی دی کہ جلی
مخزن د درویزہ دے یا دفتر د شیخ ملی

ترجمہ: سوات میں کارہائے نمایاں دو ہیں۔ اخون درویزہ کا مخزن یا شیخ ملی کا دفتر۔

اس شعر کو یوں بھی کہا گیا ہے۔

پہ سوات کے دی دا دوہ کفرہ جلی
یو مخزن د درویزہ دے بل دفتر د شیخ ملی

ترجمہ: سوات میں نمایاں نوعیت کے دو کفر ہیں۔ ایک درویزہ کا مخزن اور دوسرا شیخ ملی کا دفتر۔

1858ء میں میجر راورٹی نے دفترِ شیخ ملی کے کسی نسخہ کی تلاش کے لئے قندھار کے ایک باشندہ کو بھیجا۔ اُس نے پوری وادی چھان ماری لیکن کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔

روایتی نظامِ ویش کے نقصانات

حالاں کہ اس انوکھے نظامِ تقسیم کے پیچھے نیک نیتی کارفرما تھی لیکن اس میں کئی قسم کے نقائص تھے۔ اے۔ا۔ میکموحسن اور اے۔ ڈی۔ جی رمزے اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہتے ہیں۔

''چاہے قبائلی اور گروہی نظم ونسق برقرار رکھنے کے لئے یہ نظام کار بہ ظاہر کتنا ہی شاندار کیوں نہ لگے، اسی طرح ایک پٹھان قبیلہ کی تازہ ثبات پسندی اور نتیجتاً خون آشام فطرت کی تسکین کا اس میں کتنا ہی سامان کیوں نہ ہو لیکن جہاں تک تہذیب وتمدن کی ترقی کا تعلق ہے تو اس کے لئے اس عارضی نوعیت کے انتظام زمین کے نظام سے زیادہ تباہ کن نظام کا تصور بھی ناممکن ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ زمین کا عارضی مالک کم سے کم قیمت پر اس کا زیادہ سے زیادہ خون نچوڑ سکے۔ اُسے کیا پڑی ہے کہ کل کو پرائی ہونے والی اس زمین کو زرخیز بنانے کے جتن کرے، اس پر پیڑ اگائے، یا کسی موجودہ پیڑ کو محفوظ کرنے کی کوشش کرے یا کوئی باغ لگائے تاکہ کل کو کوئی دوسرا آ کر اس کی محنت کا پھل کھائے۔ اسی طرح اپنی عارضی قیام گاہ کی تعمیر کے لئے مٹی گارے اور گھاس پھونس کے علاوہ مضبوط قسم کے اجزا کا استعمال بڑی حماقت ہی ہوسکتی ہے۔ اسی طرح سنگین چاردیواری جس پر حملہ آور کی گولیاں اثر انداز نہ ہوں تعمیر کرنا بھی عقل ودانش سے دوری ہی کی علامت ہوسکتی ہے۔ اس نظام کے برے نتائج ہر طرف نظر آتے ہیں۔ کہیں باغات ہیں نہ سرسبز وشاداب درخت، صرف مزاروں کی حدود میں کچھ پیڑ نظر آتے ہیں۔ مساجد تک ارزاں ترین اجزاء سے بنائی گئی ہیں۔ گارے مٹی اور پتھر کی بھدی دیواریں اور گھاس پھونس کی چھت، اور ایک جانب ایک صحن۔ زمانہ قدیم سے جو زمینیں آب پاشی کے کسی نظام کے تحت ہیں ان میں بہتری یا اضافہ کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ اکثر زمینیں بارانی ہیں۔ حالاں کہ بہت سے ایسے علاقے ہیں جہاں باہمی تعاون کے ذریعے بہت سی زمینوں کو زیر آب لایا جاسکتا ہے۔ لیکن بات یہ ہے کہ کوئی گروہ غیروں کے فائدہ کے لئے کیوں اپنے پنے پانی کرے گا۔''

خوشحال خان خٹک (جس نے سترھویں صدی میں سوات کا دورہ کیا تھا) نے اس نظام کے نقائص اور اس کے برے نتائج بیان کئے ہیں۔ وہ اس خراب نظام کی وجہ سے یوسف زئی قبائل کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ قرعہ اندازی کے ذریعہ سال بہ سال اپنی املاک سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ اس طرح یہ خود ہی طاقت کے استعمال کے بغیر اپنے اوپر حملہ آور ہوتے رہتے ہیں۔

لوگ ایک طرح سے خانہ بدوش زندگی گزارتے تھے اور بعض اوقات زرخیز قطعات اراضی پر قابض اپنا قبضہ چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہوتے تھے اور اس طرح ایک جھگڑا اچل پڑتا جس کے لئے کئی جانوں کا نذرانہ دینا پڑتا۔ ریاست کے دور میں بھی اُس جگہ جہاں دارالحکومت واقع ہے بابوزئی قبیلہ کی دو شاخوں ابا خیل اور برت خیل کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ اس لیے کہ آٹھ ماہ قبل ویش (تقسیم) طے ہونے کے باوجود ابا خیل قبضہ چھوڑنے کے لئے تیار نہیں تھے لہٰذا انہوں نے 8 فروری 1919ء کو اس پر اعتراض کیا۔ برت خیل شاخ نے نیک پی خیل کے ایک لشکر کی مدد سے متعلقہ دیہاتوں پر قبضہ کرلیا اور وہاں سے ابا خیل کو نکال دیا۔ باری باری دونوں کا ساتھ دینے سے دونوں فریق

عبدالودود کے خلاف ہو گئے۔ اس طرح یہ نظام اُس کے لئے بھی ایک دردِ سر بن گیا۔

روایتی نظام ویش کا خاتمہ

عبدالودود نے اپنی پوزیشن مستحکم کرنے کے بعد اس نظامِ ویش کو ترقی کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ گردانتے ہوئے ختم کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ اس سے صرف حال ہی نہیں بلکہ مستقبل میں بھی بار بار سر اٹھانے والے مسائل سے نجات مل جائے گی۔ اکبر ایس احمد اس حقیقت (کہ اس اقدام میں باچا صاحب کے ذاتی اغراض و مقاصد تھے) کو تسلیم کرتے ہوئے کہتا ہے کہ 'وفادار خوانین کی حمایت کو مزید مستحکم بنیادیں فراہم کرنے کے لئے اس نے مختلف قسم کی اصلاحات کو متعارف کرایا۔ جیسے ویش کے اس نظام کا خاتمہ جس سے اُس نے اپنے دشمنوں کو ہمیشہ کے لئے ان کی زمینوں سے محروم کر دیا۔ جب کہ اپنے وفاداروں کو اس طرح نواز کر ہمیشہ کے لئے زیر بار احسان بنا دیا۔' مانتا ہے کہ ان اصلاحات جیسے کہ ویش کے پیچھے اُس کے ذاتی مقاصد کارفرما تھے اور یہ کہ اُس نے کھل کر اراضی کے مستقل بندوبست کے موقع پر اپنی ذاتی پسند ناپسند سے کام لیا۔ یہ ایک معلوم حقیقت تھی لیکن باچا صاحب کے خاص وفادار لوگوں نے مصنف کے ساتھ اپنی ملاقاتوں میں اس بات کو ماننے سے انکار کر دیا۔ تاہم اُس نے اپنے سارے مخالفین کو ہمیشہ کے لئے ان کی اراضی سے محروم نہیں کیا۔

باچا صاحب سے منسوب روداد میں بیان کیا گیا ہے کہ:

''مروجہ نظام ایک لعنت تھی۔ جب تک یہ چلتا رہا تو یہ ایک مستقل خلش کی صورت مجھے بے چین کئے رہا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ تمام برائیوں کی جڑ یہی نظام ہے اور جب تک میری ذہنی طور پر ناپختہ اور جاہل رعایا زمین کی اس عارضی تقسیم سے نجات حاصل نہ کرلیں وہ ترقی کی شاہراہ پر گامزن نہ ہو سکیں گے۔''

باچا صاحب کی روداد کی پشتو اشاعت میں یہ بیان شامل نہیں ہے۔ اسی بحث کو جاری رکھتے ہوئے کہا گیا ہے کہ 'اپنی بھاری بھرکم ذمہ داریوں کا پوری طرح احساس کرتے ہوئے میں نے بندوبست اراضی کے مسئلہ کو فوری طور پر حل کرنے میں اپنی تمام توانائیاں صرف کر دیں۔ اس مسئلہ کو معرضِ التوا میں نہیں ڈالا جا سکتا تھا۔ جیسے ہی جنگوں سے مجھے سانس لینے کی مہلت ملی، میں نے اراضی اصلاحات کا پروگرام بنایا۔' ان مسائل اور مشکلات کے بارے میں اُس نے کہا۔

''اس عظیم الشان منصوبہ کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے مجھے بے حد و حساب رکاوٹوں کا سامنا کرنا تھا۔ دن بھر طویل فاصلوں سے گذر کر صبر آزما جرگوں کا انعقاد کرتا۔ اپنے منصوبہ کے حق میں لمبی لمبی تقریریں کرتا۔ شاندار مستقبل کے خواب دکھاتا اور لوگوں کے ساتھ فرش پر راتیں گذارتا۔ کسی گھوڑے کی طرح رات دن کام کرتا، لوگوں کی شکایات سن کر ان کا ازالہ کرتا اور پو پھٹ

باچا صاحب سے منسوب روداد میں مستقل بندوبست اراضی کی اس دشوار مہم کو سر کرنے کا سہرا صرف انہی کے سر باندھا گیا ہے۔ حالاں کہ یہ ایک کھلی حقیقت ہے جس کا والی صاحب نے بھی اعتراف کیا ہے کہ اس ضمن میں وزیر برادران نے بھی ہر طرح سے شب و روز ایک کر کے ان کا ساتھ دیا۔ پوری ریاست میں اس کام کو مکمل کرنے میں پانچ سال لگ گئے۔ باچا صاحب بیان کرتے ہیں۔

"مجھے اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں پورے پانچ سال لگ گئے۔ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ کام ان خونی مہموں سے زیادہ دشوار اور سخت جاں گسل ثابت ہوا جن میں کئی برسوں تک جان کھپانی پڑی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس میں اپنوں کی ناراضگی اور غیض و غضب کا سامنا کرنا پڑا لیکن ان تمام تر مشکلات کے باوجود میں اس کام سے پیچھے نہیں ہٹا تا کہ اپنے لوگوں کو خانہ بدوشی کی تکلیف دہ زندگی سے نجات دلا کر انہیں خوشحالی اور ترقی کی شاہراہ پر گامزن کر سکوں۔ بالآخر کامیابی نصیب ہوئی اور اپنے عوام کی اصلاح و بہتری کی کوششیں بار آور ثابت ہو سکیں۔"

مستقل ویش کے ساتھ سوات امن و ترقی کی راہ پر گامزن ہوا اور خوب صورت عمارات، فارم اور گھر معرض وجود میں آئے۔

مستقل بندوبست اراضی کب ہوا

اس ضمن میں باچا صاحب اور والی صاحب مختلف تاریخیں دیتے ہیں۔ والی صاحب کے مطابق یہ کام اندازاً 1930-31ء اور 1928ء تا 1932ء میں ہوا جب کہ باچا صاحب کے مطابق یہ سلسلہ 1925ء میں شروع ہوا اور 1929ء میں مکمل ہوا۔

مارچ 1926ء میں اورل سٹائن بیان کرتا ہے کہ اُسے بتایا گیا ہے کہ بادشاہ (عبدالودود) اپنی رعایا کو اس عارضی تقسیم اراضی کی مصیبت سے نجات دلانے کے لئے کوشاں ہے۔ اس طرح وہ اشارتاً بتاتا ہے کہ اُس کام کا آغاز کر دیا گیا ہے۔ جب کہ شمال مغربی سرحدی صوبہ کی خفیہ ڈائری (سیاسی) میں مئی 1925ء میں یہ تحریر ملتی ہے۔

"میاں گل عبدالودود نے سوات بالا کے تمام قبائل کے سرکردہ راہنماؤں کو گل کے مقام پر مدعو کیا ہے تا کہ تمام حل طلب معاملات کو زیر بحث لایا جا سکے۔

عزی خیل قبیلہ کے قائدین کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ انہوں نے چک درہ کے مقام پر نواب دیر سے ملاقات کر کے اُسے اپنی وفاداری کا یقین دلایا ہے لیکن اب میاں گل نے بھاری انعام و اکرام سے نواز کر انہیں رام کر لیا ہے اور وہ قبائلی اراضی کے مستقل بندوبست پر راضی ہو گئے ہیں۔"

اس بیان سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ عمل 1925ء میں شروع ہوا۔ اس سے باچا صاحب کی روداد میں دی

گئی تاریخ 1925ء تا1929ء کی تصدیق ہوتی ہے۔ جارج مارگنسٹرین نے بھی اپریل 1929ء میں سوات اور دیر کا تقابلی جائزہ لیتے ہوئے بتایا ہے کہ عارضی تقسیم اراضی کا نظام صرف دیر میں رائج ہے۔

مستقل بندوبست تو ہو گیا لیکن عارضی نظام ویش کو پوری ریاست سے ختم نہیں کیا جا سکا۔ دیہاتوں میں گھروں اور ان کے نزدیک واقع اراضی کو مستقل بنیاد پر لوگوں کو تفویض کر دیا گیا تاکہ گھروں کی تعمیر اور باغ وغیرہ لگانے کا کام ہو سکے لیکن ان دیہاتوں میں اراضی کی مستقل تقسیم کا عمل مختلف علاقوں میں مختلف اوقات میں کہیں بہت بعد میں کیا گیا۔ بعض جگہوں پر تو یہ کام ریاست کے ادغام کے بعد 1970ء کی دہائی میں سرانجام دیا گیا اور بعض دیہاتوں میں 1990ء کی دہائی میں یہ مکمل ہوا۔

وہ اراضی جس کا تبادلہ اس نظام ویش کے تحت ہوتا رہتا تھا، دوتر (دفتر) اور اس قسم کے مالکان دوتریان (واحد۔ دوتری) کہلاتے تھے لیکن کچھ اراضی ایسی بھی تھی جو مروجہ نظام ویش سے مستثنیٰ تھی۔ اس قسم کی اراضی کو سیریٔ کہا جاتا تھا اور اسے شیخ ملی کی تقسیم میں خاص قسم کے لوگوں کو تفویض کیا گیا تھا جیسے سید، میاں، ملا اور صاحب زادہ انچ جی راورٹی نے دوتر اور سیریٔ کے بارے میں کہا ہے۔

"اراضی کا وہ حصہ جو (افغانوں، پختونوں کی) بڑی شاخ کو تفویض کیا گیا تھا، اسے اصطلاحاً دفتر کہا جاتا تھا اور جو اراضی سیدوں، میاں، ملا اور تین اتحادی قبائل کے حوالے کیا گیا اسے اصطلاحاً سیریٔ کہا گیا۔ ان اصطلاحی ناموں کا استعمال ابھی تک جاری ہے اور متنازعہ معاملات میں شیخ ملی کی طے کردہ تقسیم کا حوالہ آج تک دیا جاتا ہے۔ دفتر ایک فارسی لفظ ہے جس کا مفہوم ہے قلم بند معلومات، اندراجات کی کتاب، دستاویزات کا ذخیرہ۔ یہاں اسے بطور صفت استعمال کیا گیا ہے یعنی قلم بند شدہ معلومات، اندراج شدہ چیزوں کی کتاب۔ اور سیریٔ پشتو لفظ ہے جس کا مفہوم ہے تقسیم شدہ، جدا، علاحدہ وغیرہ یہاں اس سے مراد ہے تفویض شدہ، حصہ کیا ہوا وغیرہ۔"

بعد ازاں اکثر قبائلی ویش (تقسیم) کے وقت اکثر نئی اراضی سیریٔ کے طور پر تفویض کیا کرتے تھے۔ ان اراضی کے مالکان کو سیری مار یا ستانہ دار کہا جاتا تھا۔ سیریٔ مساجد کو اور بعض اوقات چیش اماموں کو بھی تفویض کردی جاتی تھی۔ تاہم بہت سے خوانین اور ملک بھی سیریٔ اراضی رکھتے تھے جسے تقسیم سے مختلف ناموں سے مستثنیٰ قرار دے دیا جاتا تھا۔ مثلاً د خانئ سیریٔ (خان کے لیے مختص سیریٔ)، ذ ذاؤے سیریٔ (مہمانوں کی کھلی کے بھنوں سے تواضع کے لیے مختص سیریٔ) دمیلمہ سیریٔ (مہمانوں کی خاطر تواضع کے لیے مختص سیریٔ)، دتیلوسیریٔ (تیل یا مجرہ کے دیے کو جلانے کے لیے مختص سیریٔ)۔ اصولاً تو خان اور ملک کا منصب قبائل کی خواہش و منشا کے مطابق کسی کو دیا جاتا تھا لیکن عملاً یہ منصب موروثی ہوتا تھا۔ اس لیے خوانین اور ملکوں کے خاندان ان سیریٔ اراضی کو اپنی ملکیت گردانتے ہوئے استعمال کرتے تھے۔ چوں کہ یہ قطعات اراضی تقسیم کے اس مروجہ نظام سے مستثنیٰ ہوتی تھیں، اس لیے خوانین اور ملک اپنے دوتر کے علاوہ ان بڑے قطعات اراضی سے بھی مستفیض ہوتے رہتے تھے۔

نظام ویش اور مستقل بندوبست کے بارے میں غلط فہمی

یہ کہنا غلط ہے کہ عبدالودود نے ویش نظام کو ختم کر دیا اور جو جس قطعہ اراضی پر قابض تھا وہ اُس کا مالک بن گیا۔ یا یہ کہ بانی ریاست سوات نے موجود تفویض اراضی کو حتمی قرار دے دیا۔ 'روایتی نظامِ ویش اور مستقل بندوبست اراضی کے بارے میں شیر افضل خان بریکوٹی کے نقطہ نظر سے تو یوں لگتا ہے جیسے عبدالودود کی جانب سے ہر شخص کو ایک قطعہ اراضی دیا گیا اور ہر کوئی زمین کا مالک بنا۔ اسی طرح اکبر ایس احمد دعویٰ کرتے ہیں کہ

> ''ویش' کو منجمد کر دیا گیا اور اُس وقت زمین پر قابض کو مالک قرار دے کر ریاست نے خان کی حیثیت کو بہت کمزور کر دیا..... اراضی جائیداد کے حقوق کے یوں انجماد سے یوسف زئی پختون کے زمین پر از خود استحقاق کے پر اسرار روایتی قانون پر ایسی ضرب پڑی کہ اُس کی بنیادیں تک ہل گئیں۔ اس نظام کے باقاعدہ خاتمہ کا مطلب صرف اُس علامتی حیثیت کا خاتمہ نہیں تھا بلکہ اس میں مجموعی یوسف زئی روایت کے اختتام کے بارے میں ایک اشارہ بھی پنہاں تھا۔''

لیکن حقائق کچھ اور ہی بتاتے ہیں۔ مستقل بندوبست اراضی کے وقت 'زمین پر اُس وقت کے قبضہ' کو تسلیم نہیں کیا گیا۔ درحقیقت اُس وقت قرعہ اندازی کی گئی (چاہے صحیح یا اس میں دھوکہ دہی کی گئی) اور بحیثیت مجموعی سب کو نئی جگہوں پر نئے دیہاتوں میں نئی تفویض کے مطابق بھیج دیا گیا۔ زمین پر استحقاق کے حقوق جوں کے توں رہے۔ ریاست نے اُن کو تسلیم کیا بلکہ انہیں مزید مستحکم کیا۔ 1950ء میں میاں گل جہان زیب نے حاکم بابوزئی کے نام ایک فرمان جاری کیا جس میں کہا گیا کہ باچا صاحب اور میرے حکم کے مطابق[6] سوات میں گوجر برادری کو دوتر یا سیری قسم کی اراضی پر حقِ ملکیت حاصل نہیں ہے۔ اگر اُن میں سے کوئی ایسا دعویٰ کرے تو اُسے تحریری تمسک (زمین کے لین دین کا دستاویزی ثبوت) یا بیس معتبرین کی گواہی پیش کرنی ہوگی۔ وہ زمین جو مختلف پیشہ ور افراد جیسے ایگر (لوہار)، دروزگر (بڑھئی)، نشانچی (علم بردار)، جالاوان (ملاح) وغیرہ کے قبضہ میں ہے پختونوں کا دوتر ہے۔ (اس سیاق وسباق میں پختونوں سے مراد وہ لوگ ہیں جو پختونوں کی کسی شاخ سے تعلق رکھتے ہوں اور اُن کو تفویض شدہ قطعات اراضی میں سے اپنا حصہ رکھتے ہوں اور وہ لوگ بھی جو حالاں کہ پختونوں کی کسی شاخ سے تعلق نہیں رکھتے لیکن کسی طرح سے دوتر میں سے کوئی حصہ رکھتے ہوں)۔ اس طرح ریاست نے کبھی بھی خان کی حیثیت کمزور نہیں کی اور نسب کی بنیاد پر اُس کی زمین پر استحقاق کو پہلے کی طرح برقرار رکھا گیا بلکہ اس حق کو محفوظ کر کے مزید مستحکم کر دیا گیا۔ البتہ غیر پختون افراد متعلقہ خان اور ملک کی رضامندی سے زمین خرید سکتے تھے جیسا کہ قبل از ریاست دور میں ہوتا تھا۔

اسی طرح سبط حسن نے روایتی نظامِ ویش کو ایک اور طرح غلط رنگ میں پیش کیا ہے۔ اُس نے اسے قبیلے کے

نام افراد میں زمین کی مساویانہ تقسیم سمجھا ہے اور اس سے کمیونزم میں زمین کو ریاست کے زیر قبضہ عوام کی اجتماعی ملکیت کا جواز پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

یہاں مناسب لگتا ہے کہ روایتی نظام ویش کے بارے میں اس عام تاثر کو باطل قرار دے کر ختم کر دیا جائے کہ اس کے ذریعہ سے زمین کو لوگوں میں مساویانہ انداز میں دوبارہ تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ درآں حالیکہ اس روایتی نظام ویش میں زمین کو قبیلہ یا خاندان میں وقت معین پر ازسرنو تقسیم کیا جاتا تھا لیکن اب کبھی نہیں ہوا کہ اُسے سب میں یکساں حصوں کی صورت میں بانٹا گیا ہو۔ دراصل ہر حصہ دار کو ازسرنو تقسیم کے وقت بھی اپنے سابقہ حصہ کے مطابق حصہ ملتا تھا۔ کمزور اور غریب حصہ داروں کو کبھی کبھی ازسرنو تفویض کے موقع پر اپنے حصہ سے محروم کر دیا جاتا تھا۔ اگر کوئی شخص اپنے حصہ کو سے فروخت یا کسی طاقت ور فرد کی وجہ سے محروم ہو جاتا تو بعد میں بھی اُسے کچھ نہ ملتا۔ اگر وہ اپنے حصہ کے کسی حصہ سے محروم ہوتا تو اُسے بقیہ حصہ کے مطابق حصہ ملتا تھا۔

ایک شخص اُسی وقت تک پختون کہلائے جانے کا مستحق ہوتا تھا جب تک وہ دوتر میں حصہ دار ہوتا۔ اگر کسی وجہ سے وہ اپنا حصہ کھو دیتا تو دوبارہ تقسیم یا تفویض کے موقع پر اُسے کچھ بھی نہیں ملتا تھا۔ وہ اپنے خاندان یا قبیلہ کے ساتھ نئی تفویض شدہ جگہ جا سکتا تھا لیکن وہ اور اُس کی اولاد پختون کی حیثیت سے اپنی شناخت سے ہی محروم نہ ہوتے بلکہ کسی جرگہ میں شرکت کے حق سے بھی محروم ہو جاتے۔

'سوات کی کہانی' 'دی سٹوری آف سوات' میں شامل یہ بیان کہ 'آخر میں یہ کہ زمین کی ازسرنو مساویانہ تقسیم یعنی ہر فرد کو زرخیز اور بنجر دونوں طرح کی زمینوں میں یکساں حصہ کی تفویض' گمراہ کن ہے اور کتاب کی پشتو اشاعت میں شامل نہیں۔ 'سوات کی کہانی' میں ایسے کئی بیانات شامل ہیں جو باچا صاحب کی روداد کی پشتو اشاعت میں موجود نہیں ہیں۔

اباسین اور سوات کوہستان میں زمین کی ملکیت

اباسین کوہستان میں بھی وہی نظام رائج تھا جو کہ یوسف زئی زیر قبضہ علاقے میں رائج تھا۔ یہاں بھی کچھ زمینیں دوتر کی شکل میں کوہستانیوں کے قبضہ میں تھیں اور کچھ زمینیں سیری کی صورت میں مقدس خاندانوں کی ملکیت تھیں۔ وہ زمینیں جو دوتر کے ذیل میں آتی تھیں وہ نظام ویش کے تحت ہوتی تھیں اور اُن کی مقررہ اوقات میں اپنی کوہستانی خاندانوں اور افراد کے درمیان ازسرنو تقسیم اور تفویض ہوتی تھی جو کسی نسبی تعلق کی وجہ سے اس کا استحقاق رکھتے تھے۔ یہاں بھی اس نظام کو سوات کے حکمران نے ایک فرمان کے ذریعہ 1948 میں ختم کر دیا اور اس کی جگہ

مستقل بندوبست اراضی کا وہی نظام رائج کر دیا جو کہ ریاست کے دیگر حصوں میں رائج کر دیا گیا تھا۔ اباسین کوہستان میں بھی وہی قوانین وضوابط کارفرما تھے جو کہ یوسف زئی غلبہ والے علاقوں میں رائج تھے۔ حصہ داری کے لئے کوہستانی شجرہ نسب کا ہونا شرط تھا اور دوبارہ تقسیم میں بھی پرانی تقسیم کے مطابق ہی حصہ ملتا تھا۔ اور اگر کوئی کسی وجہ سے اپنے حصہ سے محروم ہو جاتا تھا تو دوبارہ تقسیم میں بھی اُسے کچھ نہیں ملتا تھا۔

سوات کوہستان میں بھی زمین اپنی دو قسموں یعنی دوتر اور سیری میں تقسیم تھی اور ان دونوں قسموں کی وہی حیثیت تھی جو کہ یوسف زئی غلبہ والے علاقوں اور اباسین کوہستان میں انہیں حاصل تھی لیکن یہاں دوتر نامعلوم زمانہ سے مستقل بنیاد پر تقسیم ہو چکی تھی اس لئے بار بار تقسیم کی مصیبت سے یہ علاقہ محفوظ تھا۔

مواصلات

کسی قوم کی ترقی اور پیش قدمی کا انحصار نظامِ مواصلات پر ہوتا ہے۔ اس نظام کی مثال انسانی بدن میں خون کی ترسیل کے نظام جیسا ہے جس پر زندگی کی بنیاد قائم ہے۔ قبل از ریاست عہد میں سوات میں مواصلات کا نظام بہت ہی بنیادی نوعیت کا تھا۔ باچا صاحب کے مطابق سڑکیں اور شاہراہیں بالکل معدوم تھیں۔ لوگ نہروں اور ندیوں کے کنارے موجود پگڈنڈیوں پر پیدل یا پانچے اٹھائے چلنے پر مجبور تھے۔ اس لئے کہ جگہ جگہ موجود پانی میں اتر کر اُسے عبور کرنا پڑتا تھا۔

وہ اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے مزید کہتا ہے۔

"مجھے یقین تھا کہ کوئی حکومت اُس وقت تک موثر طریقہ سے نہیں چلائی جا سکتی جب تک سارے زیر قبضہ علاقے آسانی قابل رسائی نہ ہوں اس لئے سارے اہم قصبوں کو سیدو شریف (دارالحکومت) سے مربوط بنانا انتہائی اہمیت کا حامل تھا۔ اس لئے میں اپنے سارے زیر قبضہ علاقے میں سڑکیں بنانے پر ہٹ گیا۔ یہ بہت مشکل کام تھا اس لئے اس کا جلد مکمل ہونا ممکن نہیں تھا۔"

عبدالودود نے زندگی کی ابتداء ہی میں محسوس کر لیا تھا کہ سڑکوں اور مواصلات کے اچھے نظام کی کتنی اہمیت ہے۔ مارچ 1906ء میں وہ پولیٹیکل ایجنٹ سے ملا اور اُس سے اپنے لئے ایک موٹر کار خریدنے اور چکدرہ تک سڑک کی توسیع کے مسئلہ پر گفت گو کی۔ 1917ء میں برسر اقتدار آنے کے بعد وہ ملاکنڈ سے سیدو تک سڑک تعمیر کرنا چاہتا تھا یعنی ریاست کی خارجی سرحد سے دارالحکومت تک۔ فروری 1923ء میں اُس نے ان دیہاتوں کے باشندوں سے جہاں سے اس سڑک کو گذرنا تھا، کہا کہ وہ یا تو مزدور فراہم کریں یا پیسہ دیں۔ حالاں کہ لوگوں نے اس تجویز کو پسند نہیں کیا لیکن کسی نے کھلے عام اس کی مخالفت بھی نہیں کی۔ سڑک پر کام شروع ہوا اور وادی کے بالائی حصہ تک اس کی

توسیع کردی گئی۔ مارچ 1924ء کی ایک تحریر میں اس جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ 'عبدالودود سیدو تک اور اُس سے آگے سڑک کی توسیع کے کام میں مصروف ہے۔' یہ سڑک چند مقامات کو چھوڑ کر بہت کشادہ اور عمدہ حالت میں ہے اور کوٹہ سے مینگورہ تک فورڈ موٹر لاری نے چلنا شروع کر دیا ہے۔' اس سڑک کو ملک کے دیگر حصوں سے مربوط بنانے کے لئے لنڈاکے کے قریب واقع مقام جالالہ تک سڑک پر کام تھانہ کے جرگہ نے شروع کر دیا ہے۔

سڑکوں کا جال بچھانے کا کام شروع ہو گیا۔ وہ علاقے جنہوں نے اپنی مرضی سے ریاست سے الحاق کیا یا اُن پر فوج کشی کر کے قبضہ کیا گیا سب کو سڑکوں کے ذریعہ دارالحکومت سے مربوط کر لیا گیا تا کہ مواصلات کا ایک مؤثر اور سریع الحرکت نظام قائم ہو اور بغاوت یا بیرونی حملہ کی صورت میں فوج کو بروقت حرکت میں لانے میں ممد و مددگار ثابت ہو۔ مارچ 1925ء تک ملیزئی علاقہ میں تارس کو ایک سڑک (براستہ قلاگے) نیک پی خیل میں منجہ تک بنائی گئی اور اپریل 1925ء میں مبارک خیل کی حدود میں سے خدو خیل علاقہ تک ایک سڑک کی تعمیر پر کام شروع ہوا۔

عبدالودود نے دعویٰ کیا ہے کہ برطانوی حکومت کی طرف سے ریاست کو باقاعدہ تسلیم کر لینے کے بعد سے تعمیراتی کام میں تیزی آ گئی۔' سب سے پہلے میں نے ریاست کے مختلف حصوں کو ایک دوسرے سے مربوط بنانے کا کام شروع کیا۔ اب تک جو سڑکیں تعمیر ہوئی تھیں وہ صرف گھوڑوں اور خچروں کے لئے مناسب تھیں۔ ان میں سے صرف ملاکنڈ سے مینگورہ تک کی ۔ موٹر کار چلانے کے قابل تھی۔' مینگورہ سے اوپر کی طرف دریا کے بائیں جانب 36 میل طویل سڑک 1927ء میں مکمل ہوئی۔ سڑک کا وہ حصہ جو کہ دشوار گذار پتھریلے علاقے سے گذرتا ہے (جسے پہلے قضا گٹ اور اب فضا گٹ کہا جاتا ہے) اسے ایم ای ایس کی زیرِ نگرانی تعمیر کیا گیا اور اس کی تعمیر بے حد شان دار تھی۔

30 ہزار روپے کی لاگت سے کانجو کے مقام پر دریا کے اوپر ایک چوبی پل کی تعمیر کا کام اپریل 1929ء میں مکمل ہوا۔ بعد میں اس جگہ سے کچھ نیچے کی جانب ایوب برج بنا۔ 4 اپریل 1929ء میں ریاستی حکمران نے اس پل کا باقاعدہ افتتاح کیا۔ اس پل کی تعمیر لکڑی کے اوپر تلے رکھے لکڑی کے تختوں پر ہوئی جنہیں گیارہ بارہ فٹ تک پانی کے اندر ڈالا گیا۔ یہ تقریباً دو ہزار فٹ تک لمبا تھا۔ یہ خیال ظاہر کیا گیا کہ یہ پل 'سیلابی ریلوں کا تو مقابلہ کر سکتا ہے لیکن پانی میں اوپر تیر کر آتے ہوئے تنے اور عمارتی لکڑی کے بڑے تختے اسے نقصان پہنچا سکتے ہیں۔' یہ پل برطانوی ہند کی حکومت کی مدد سے تعمیر ہوا۔

ریاست کے تمام بڑے حصوں تک سڑکیں تعمیر کی گئیں، چاہے وہ کتنے ہی دور دراز واقع ہوں۔ ان کو مینگورہ۔ ملاکنڈ اور بونیر۔ مردان کی سڑکوں کے ذریعے ملک کے دیگر تمام علاقوں سے ملا دیا گیا۔ 1949ء کے اختتام تک ریاست بھر میں 350 میل لمبی کچی سڑکوں کی تعمیر مکمل ہو گئی تھی۔ بہت سے پل تعمیر کئے گئے۔ ان میں سے تین پل

دریائے سوات پر تعمیر کئے گئے۔ ایک کانجو کے مقام پر چوبی پل تھا۔ اور دو مزید آہنی پل، بلی ڈھیری (باغ ڈھیری) اور دوسرا مدین کے مقام پر تھا۔ سڑکوں کے دونوں کناروں پر مسافروں کی راحت و آرام کے لئے سایہ دار درخت لگائے گئے۔

جب میاں گل جہان زیب کو حکومت ملی تو مواصلات کا شعبہ اُس کی ترجیحات میں بہت اوپر تھا۔ اُس نے سڑکوں کے لئے نائب سالار کے تحت کپتان اور صوبیدار میجر کی سربراہی میں ایک علاحدہ محکمہ قائم کیا۔ سڑکیان کے نام سے سڑکوں کی دیکھ بھال کے لئے ایک مستقل دستہ قائم کیا گیا، لیکن دوسرے سرکاری ملازمین اور ملیشیا کے افراد کے برعکس ریٹائرمنٹ کے وقت انہیں آدھی پنشن ملتی تھی۔ سڑکوں کی ہمہ وقت دیکھ بھال اور تعمیر صرف اس محکمہ کے حکام ہی کی ذمہ داری نہیں تھی بلکہ والی صاحب بذاتِ خود اس کام میں پوری طرح دل چسپی لیتے تھے اور زیرِ تعمیر سڑکوں اور پلوں کے کام کا معیار دیکھنے کے لئے مسلسل ان کا معائنہ کرتے رہتے تھے۔ جب کہ متعلقہ علاقہ کے تحصیل دار اور حاکم کو بھی ہر قسم کی خامی کے لئے جواب دہ ہونا پڑتا تھا۔

والی صاحب نے سڑکوں کے دونوں جانب ایک خاص فاصلہ تک کسی قسم کی تعمیر کی ممانعت کر دی تھی۔ یہ فاصلہ سڑک کے بیچ میں سے 25 فٹ، 20 فٹ اور 18 فٹ کے حساب سے ناپا جاتا تھا۔ علاقہ کے لحاظ سے ان تینوں فاصلوں میں سے کسی ایک پر عمل درآمد کیا جاتا تھا۔ جب کہ سیدو میگورہ سڑک کے لئے اس فاصلہ کا تعین حکومت کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ سڑک کے کنارے سے دس فٹ کے فاصلہ پر گیراج بنایا جاسکتا تھا۔ سڑک کے موڑ پر گیراج کی تعمیر منع تھی۔ اگر کوئی اس حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے گیراج تعمیر کرتا تو حکومت اس کے گرانے کا حق محفوظ رکھتی تھی۔

والی صاحب سڑکوں کی دیکھ بھال اور ان کو صحیح حالت میں رکھنے پر بہت زور دیتے تھے۔ اس سلسلہ میں ایک واقعہ خاص طور پر بیان کیا جاتا ہے۔ وہ یہ کہ ٹیک پی نیل میں باندئی کے قریب سڑک میں ایک ناہموار جگہ تھی جس کے لئے والی نے متعلقہ صوبیدار میجر کو اسے ٹھیک کرنے کا حکم دیا۔ معائنہ کے دوران صوبیدار میجر اُس جگہ کا تعین نہیں کر سکا۔ جب والی صاحب دوبارہ اس مقام سے گذرے تو انہوں نے پھر وہ ناہمواری محسوس کی۔ معلوم کرنے پر انہیں بتایا گیا کہ صوبیدار میجر اُس ناہموار جگہ کا تعین نہیں کر سکا ہے۔ اس پر انہوں نے حکم دیا کہ اُسے اس جگہ پر گھسیٹا جائے۔ جب اُسے گھسیٹا جارہا تھا تو وہ چلایا کہ بس کرو بس کرو مجھے اُس ناہمواری کا پتہ چل گیا ہے۔ عبدالولی خان نے اسی قسم کی ایک اور کہانی بیان کی ہے۔ اس کے مطابق والی صاحب اپنے ہم راہ سڑک کے ایک ٹھیکہ دار کو مدین لے گئے اور سفر کے دوران جہاں بھی کوئی ناہمواری محسوس ہوئی تو ساتھ جانے والے باڈی گارڈ دستہ کے لوگ ٹھیکہ دار کو بہ طور سزا فوری مار لگاتے۔

سوات کی سڑکوں کی عمدہ حالت کا اندازہ احمد حسن دانی کے اس بیان سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ "تھانہ (زیر حفاظت علاقہ) کی حدود سے نکلتے ہی جہاں ناہموار اور گڑھوں سے پُر سڑک کا اختتام ہو اور سپیدے کے درختوں کی طویل قطار کے بیچوں بیچ ہموار آرام دہ سفر کا آغاز ہو تو آدمی خود بہ خود سمجھ جاتا ہے کہ اصل سوات پہنچ گئے ہیں۔" دانی کے اس بیان کی رحیم شاہ لالہ ایم ایل اے (ممبر قانون ساز اسمبلی) نے پھر یوں تصدیق کی کہ لاہور سے تعلق رکھنے والا ایک ایم ایل اے سوات آنا چاہتا تھا لیکن اُسے یہ فکر تھی کہ اُسے کیسے پتہ چلے گا کہ وہ سوات پہنچ گیا ہے۔ اس پر رحیم شاہ لالہ نے اُس سے کہا کہ جہاں سے سڑک بالکل ہموار اور عمدہ حالت میں ہو اور اس پر مزید کسی گڑھے کا سامنا نہ کرنا پڑے تو سمجھ جاؤ کہ تم سوات پہنچ گئے ہو۔ وہ ایم ایل اے سوات گیا اور سوات کی سڑکوں کی ہمواری اور عمدہ حالت کی تصدیق کی۔

جیمز ڈبلیو سپین 1950ء کے عشرہ میں ریاست میں مواصلات اور ٹرانسپورٹ سہولیات کا ذکر کرتا ہے جو کہ پندرہ سو میل طویل ٹیلی فون لائن اور تین سو پچھتر میل طویل ہر موسم میں قابل سفر سڑکوں پر مشتمل ہے۔ میاں گل جہان زیب نے باپ کے بچھائے ہوئے سڑکوں کے جال میں توسیع ہی نہیں کی بلکہ ان کی مناسب دیکھ بھال اور انہیں پختہ بنانے پر بھی توجہ دی۔ اس سلسلہ میں ہونے والی ترقی کا اندازہ اعداد و شمار کی روشنی میں لگایا جا سکتا ہے۔ 1947ء میں کل 350 میل لمبی سڑکیں تھیں جو کہ سب کی سب کچی تھیں۔ 1957ء میں کل 400 میل لمبی سڑکیں تھیں جن میں سے 15 میل طویل سڑک پختہ تھی اور بقیہ کچی تھیں۔ 1967ء میں کل 600 میل لمبی سڑکیں تھیں جن میں 104 میل طویل سڑک پختہ اور بقیہ کچی تھی جب کہ 1968ء میں ان 600 میل لمبی سڑکوں میں سے 116 میل سڑکیں پختہ اور بقیہ کچی تھیں۔ ان سڑکوں پر کل 500 کچے پل تھے جن میں سے چار عدد بڑے پل تھے جو کہ بریکوٹ، مینگورہ (کانجو کے قریب ایوب پل) خوازہ خیلہ، اور مدین کے مقامات پر دریائے سوات پر بنائے گئے تھے۔ پانچواں بڑا پل باغ ڈھیری یا پل ڈھیری کے مقام پر تعمیر کیا گیا تھا۔

ٹیلی فون

مواصلات کا ایک اور اہم ذریعہ ٹیلی فون تھا۔ انگریز حکومت کی جانب سے باقاعدہ تسلیم کئے جانے سے قبل یہاں ٹیلی فون نظام کا قیام ممکن نہیں تھا اس لئے کہ یہ سارا ان کے قبضہ میں تھا۔ دسمبر 1927ء میں پولیٹیکل ایجنٹ ملاکنڈ کے ایک بیان میں کہا گیا کہ باچا صاحب نے "لنڈاکے سے سیدو کو مربوط کر لیا ہے جہاں سے یہ لائن ملاکنڈ سے مربوط ہے۔" میاں گل جہان زیب ٹیلی فون سے اپنے باپ کے تعلق کے بارے میں کہتے ہیں کہ

"لوگوں سے رابطہ کے لئے وہ بالعموم ٹیلی فون کا استعمال کرتے تھے۔ انہوں نے یہ نظام قائم کرنے کی ابتداء 1926ء میں کردی تھی۔ اس سے کہیں پہلے وہ اس کو شروع کر سکتے تھے لیکن انگریز حکومت اس کی اجازت نہیں دیتی تھی اس لئے کہ ابھی تک انہوں نے اُسے باقاعدہ حکمران تسلیم نہیں کیا تھا۔ وہ ہر شام لوگوں کو ٹیلی فون کرکے اُن سے حالات معلوم کرتے کہ کیا ہو رہا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس طرح وہ ہر کسی سے قریبی رابطہ میں رہتا تھا اور ریاست بھر میں تمام حالات سے باخبر رہتا تھا۔"

ریاست میں اپنے احکامات کے نفاذ کے لئے اُن کے پاس واحد ذریعہ زبان سے ادا کئے گئے الفاظ تھے جیسا کہ ایک روایتی قبائلی طریقہ تھا۔ دور دراز علاقوں میں اُس کے حکام مسلسل بذریعہ ٹیلی فون اُن سے رابطہ میں رہتے تھے اس لئے کہ وہ پڑھے لکھے نہیں تھے۔ ریاست کے لئے اس کی اہمیت کے علاوہ یہ عام لوگوں کے لئے بھی باہمی رابطہ کا ایک اہم ذریعہ بن گیا تھا۔ 1947ء میں کل پانچ ایکس چینج تھے۔ کل کنکشنوں کی تعداد 160 تھی۔ 1957ء میں ایکس چینجوں کی تعداد بڑھ کر دس ہوگئی اور کنکشنوں کی تعداد 292 تک پہنچ گئی۔ 1967ء میں ایکس چینج بڑھ کر 17 ہوگئے اور کنکشنوں کی تعداد 589 تک پہنچ گئی۔ 1968ء میں ایکس چینج تو 17 ہی رہے لیکن کنکشن بڑھ کر 597 ہوگئے۔

محکمہ ڈاک

اس محکمہ کی خدمات کو دور دراز علاقوں تک پہنچایا گیا تھا لیکن اس محکمہ کی ترقی بہت زیادہ قابل تعریف نہیں تھی۔ اور سرکاری ریکارڈ میں بدعنوانی کے ایسے معاملات کا ذکر بھی موجود ہے جب کسی پوسٹ ماسٹر نے منی آرڈر کی رقم میں خرد برد کی ہو۔ 1947ء، 1948ء میں پوسٹ آفسوں کی تعداد 7 تھی۔ 1957ء، 1958ء میں یہ تعداد بڑھ کر 23 ہوگئی۔ اور 1967ء، 1968ء میں کل پوسٹ آفس 39 تھے۔

تجارت اور صنعت وحرفت

سوات اپنی زمین کی بے حد زرخیزی کی وجہ سے غیر معمولی طور پر اچھی فصلوں اور قسما قسم کی زرعی پیداوار کے لئے جانا جاتا تھا اور جانا جاتا ہے۔ کچھ خاص قسم کی صنعتی پیداوار کے لئے بھی بہت پرانے زمانہ سے اسے شہرت حاصل تھی اور بیرونی دنیا سے اس کے تجارتی روابط تھے۔ سواتی اونی شالیں اور اونی کمبل اپنی عمدگی کی وجہ سے مشہور ہیں۔ جاتک نے سرخ سواتی کمبل اور قیمتی شال کی بے حد تعریف کی ہے اور مہابھارت میں سوات کے باشندوں کی اچھے خچروں کی افزائش کی تعریف کی گئی ہے۔

ریاست کے قیام، بنیادی ڈھانچے کی تعمیر، جدیدیت اور تبدیلی کے لئے ماحول کی سازگاری اور سیاسی اور اقتصادی تحفظ نے مل کر تجارت کے شعبہ میں پیش قدمی کے لئے مہمیز کا کام کیا۔ نئے تجارتی مراکز وجود میں آگئے جہاں تجارتی سرگرمیاں عروج پر پہنچ گئیں۔ 1880ء کی دہائی میں چار باغ ایک بڑا کارواں سرائے اور تجارتی مرکز تھا جہاں سے کوہستان، یاسن اور دیگر شمال مشرقی اضلاع کے ساتھ تجارت ہوتی تھی۔ اپنی اہمیت کے لحاظ سے منگلور دوسرے نمبر پر تھا جب کہ تجارتی اہمیت کے لحاظ سے مینگورہ کا نمبر تیسرا تھا۔ 1930ء تک مینگورہ نے مرکزی بازار اور سوات کے سب سے بڑے قصبہ کی حیثیت حاصل کر لی تھی۔ اس کی وجہ اس کا محل وقوع اور دارالحکومت سے اُس کا قریب ہونا تھا۔ اس کے علاوہ دیگر تجارتی مراکز بریکوٹ، چار باغ، خوازہ خیلہ، مدین اور بحرین تھے۔ اپنی روزی روٹی کے لئے زیادہ تر سواتی باشندوں کا انحصار تو زراعت پر تھا لیکن دیگر اقتصادی مواقع کی وجہ سے مینگورہ میں دیگر پیشوں سے تعلق رکھنے والے لوگ بھی بڑی تعداد میں پیدا ہوگئے۔

نظام مواصلات میں بہتری اور بیرون ریاست صنعت وحرفت کی ترقی سے تجارت کو فروغ حاصل ہوا اور درآمدات و برآمدات کی فہرست میں نئی نئی چیزیں شامل ہوگئیں۔ مثال کے طور پر 1880ء کی دہائی میں سوات سے برآمد ہونے والی اشیاء میں گھی، عمارتی لکڑی، گندم، پکائی لکڑی، شہد، کمبل، بکریاں اور بھیڑیں شامل تھیں۔ 1955ء تک ان میں جو، دالیں، چمڑا، کھالیں، ہڈیاں، اخروٹ، خوردنی تیل کے بیج، اون، اور جڑی بوٹیوں کا اضافہ ہوگیا۔

1880ء کی دہائی میں سوات درآمد کی جانے والی چیزوں میں نمک، قدرتی نیلا رنگ، مختلف النوع کپڑا، کاٹن، ریشم، چینی، گرم مصالحے اور عام ضرورت کی وہ اشیاء جو پھیری والے گھوم پھر کر بیچتے ہیں۔ 1955ء میں اس فہرست میں پٹرول، بجری، سیمنٹ، مٹی کا تیل، چاول، گندم، چینا، فولاد، نباتاتی تیل، دھاگا، اور سیسہ (گولیوں میں استعمال کے لئے) نئی اشیاء کے طور پر شامل ہو گئے تھے۔ ان کے علاوہ مل کا تیار کردہ کپڑا، دوائیاں، برتن، شیشہ کا سامان، دھات کے اوزار، سنگھار کا سامان، کاغذ کا پیاں، کتابیں، رسائل، اخبار، عام اشیائے صرف، مشینری جیسے آٹا مشین، بائی سائیکلز، موٹر کاریں، کپڑے سینے کی مشین، گھڑیاں اور بجلی کا تمام ساز وسامان بھی درآمد کیا جاتا تھا۔7

بڑے پیمانے پر کوئی صنعتی سرگرمی موجود نہیں تھی۔ زیادہ تر سوات کے لوگ گھروں میں یا اپنے گھروں کے قریب کام کرتے تھے۔ محدود نوعیت کی گھریلو صنعت موجود تھی جسے ماہر اور تربیت یافتہ کاریگر روایتی انداز میں چلاتے تھے۔ سواتی عورتیں اپنے ذاتی استعمال کے لئے کڑھائی کرتی تھیں۔ بعض اوقات اسے تجارتی مقاصد کے لئے بھی کیا جاتا تھا۔ اسی طرح سواتی کاریگر لکڑی پر نقش کاری کیا کرتے تھے۔ یہ فن بالعموم ماں سے بیٹی اور باپ سے بیٹے کو منتقل ہوتے تھے۔ کبھی کبھار ان میں بیرونی اثرات کا کچھ عکس بھی نظر آتا تھا لیکن زیادہ تر یہ علاقائی حسن جمال ہی

کا مظہر ہوتا تھا۔

صنعتی میدان میں ترقی کے لئے عبدالودود نے جولا ہوں کی حوصلہ افزائی کی اور ان کے کاروبار کے فروغ کے لئے کوشش جاری رکھی۔ اس سوال کے جواب میں "کہ اپنی ریاست کے لئے وہ مزید کیا کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے کہا۔ ان کی بہت بڑی خواہش رہی ہے کہ وہ یہاں کارخانے لگائیں جہاں صرف ہاتھ سے چلنے والی کھڈیوں سے چھوٹے پیمانے پر کپڑا بنا جاتا تھا۔

وقت کے ساتھ ساتھ مشینری درآمد کرنے کے لائسنس جاری کرکے اور خام مال کی درآمد پر ٹیکس میں چھوٹ دے کر چھوٹے پیمانے پر صنعتوں کے قیام کے کام کی حوصلہ افزائی کر گئی۔ ان اقدامات سے 1960ء کی دہائی میں یہاں مصنوعی ریشمی کپڑے کی صنعت ابھر کر سامنے آئی۔ 1967ء میں یہاں سولہ ایسے صنعتی یونٹ کام کر رہے تھے جن میں دو ہزار مزدور برسر روزگار تھے اور 1968ء میں ان صنعتی یونٹوں کی تعداد بڑھ کر 22 ہو گئی اور ان میں کام کرنے والوں کی تعداد بڑھ کر تین ہزار تک پہنچ گئی۔ مصنوعی ریشم سازی کی صنعت کے علاوہ آٹا اور لکڑی چیرنے کی ملیں، چربی کریم اور صابن، دواسازی اور شہد کی صفائی کے کچھ صنعتی یونٹ بھی لگ گئے۔ حکومت پاکستان کے تعاون سے صنعتی ملازمین کی تربیت کے لئے بھی ایک ٹیکنیکل تربیت کا مرکز قائم کیا گیا۔

صنعتی شعبہ میں باقاعدگی پیدا کرنے کے لئے صنعت کاروں کو پابند کیا گیا کہ وہ کوئی کارخانہ لگانے سے پہلے صداقت نامے اور تحریری معاہدے فراہم کریں گے۔ مصنوعی ریشم کے کارخانوں کے لئے لازم تھا کہ ان کے پچاس فی صد کارکن سواتی ہوں گے اور یہ کہ ان سے آٹھ گھنٹے سے زیادہ کام نہیں لیا جائے گا۔ اسی طرح صنعتی کارکنوں سے تحریری ضمانتیں لی گئیں تھی کہ وہ ہڑتال نہیں کریں گے اور نہ ہی کسی مزدور تحریک میں حصہ لیں گے۔

خشت بھٹے کے کام کو باقاعدہ بنانے کے لئے بھی اقدامات کئے گئے۔ بھٹہ مالکان سے وعدہ لیا گیا ہے کہ وہ 200 من سے زیادہ سوختنی لکڑی استعمال نہیں کریں گے جو انہیں بھٹہ میں ابتدائی آگ جلانے کے لئے ریاستی حکمران کی طرف سے مختص کی گئی تھی۔ کس کے بعد انہیں کوئلہ کو بطور ایندھن استعمال کرنا پڑتا تھا۔ ایک اور تحریری ضمانت میں کہا گیا کہ یکم جنوری 1965ء کے بعد سے بھٹہ مالکان کسی آبی زمین پر یہ کام نہیں چلا سکیں گے۔ اس کے لئے وہ صرف بارانی زمین کو استعمال کر سکیں گے۔

حالاں کہ تھوڑی بہت صنعتیں لگائی گئیں لیکن مناسب انداز میں صنعتوں کی نہ تو حوصلہ افزائی کی گئی اور نہ ہی بڑے پیمانے پر انہیں لگانے کی اجازت دی گئی۔ جب ریاستی چیف سیکرٹری نے کارن مل لگانے کا ارادہ کیا تو والی صاحب نے یہ کہہ کر اس کی اجازت نہیں دی کہ اس سے ریاست میں مکئی کی قلت ہو جائے گی۔ اسے بالآخر بیرون ریاست تخاکوٹ (ملاکنڈ زیر حفاظت علاقہ) کے مقام پر سوات کارن پروڈکٹس کے نام سے لگایا گیا۔ حالاں کہ والی

صاحب اس سلسلہ میں چیف سیکرٹری سے یہ یقین دہانی حاصل کر سکتے تھے کہ عام لوگوں کے استعمال کے لئے نمک کی فراہمی کو یقینی بنائے یا یہ کہ اس غرض کے لئے نمک درآمد کی جائے۔ کامران خان جو والی صاحب کے بہت قریبی دوست تھے (بعد میں ان میں کچھ دوری پیدا ہوگئی تھی) معاشی ترقی کے سلسلہ میں والی صاحب کی کوتاہ بینی پر نکتہ چین ہیں۔ انہوں نے الزام لگایا کہ صدر پاکستان ایوب خان سوات میں کئی منصوبے جیسے کالام میں ایک ہائیڈرو پاور اسٹیشن 8، نیک پی خیل کی آب پاشی نہر اور شاہراہ قراقرم شروع کرانا چاہتے تھے جس سے یہاں معاشی سرگرمیوں میں بے حد اضافہ ہوجاتا اور مینگورہ ایک بڑا تجارتی مرکز بن جاتا لیکن والی صاحب اس پر راضی نہیں ہوئے۔ کامران خان کا کہنا ہے کہ اس بات کی تصدیق میاں گل اورنگ زیب سے کرائی جا سکتی ہے۔

میاں گل اورنگ زیب اس ضمن میں کہتے ہیں کہ میں اس بات کو صحیح تسلیم نہیں کرتا۔ میرے پاس ان منصوبوں کے بارے میں کوئی معلومات نہیں ہیں۔ اگر ان کا کوئی وجود ہوتا تو والی صاحب کبھی ان کی مخالفت نہ کرتے۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اپنے باپ کے خلاف گواہی نہیں دے سکتے۔ سوویت نیوز ایجنسی اے پی این نے کامران خان کے حوالہ سے یہ بات کہی ہے کہ وہ والی صاحب کے ساتھ ریاست میں اقتصادی ترقی کے علاوہ کسی بھی موضوع پر گفتگو کر سکتے تھے۔

باغبانی اور نقد آور فصلیں

لامحدود امکانات کے باوجود باغ بانی محدود پیمانہ پر کی جاتی تھی۔ اورل اسٹائن نے اس امید کا اظہار کیا تھا کہ چوں کہ بالائی سوات کی آب و ہوا ہر قسم کے پھلوں کی پیداوار کے لئے انتہائی موزوں ہے۔ ایک بار اس مٹھاس سے لطف اندوز ہونے کے بعد جوان اور بوڑھے... مل کر باچا صاحب کی اس ضمن میں کاوشوں کا بھرپور ساتھ دیں گے۔ لیکن یہ بات مستقل بندوبست اراضی کے بعد ہی حقیقت کا روپ دھار سکی جب باچا صاحب نے باغ بانی اور زراعت کے دیگر شعبوں میں حوصلہ افزائی کی اور اسے فروغ دینے کے لئے مختلف قسم کے اقدامات کئے۔ تمباکو کی نقد آور فصل بھی ریاست کی حدود میں داخل ہوئی لیکن یہاں معلوم وجوہات کی بنا پر اس کی حوصلہ شکنی کی گئی۔ ریاست میں دیگر نقد آور فصلوں کے ساتھ ساتھ نئے متعارف ہونے والے پھلوں نے بھی مرحلہ وار اپنے لئے جگہ بنالی اور سوات کی برآمدات کا حصہ بن کر یہاں کے لوگوں کی معاشی خوشحالی میں اہم کردار ادا کیا۔

سیاحت

اپنے قدرتی حسن، وافر تعداد میں آثار قدیمہ اور تاریخی مقامات، دل کشیوں اور دیگر امکانی خوبیوں کی وجہ سے سوات ایک مشہور سیاحتی مرکز بن گیا۔ میاں گل جہان زیب نے سیاحت کو فروغ دینے کے لئے بہت سے اقدامات کئے۔ اُنھوں نے اطالوی آثار قدیمہ مشن کے اشتراک سے کئی جگہ آثار قدیمہ کی کھدائی کا کام کیا اور ان آثار کے بعض مقامات کی حفاظت کا انتظام کیا۔ ایک میوزیم بنایا گیا، جس کا افتتاح صدر پاکستان ایوب خان نے 10 نومبر 1963ء کو کیا۔

خاصی بڑی تعداد میں سیاحوں نے سوات آنا شروع کیا اور ملک کے دولت مند طبقہ کے لئے اس نے ایک پرکشش جگہ کی صورت اختیار کرلی۔ اس سلسلہ میں عمدہ سڑکوں، ٹرانسپورٹ کی سہولیات اور معیاری ہوٹلوں کی روز افزوں تعداد نے اہم کردار ادا کیا۔ ریسٹ ہاؤسوں کا ایک جال بچھانے پر بھی کام شروع کیا گیا۔ 1949ء میں صرف دو عدد ریسٹ ہاؤس تھے جب کہ 1968ء میں یہ تعداد بڑھ کر 39 ہوگئی۔ والی ہوٹلوں کی تعمیر کے لئے قرضے جاری کرتے تھے۔ مدین ہوٹل اور دوسرے ہوٹل بطور شالیمار ہوٹل اس بات کے گواہ ہیں۔ 68-1967ء میں ملم جبہ کے مقام پر پاکستان کا پہلا سکی اِنگ مرکز بنانے کے کام کا آغاز کیا گیا۔

سماجی وثقافتی تبدیلیاں

ریاست سوات کے وجود میں آنے کے بعد یہاں جو سماجی وثقافتی تبدیلیاں آئیں 'وہ قرب وجوار کے قبائلی علاقوں کے برعکس بہت نمایاں نوعیت کی تھیں اس لئے کہ اُن میں سیاست اور معاشرہ بیسویں صدی کے دوران بھی اُسی ڈگر پر چلتا رہا جس پر وہ انیسویں صدی میں چل رہا تھا۔'

تخفیفِ اسلحہ

ذاتی اسلحہ رکھنا پختون معاشرہ کی ایک اہم خاصیت ہے۔ سوات میں جدید آتشیں اسلحہ بین الاقوامی اسلحہ اسمگلروں کی وساطت سے پہنچا اور' بندوق ہر پختون کے لئے عزت و وقار کی نشانی بن گئی۔ وہ کم از کم اپنے لئے ایک بندوق کا حصول لازمی گردانتا تھا۔' پختون کے بارے میں کہا گیا کہ 'وہ اپنی پرانی بیوی اور نئی بندوق سے محبت کرتا ہے۔' اس بڑی مقدار میں پختونوں کے پاس جدید اسلحہ کا، وہ برطانوی حکومت کے لئے باعث تشویش تھا۔ بیسویں

صدی کے ابتدائی دور میں کیے گئے ایک سرکاری تجزیہ میں کہا گیا۔

"حالاں کہ اس وقت امن وامان اور خوشحالی کے امکانات روشن ہیں لیکن ایک مسئلہ خاصا توجہ طلب ہے۔ وہ ہے ان قبائل کی طرف سے انتہائی قابل بھروسہ اسلحہ کا حصول۔ قبائل کا طویل فاصلہ تک مار کرنے والا اسلحہ خریدنا بہت ہی سنجیدہ نوعیت کا مسئلہ ہے۔ ہماری فلاحی اور رفاہی پالیسیوں کی وجہ سے ان برسوں میں تجارت اور عمومی خوشحالی میں بے حد اضافہ ہوا ہے۔ اسی طرح ایک بڑی رقم ہر سال معاوضوں اور الاؤنسوں کی شکل میں ان لوگوں میں بانٹی جاتی ہے لیکن اس سب کے باوجود اس بات کے کوئی آثار نظر نہیں آتے کہ قبائل اپنی اس دولت کو اپنے علاقوں یا مغربی معیار کے مطابق اپنی ذاتی بہتری کے لئے استعمال کرتے ہوں۔ وہ اب بھی صدیوں پرانے طرز زندگی سے چمٹے ہوئے ہیں۔ آدمی سوچتا ہے کہ وہ سارا پیسہ جو ان کو مل رہا ہے وہ یہ لوگ اسلحہ خریدنے پر لگا رہے ہیں۔"

عبدالودود اپنی رعایا سے اسلحہ جمع کرنے کا منصوبہ شروع کرنا چاہتا تھا لیکن اصل مشکل یہ تھی کہ یہ کام کیسے کیا جائے۔ بہ ہر صورت یہ کوئی آسان کام نہیں تھا بالخصوص خوانین اور با اثر افراد سے اسلحہ لینا، لیکن عام آبادی سے بھی اس بات کی توقع نہیں تھی کہ وہ آسانی سے اپنے ہتھیاروں سے دست بردار ہو جائیں گے۔ اس منصوبہ کو کامیاب بنانے کے لئے اُس نے برطانوی حکومت کی مدد چاہی کہ کسی بغاوت یا ایسا کرنے سے انکار کی صورت میں وہ اُس کی مدد کو آئیں۔ پولیٹیکل ایجنٹ اپنی طرف سے ایسی کوئی یقین دہانی کرانے کے لئے آمادہ نہیں تھا حالاں کہ وہ اس منصوبہ کو مثبت اور برطانوی حکومت کے لئے بھی سودمند سمجھتا تھا۔

1928ء کے موسم گرما میں اس مقصد کے حصول کے لئے ژلہ نظام (دھڑ انظام) اور جرگے کے ادارہ کو استعمال کیا گیا۔ لوگوں نے اپنا اسلحہ حوالہ تو کیا لیکن مکمل خوش دلی کے ساتھ ایسا نہیں کیا گیا۔ یہ وقت طلب پر خطر مہم کسی کھلی مخالفت اور خون خرابہ کے بغیر انجام تک پہنچ گئی۔ شمال مغربی سرحدی صوبہ کے گورنر رالف گریفتھ نے اسے باچا صاحب کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ قرار دیا۔ یہی رائے برطانوی حکومتِ ہند کی بھی تھی۔ اس لئے کہ کسی پٹھان کے لئے سب سے قیمتی اثاثہ اُس کی بندوق ہے اور اُسے اس سے محروم کر دینا کوئی چھوٹا کارنامہ ہرگز نہیں ہے۔ لیکن اس مہم کی کامیابی سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ لوگوں کے پاس اسلحہ بالکل موجود نہیں رہا یا یہ کہ اب وہ کسی قسم کا اسلحہ نہیں رکھیں گے غلط خیال ہے۔ وہ اسلحہ اب بھی رکھ سکتے تھے لیکن اُس کے لئے لائسنس ضروری تھا اور اس کی ایک خاص فیس دینی پڑتی تھی۔ اس لئے یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ اس مہم کا مطلب علاقہ کو اسلحہ سے بالکل پاک کرنا ہرگز نہیں تھا بلکہ اسے کچھ قواعد وضوابط کا پابند بنانا تھا۔ لیکن طاقت ور با اثر لوگ اب بھی غیر قانونی اسلحہ رکھتے تھے۔

خان اور مَلَک کی حیثیت

ابتدا میں خان اور مَلَک کا انتخاب لوگ اپنی آزادانہ مرضی سے خود ہی کرتے تھے لیکن جلد ہی یہ چیز موروثی ہوگئی، حالاں کہ نظری طور پر اب بھی یہ منصب لوگوں کی مرضی کے تابع تھا۔ میاں گل عبدالودود نے اس میں ایک بنیادی نوعیت کی تبدیلی کردی۔ وہ یہ کہ لوگوں سے اس انتخاب کا حق چھین کر اسے انہوں نے اپنے ہاتھ میں رکھ لیا۔ جسے چاہا خان یا مَلَک بنا دیا۔ جسے چاہا اس حق سے محروم کردیا۔ اب ان لوگوں کو حکومت کی طرف سے صرف مواجب ہی نہیں ملتے تھے بلکہ اپنے دائرۂ اختیار میں مجرموں سے لئے جانے والے جرمانہ کا ایک خاص حصہ بھی انہیں ملتا تھا۔[9] وہ اب سابقہ انداز میں کسی جھگڑے کا فیصلہ نہیں کر سکتے تھے۔ اگر وہ کرتے بھی تو فریقین کو عدالت جانے کا اختیار حاصل تھا۔ مزید یہ کہ اب وہ اپنے لئے مضبوط ڈنے (دھڑے) بھی نہیں بنا سکتے تھے۔ اکبر ایس احمد کے مطابق:

''والی اور ریاست کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد خوانین کو حاصل بہت سے اختیارات اُن سے چھن کر سرکاری انتظامیہ کے پاس چلے گئے۔ مثلاً محصولات اور بیگار کا حق۔ اس کے بدلہ میں ریاست مفت اسکول اور اسپتال کی سہولت فراہم کرتی تھی جب کہ خان کی حیثیت کسان اور ریاست کے درمیان ایک دلال جیسی ہوگئی۔''

یہ بات جزوی طور پر درست ہے لیکن محصولات اور بیگار لینے کا حق اب بھی قبل از ریاست دور کی طرح خان کو حاصل تھا بلکہ اس لحاظ سے عبدالودود نے اُن کی حیثیت کو مزید مستحکم بنا دیا۔ البتہ میاں گل جہان زیب نے اس حیثیت کو کسی حد تک کم کرنے کی ضرور کوشش کی۔ مثلاً اُس نے ہر نا قابل انتقال جائیداد کے مالک کو اپنی جائیداد کا مَلَک بنا دیا۔ اس طرح ریاست کے نامزد کردہ مَلَکوں اور خوانین کو لوگوں کی جائیداد پر حاصل حقوق کا خاتمہ ہوگیا۔ اسی طرح اُس نے خوانین کو مجبور کیا کہ وہ اپنے سابقہ حقوقِ مَلَکری (گروہی) یعنی اپنے متعلقہ گروہ پر حاصل حقوق سے دست بردار ہو جائیں (جنہیں اکبر ایس احمد کے بیان کے برعکس عبدالودود نے مزید مضبوط بنا دیا تھا)۔ اس سلسلہ میں ان سے تحریری بیانات لے لئے گئے۔

منشی مقرر کئے گئے اور کچھ متعین مدت کے بعد ایک گاؤں کی آبادی کا جا کر دوسرے گاؤں ہجرت کرنے کا زمانہ قدیم سے چلا آنے والا نظام ختم کر دیا گیا۔

نئی اقتصادی تبدیلیوں اور منڈی کی قوتوں کے زیر اثر تاجر پیشہ طبقہ نے ممتاز حیثیت حاصل کر لی۔ ان میں بہت سے معاشرہ کی قیادت کرنے والے ان لوگوں سے زیادہ خوشحال ہو گئے جن کی برتری کا انحصار صرف زمینی جائیداد پر تھا۔ بالعموم سارے پختون اور بالخصوص سارے خوانین اور ملک اپنی روایتی حیثیت کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتے رہے لیکن معیار زندگی کو بحال رکھنے کے لئے درکار وسائل میں روز افزوں اضافہ نے اس کو بہت دشوار بنا دیا۔ انہیں اپنی زمینیں بیچنی پڑیں جو تاجر پیشہ طبقہ نے خرید لیں۔ 1955ء کے اعداد و شمار سے اس تبدیلی کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے جب چکورہ میں اپنے دوتر کا چھٹا حصہ پختونوں نے نئے دولت مند تاجر پیشہ طبقہ کے ہاتھ فروخت کر دیا۔

روایتی معاشرہ میں حجرہ صرف ایک مردانہ رہائشی جگہ نہیں تھی بلکہ اس سے مہمان خانہ کا کام لیا جاتا تھا اور یہ سماجی سرگرمیوں، تبادلہ خیال اور غیر شادی شدہ مردوں کے سونے کے لئے استعمال میں لایا جاتا تھا۔ اس کی حیثیت ایک کثیر المقاصد سماجی مرکز کی تھی۔ یہ نہ صرف شادی کی باراتوں کا نقطہ آغاز تھا بلکہ گاؤں میں ہر جنازہ کا جلوس بھی یہاں سے قبرستان کا رخ کرتا تھا۔ زندگی کے نئے طور طریق نے اس کے روایتی کردار کو آہستہ آہستہ دھندلا دیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ روایتی سماجی سرگرمیوں کا مرکز نہیں رہا۔ اس کی جگہ نجی ڈیروں نے لے لی لیکن اب بھی اس کی کچھ روایتی خاصیتیں موجود ہیں۔

جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں روز افزوں اضافہ نے ایک اور جہت میں اپنا اثر دکھایا۔ وہ مزید ذہنی آزادی کا طلب گار تھا اور طرز کہن کے مطابق خود کو ڈھالنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ افقی اور عمودی ہل چل کی وجہ سے پیشوں میں تبدیلی واقع ہوئی۔

"بہت سے لوگوں نے باپ دادا کا پیشہ ترک کر کے نئے پیشے جیسے اجارہ داری (زمین ٹھیکے پر لے کر کاشت کرنا)، دکان داری (سبزی ترکاری، کریانہ، مٹھائی، درزی، حجام، چائے، ہوٹل کا کاروبار، موٹر ڈرائیونگ، اور مشینوں کی مرمت وغیرہ کی دکانیں) شروع کی۔"

قبل از ریاست دور میں نہ تو یہاں قصائی تھا نہ دھوبی اور نہ ہی درزی۔ عورتیں ہی کپڑے دھونے اور سینے کا کام گھروں پر کرتی تھیں۔ قصائی بیرون ریاست سے لائے گئے۔ موسم گرما میں لوگ گوشت نہیں کھاتے تھے بلکہ وہ وافر مقدار میں اُگنے والی سبزیاں کھایا کرتے تھے۔ اس دوران قصائی فارغ بیٹھے رہتے تھے۔ تاہم انہیں پابند بنا دیا گیا کہ وہ گرمیوں میں ذبح کریں گے بصورت دیگر ان کو موسم سرما میں اس کی اجازت نہیں ہوگی۔ پہلے سبزیاں تجارتی

مقاصد کے لئے نہیں اگائی جاتی تھیں لیکن اب اس کی حوصلہ افزائی کی جانے لگی اور اسے ایک قرین عمل تجارتی شکل دے دی گئی۔

ایلیزبیتھ بالنیوز نے بتایا ہے کہ بھیک مانگنا ریاست میں ایک بڑا جرم گردانا جاتا تھا۔ میاں گل جہان زیب نے اسے ختم کرنے کے لئے بہت سے اقدامات کئے بلکہ ایک بھکاری عبدالرحمٰن سے تحریری عہد لیا تھا کہ وہ آئندہ بھیک نہیں مانگے گا۔

میاں گل عبدالودود اور میاں گل جہان زیب نے ہر لحاظ سے معاشرہ کو بدلنے اور اس میں ایک قسم کی باقاعدگی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ لوگوں کے ذاتی رویوں تک میں بدلاؤ لانے کے جتن کئے گئے۔ شادیوں کو بھی حدود و قیود کا پابند بنایا گیا۔ مہر کی رقم سے لے کر ولیمہ کی دعوت میں آنے والے مہمانوں کی تعداد مقرر کر دی گئی۔ نکاح نامہ کو لازمی قرار دیا گیا اور ایک فرمان کے مطابق نکاح نامہ نہ ہونے کی صورت میں عورت کو شوہر سے مہر کی رقم نہیں ملے گی۔ اسی طرح کسی کے وفات کے موقع پر تقسیم ہونے والی رقم (اسقاط)، تعزیت کے لئے ایک گھرانہ سے جانے والے افراد کی تعداد، آنے والوں کی تواضع چائے یا کھانے سے ہو۔ ان سب معاملات کے لئے قوانین بنائے گئے۔ ختنہ اور تیسری شادی (جس کے لئے وجوہات کا بیان اور حکمران کی اجازت لازمی تھی) کے ضمن میں بھی فرمان جاری کئے گئے۔ [10] یہ آخری فرمان لگتا ہے ایوبی دور کے پاکستان میں عائلی قوانین کے نفاذ کی پیروی [illegible] جاری کیا گیا۔ ایک موقع پر مہمان کے لئے حجرہ میں چائے لانے پر پابندی عائد کر دی گئی تھی۔ حالاں کہ ان سارے احکامات پر مکمل طور پر عمل درآمد نہیں کیا گیا لیکن اس ضمن میں کسی حد تک کامیابی ضرور حاصل ہوئی۔ [11]

میاں گل جہان زیب کے عہدِ حکومت میں سیدو مینگورہ روڈ پر تانگہ چلانا منع تھا۔ اسی طرح دارالحکومت میں کتا پالنا اور مرغا رکھنا ممنوع تھا۔ مبادا کہیں ایسا نہ ہو کہ ان دونوں کی آوازوں کا شور شاہی دفتر یا شاہی محل کا پرسکون ماحول غارت کردے۔ اس بنا پر یہاں لاؤڈ سپیکر کا استعمال بھی ممنوع تھا۔ سڑک کے کنارے پیشاب کرنے پر سخت پابندی تھی اور پیشاب کرنے کے بعد استنجا کی غرض سے ڈھیلے یا کاغذ سے خود کو خشک کرنے کا برسرِ عام عمل قابلِ سزا جرم تھا۔ تہمد باندھنے اور پان کھانے پر بھی پابندی تھی۔

عورتوں کے حقوق

'سوات کے پٹھانوں کے زرعی جاگیردارانہ معاشرہ میں اقتصادی اور سیاسی قوت کا بنیادی ذریعہ زمین تھی۔ اور جس طرح شمالی عرب بدوؤں کے لئے اونٹ لازم و ملزوم ہے سوات کے پختونوں کے لئے سیاسی شناخت اور

کہ عورتوں کو اس سلسلہ میں کوئی حق نہیں دیا جاتا تھا۔

میاں گل عبدالودود نے دعویٰ کیا ہے کہ عورتوں کو معاشرہ میں ان کا جائز مقام دے دیا گیا ہے اور انہیں شریعت کے مطابق ان کے حقوق دے دیئے گئے ہیں۔ لیکن ان کی وراثت میں دیئے گئے حق سے محرومی اور مہر میں دی گئی زمین پر لگائی گئی پابندیوں سے خود اس دعویٰ کی تردید ہو جاتی ہے اور مذکورہ بالا زبردستی کی شادیاں بھی اسے غلط ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں۔ درحقیقت عورتیں قبل از ریاست دور ہی کی طرح اُس کے دور حکومت میں بھی حق وراثت سے محروم رہیں۔ 1939ء میں عبدالودود نے ایک وصیت نامہ تیار کر کے اُس کی تصدیق اُس وقت کے صوبائی گورنر جارج کننگھم اور 1949ء میں پاکستان کے مقرر کردہ گورنر سے کرائی جس میں اُس نے اپنی پوری جائیداد اپنے دو بیٹوں میں بانٹ دی۔ جس سے یہ حقیقت بالکل آشکارا ہو گئی کہ اپنے ترکہ کے سلسلہ میں بھی شریعت کی پیروی سے اُس نے اجتناب کیا۔

عورتیں مہر میں ملنے والی زمینوں کو نہ تو بیچ سکتی تھیں اور نہ ہی انہیں رہن رکھ سکتی تھیں۔ وہ صرف اُس سے حاصل ہونے والی فصل استعمال کر سکتی تھیں۔ دیر۔ سوات زمینی جھگڑوں کی انکوائری کمیشن کی اضافی رپورٹ میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ وراثت کے متنازعہ مقدمات قاضیوں کے پاس بھیجے جاتے تھے اور 1949ء کے بعد سے وہ شریعت کے مطابق ان کا فیصلہ کرتے تھے۔ 1937ء اور 1949ء کے درمیان وراثت کے مقدمات قاضیوں کے پاس بھیجے جاتے تھے لیکن اُن کے زیادہ تر فیصلے کچھ لو اور کچھ دو کی بنیاد پر طے کئے جاتے تھے۔ 1949ء سے پہلے وراثت کا رواجی قانون نافذ العمل تھا۔ 1949ء میں اقتدار سنبھالنے کے بعد والی صاحب نے بھی ابتدا میں رواج کی بنیاد پر فیصلے کئے لیکن بعد میں کچھ وراثتی تنازعات میں عورتوں کو شرعی قانون کے مطابق ان کے حصے دیئے۔ جب کہ بعض

مقدمات میں صرف اُن زمینوں کی فصل استعمال کرنے کی انہیں اجازت دی لیکن اُن کے فیصلے اندھادھند، الل ٹپ انداز میں کئے جاتے تھے۔ بعض مثالیں ایسی بھی ہیں کہ انہوں نے مردوں کو زنانہ ورثا کو ان کا حصہ دینے سے روک دیا۔ وہ ایسے سارے مقدمات قاضیوں کے حوالے نہیں کرتے تھے۔ نہ ہی انہوں نے اس ضمن میں اسلامی قانون کے نفاذ کو یقینی بنانے کے لئے کوئی اقدامات کئے۔ انہوں نے خود دیر۔ سوات زمینی جھگڑوں کے انکوائری کمیشن کے روبرو اپنے بیان میں اس بات کو تسلیم کیا۔ سارے مقدمات میں والی کی کھلی اجازت کے بغیر زمین کو زنانہ وارثوں کے حوالے نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس طرح ان کے دورِ حکومت میں بھی جہاں تک زمین کی ملکیت اور وراثت کا تعلق ہے تو بالعموم رواجی قانون ہی نافذ العمل رہا۔

غیر مذہبیت اور مغربیت

ریاست سوات دن بہ دن غیر مذہبیت کی طرف بڑھتی چلی گئی۔ یہ بات کم اہمیت کی حامل نہیں کہ عبدالودود کے اقتدار میں آتے ہی ان کے پہلے اقدامات میں سے ایک یہ بھی تھا کہ اُس نے سارے مذہبی فقیر ریاست سے نکال دیئے۔ دیر کے برعکس سوات کے 'حکمران خاندان نے (جو کہ ایک صوفی بزرگ کی نسل سے تھا) برطانوی حکومت کی زیرِ سرپرستی اقتدار پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہی ریاست کو غیر مذہبی اور مغربی رنگ میں رنگنا شروع کر دیا'۔

ایان اسٹیفنز جب 1946ء میں سوات آیا تو وہ دیگر علاقوں میں اپنے تجربہ کی بنیاد پر علاقائی کھانا کھانے کا منتظر تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ کتنا عمدہ ہوگا لیکن کوئی ایسا کھانا سامنے نہیں آیا۔ بعد میں اپنے ایک اور دورہ کے دوران اُس نے 'اس قسم کے کھانے کے لئے باقاعدہ استدعا کی' اس لئے کہ اُسے یقین تھا کہ والی 'تنہا ہونے کی صورت میں یقیناً مغربی انداز کے کھانے نہیں کھاتا ہوگا۔ شاید ہم کسی دن خالصتاً وہ کھانا کھا سکیں گے جو پٹھان بالعموم کھاتے ہیں۔' تاہم وہ کہتا ہے کہ والی کی 'خوب صورت پیشانی پر بل آ گئے۔ میرے اس انوکھے سوال پر وہ کچھ ٹپٹایا اور احتجاجاً کہا: 'لیکن کوئی انگریز، انگریزی کھانے ہی کھانا چاہے گا۔ ہم ان کے لئے باقاعدہ اس کا اہتمام کرتے ہیں۔ میرے خیال میں تو میرا باورچی انہیں بہترین انداز میں تیار کرتا ہے۔'

عبدالودود کے عہدِ حکومت میں سوات میں سینما کا وجود نہیں تھا۔ ایلیز بیتھ بالنیوز سے کہا گیا کہ 'والی (باچا صاحب) نے سینما گھر بنانے پر پابندی لگا دی ہے۔' بالنیوز کے مطابق ''اُسے اس بات پر کیسے یقین آئے گا کہ وہاں دکھائی جانے والی فلموں سے لوگوں کو کوئی فائدہ حاصل ہوگا؟' بالنیوز اس پر اضافہ کرتے ہوئے کہتی ہیں۔

''جدید پردۂ سیمیں کے غیر فطری اور مصنوعی ذرائع اس پرسکون دور دراز علاقے میں کیوں متعارف کرائے جائیں۔ آدمی ایک جانب اس سخت گیر پالیسی کی تعریف کئے بنا نہیں رہ سکتا کہ کم از کم یہاں تو مقصد سے دیانت دارانہ لگاؤ اور مدبرانہ اخلاق

> بلندی موجود ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ حیرت بھی دامن گیر رہتی ہے کہ یہ مقامی قدیم ثقافت کب تک زندہ رہ سکے گی۔ کیا سوات کے نوجوان مرد و خواتین باہر کی دنیا دیکھ کر واپس آنے کے بعد یہاں کی سست رفتار بے لطف دیہاتی زندگی سے اکتاہٹ کا شکار نہ ہو جائیں گے اور ہمارے اپنے جزیرے کے باسیوں کی طرح پر تعیش زندگی کی آرزوئیں نہیں کریں گے۔ اور زندگی کی یہ رفتار ان کے لئے ناقابلِ برداشت نہیں ہو جائے گی۔"

لیکن یہ پابندی برقرار نہیں رکھی جا سکی۔ اپنے باپ کے برعکس میاں گل جہان زیب مغربی طرزِ زندگی، اقدار اور تفریح کا شوقین تھا۔ اُس نے سینما گھروں کی تعمیر کی اجازت دے دی اس لئے کہ 'وہ سوات کو پیرس بنانا چاہتا تھا'۔ 1965ء تک یہاں دو سینما گھر بن چکے تھے۔ ایک سوات سینما اور دوسرا طارق سینما۔

باچا صاحب کے زمانہ میں کھلے عام شراب پینا ممکن نہیں تھا لیکن اُس کے اقتدار سے دست بردار ہونے کے بعد حالات بدل گئے۔ حالاں کہ میاں گل جہان زیب نے مقامی طور پر شراب بنانے والوں سے تحریری ضمانتیں لے لی ہیں کہ وہ آئندہ شراب نہیں بنائیں گے لیکن باہر سے درآمد شدہ شراب کی رسد کھلے عام ہوتی تھی۔ اس کے باقاعدہ ٹھیکے دئے جاتے تھے اور اس سے حاصل ہونے والی آمدنی سرکاری خزانہ میں اضافہ کا باعث تھی۔ اس تغیر کی تصدیق کے لئے پیٹر مائن کی کتاب دی نیرو سمائل سے مدد لی جا سکتی ہے، جہاں وہ بتاتا ہے کہ اُن کے ساتھ کیا پیش آیا جب باچا صاحب کے دورِ حکومت میں وہ اسمگل شدہ وسکی کی ایک چسکی لے کر 'خود کو ڈنر کے لئے بالکل مستعد کرنا چاہتے تھے'۔ اس کے برعکس والی صاحب کے عہد میں اپنی آمد پر اُسے بتایا گیا کہ 'اُسے ہوٹل میں وسکی مل سکتی ہے اگر وہ چاہے، لیکن اُس کی قیمت اُسے خود دینی پڑے گی اس لئے کہ 'محکمہ مال کی فائل میں 'وسکی کے گوشوارہ کا ہونا بہت برا لگے گا۔ جس پر اُس نے ہنستے ہوئے کہا کہ اُس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ 'اُسے شراب مل بھی سکے گی'۔

عید کا تہوار عورتیں اپنے متعلقہ علاقہ کی زیارت میں مناتی تھیں لیکن مردوں کے لئے کوئی ایسی جگہ جہاں وہ یہ تہوار منا سکیں، نہیں تھی۔ ریاست کی جانب سے دریائے سوات کے بائیں کنارے پر موجودہ پولیس لائن کے مقام پر ایوب پل کے قریب اس موقع پر ایک میلہ کا اہتمام کیا جانے لگا۔ ریاست کی ہر جگہ سے بلکہ باہر سے بھی لوگ اس میں حصہ لینے کے لئے آتے تھے جہاں ناچ گانے والی لڑکیاں 'مکمل سرکاری تحفظ کے ماحول میں' اپنے فن کا مظاہرہ کرتی تھی'۔

میاں گل جہان زیب نے ناچ گانے کی سرپرستی کر کے اسے باضابطہ بنایا۔ اس پیشہ سے منسلک لوگ کچھ قواعد و ضوابط کے پابند تھے۔ اگر انہیں اپنے فن کے مظاہرہ کے لئے ریاست سے باہر لے جایا جاتا تو ان کے میزبانوں سے تحریری ضمانتیں لی جاتیں کہ وہ اُن کے ذاتی، مالی اور عزت و وقار کے تحفظ کے ذمہ دار ہوں گے۔ وہ لوگ خود بھی مقررہ قانون نہیں توڑ سکتے تھے۔ ناچ گانے کا یہی شوق تھا جو کہ والی صاحب کی ایک رقاصہ سے شادی پر

منتج ہوا۔ اس شادی کے اثرات اور نتائج کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ریاست کے کچھ اور ممتاز حیثیت کے حامل لوگ بھی رقاصاؤں کی ناوک اندازی کا شکار ہو کر والی صاحب کی پیروی کرتے ہوئے ان سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔

یہاں پہلے باریش لوگوں کی عزت کی جاتی تھی اور قبائل کے اکثر و بیشتر سربراہ باریش ہوتے تھے۔ والی صاحب ڈاڑھی اور مونچھوں سے نفرت کرتے تھے اور اس کی حوصلہ شکنی کرتے تھے۔ کئی باریش ریاستی ملازمین نے والی کو خوش کرنے کے لئے ڈاڑھیاں اور مونچھیں صاف کر لیں۔ بہت ہی کم استثنائی صورتوں کے علاوہ باریش لوگوں کو سرکاری ملازمت نہیں دی جاتی تھی۔ پاکستان ٹائمز میں شائع شدہ یہ بیان مکمل طور غلط نہیں کہ والی کی اجازت کے بغیر کوئی سرکاری ملازم ڈاڑھی مونچھ نہیں رکھ سکتا تھا۔ والی صاحب مغربی طرز لباس کے خوگر تھے اس لئے سارے سرکاری حکام اور طبقۂ خواص میں اسے پذیرائی ملی۔

تاہم فریڈرک بارتھ اس کا بہ نظر غائر جائزہ لیتے ہوئے کہتا ہے۔

"ریاست کے دوران سوات میں آنے والے سماجی تغیر کی اٹھان بغیر کسی منصوبہ کے بیرونی اور اندرونی عوامل کے نتیجہ میں پیدا ہوئی اور یہ جزوی طور پر ریاستی عمل کے ذریعہ سے غیر مطلوبہ نتائج اپنے ساتھ لائی۔"

نوٹس

یہ بیان عبدالودود اور جہان زیب دونوں کے اس دعویٰ کی نفی کرتا ہے کہ سوات میں پڑھے لکھے افراد کی تعداد بالکل نہ ہونے کے برابر تھی۔ 'صاحب علم مولویوں کی موجودگی' سے سوات میں پڑھے لکھے افراد کی موجودگی کا پتہ چلتا ہے۔ عبدالودود کے متازعہ دعویٰ کے لئے دیکھیں محمد آصف خان، دی سٹوری آف سوات ایز ٹولڈ بائی دی فاونڈر میاں گل عبدالودود بادشاہ صاحب ٹو محمد آصف خان (پرنٹیڈ بائی فیروز سنز لمیٹڈ، پشاور، 1963ء)، صفحات 67 تا 68۔ اور اسی مصنف کی تاریخ ریاست سوات وسوانح حیات بانئ ریاست سوات حضرت میانگل گل شہزادہ عبدالودود خان بادشاہ صاحب (پشتو) (معلومات اشاعت ندارد)، صفحات 281 تا 282۔ جب کہ جہان زیب کے دعویٰ کے لئے دیکھیں فریڈرک بارتھ، دی لاسٹ والی آف سوات: این آٹو بیاگرفی ایز ٹولڈ ٹو فریڈرک بارتھ، ری پرنٹ (بنکاک: وائٹ آرچڈ پریس، 1995)، صفحہ 112۔

عاقلمند خان، بالمشافہ گفتگو، ریکارڈ شدہ، ملک آباد، شموزئی، سوات، 16 مئی 1998۔ یہی بات نواب دیر سے بھی کی گئی جس نے 'خالونہ' کے مقام پر اسکول کو صرف بند ہی نہیں کیا بلکہ اس کی عمارت بھی جلا ڈالی۔ دیکھیں عبدالغفار خان، زما ژوند او جد وجہد (کابل: دولتی مطبع، 1983ء)، صفحات 178 تا 179۔

ڈیلی ٹیلی گراف کے نمائندہ خصوصی مارٹن مور نے جنگ عظیم دوم کے دوران یہ احوال بھی بیان کیا ہے' کہ ریاست میں

واحد بااختیار شخص حکمران خود ہے اور وہ اپنے اختیار کو قبائلی انداز میں منہ زبانی استعمال کرتا ہے۔ ریاست کے دور افتادہ علاقوں میں متعین حکام اسی طرح کوئی رپورٹ تحریر کرنے کی صلاحیت سے محروم ہیں جیسا کہ وہ انہیں پڑھنے سے۔ اسی لئے وہ اُس سے روزانہ کی بنیاد پر ٹیلی فون کے ذریعہ صلاح مشورہ لینے میں مصروف رہتے ہیں۔' اور اس طرح 'شاید پوری دنیا میں سوات واحد ایسی حکومتی مشین ہے جو کاغذ کے استعمال کے بغیر چل رہی ہے۔' دیکھیں مارٹن مور فرام ہز پیلس ان سوات دی والی کیپس ان ٹچ وِد ہِز ڈومینئن، نیشنل ڈاکومینٹیشن سینٹر، اسلام آباد، انڈیا آفس ریکارڈ، ایل/پی اینڈ ایس/3172/12، فائل نمبر46۔

ہم نے اس کے لئے قبول یا اختیار کرنے کا لفظ اس وجہ سے استعمال کیا ہے کہ بہت سے دیگر علاقوں اور اوقات میں اس گردشی 'ویش نظام' کے حوالے اور موجودگی کے ثبوت ملے ہیں۔ مثلاً اباسین کوہستان میں یہ نظام رائج تھا۔ مسٹر تھاربرن پختونوں کے یہودی النسل ہونے کی توثیق کے لئے اس طرح کے انوکھے رسوم کے بارے میں رقم طراز ہے جو کہ اُس نے صحیح النسل پختون قبائل میں مشاہدہ کیں جن میں سے ایک 'دوری تقسیم اراضی' ہے۔ (دیکھیں ڈینزل ابسٹن، پنجاب کاسٹس، دوبارہ اشاعت، دہلی: لو پرائس پبلی کیشنز، 1993ء، صفحہ 59)۔

شیخ ملی نے ویش نظام کیوں کر اور کیسے اختیار کیا، اس کی تفصیل جاننے کے لئے ملاحظہ کیجئے ہنری جارج راورٹی کی کتاب، نوٹس آن افغانستان اینڈ بلوچستان، جلد اول، اشاعت دوم (کوئٹہ: نسا ٹریڈرز، 1982ء)، صفحات 205تا210۔

والی صاحب کا یہ فرمان غیر معمولی اس لیے ہے کہ وہ اس میں صراحت کرتے ہیں کہ یہ باچا صاحب اور میرا فرمان ہے۔ جہاں تک مصنف کی معلومات ہیں اپنے ہر فرمان میں والی صاحب نے یہی کہا ہے کہ یہ میرا فرمان ہے۔ یا یہ کہ میرا حکم یہ ہے۔ مصنف نے والی صاحب کا کوئی اور ایسا فرمان نہیں دیکھا ہے جہاں انہوں نے یہ کہا ہو کہ یہ باچا صاحب اور میرا فرمان ہے۔

مخدوم تصدق احمد، سوشل آرگنائزیشن آف یوسفزئی سوات: اے سٹڈی ان سوشل چینیج (لاہور: پنجاب یونیورسٹی پریس، 1962ء)، صفحات 48تا49۔ 1955ء کے سال کی برآمدات ودرآمدات کی فہرست سے بعض اشیاء کی برآمد اور درآمد دونوں کا پتہ چلتا ہے۔ ایسا ان کے نئی اقسام متعارف ہوجانے سے ہوا۔ ان کی بعض اقسام چوں کہ سوات میں ناپید تھیں اس لئے ان کو درآمد کیا جانے لگا جب کہ بعض کی یہاں بہتات تھی اس لئے ان کو برآمد کیا جانے لگا۔

کالام کے مقام پر مجوزہ ہائیڈرو پاور پروجیکٹ کے لئے دیکھیں ڈیوڈ ڈشر کی کتاب دی نارتھ ویسٹ فرنٹیئر آف ویسٹ پاکستان: اے سٹڈی ان ریجنل جیاگرافی، صفحہ 56؛ ٹرائبل افیئرز ریسرچ سیل، ہوم اینڈ ٹرائبل افیئرز ڈیپارٹمنٹ، گورنمنٹ آف این ڈبلیو ایف پی، سیریل نمبر سوات/43، فائل نمبر FR.1959-16/237۔ تاہم اس بات کا ذکر کرنا مناسب ہے کہ کمشنر پشاور ڈویژن نے پولیٹیکل ایجنٹ ملاکنڈ کو بتایا ہے 'کہ ڈپٹی چیف انجینئر الیکٹرسٹی پشاور نے کہا ہے کہ ایگزیکٹیو انجینئر اریگیشن کی پیش کردہ تجویز سے بجلی پیدا کرنے کی کوئی ٹھوس صورت نہیں بن سکتی جب کہ لاگت اس پہ بہت زیادہ آئے گی۔ مزید برآں کہ واپڈا ہیڈ کوارٹرز نے مناسب لاگت والی جگہوں کی تلاش کے لئے سروے شروع کردیا ہے۔' (ٹرائبل افیئرز ریسرچ سیل، سیریل نمبر سوات/43، فائل نمبر FR.1959/6/273)۔

تاہم انہیں زنا اور قتل جیسے جرائم کے جرمانوں میں سے کوئی حصہ نہیں ملتا تھا۔

10. فرمان شاہی نمبر 67، 28 اپریل 1966ء، ڈسٹرکٹ ریکارڈ روم، گل کدہ، سوات، بنڈل نمبر ندارد، فائل نمبر ندارد، مصنف کا ذاتی ذخیرہ کتب و دستاویزات۔ تاہم اس کتاب کے لئے لئے جانے والے انٹرویوز سے مصنف کو یہ معلوم ہوا کہ عام لوگوں کی طرح سرکاری حکام بھی اس قسم کے کسی فرمان سے بے خبر ہیں۔

11. عجیب بات یہ ہے کہ عام لوگ ان فرمانوں سے ناواقف تھے بلکہ سابقہ ریاست کے وہ حکام جن سے مصنف نے اس ضمن میں ملاقاتیں کیں وہ بھی اس قسم کے زیادہ قوانین اور فرامین سے بے خبر تھے۔

ادغام

ریاستِ سوات' تمام سرحدی ریاستوں میں سب سے زیادہ ترقی کی جانب گامزن تھی اور' شمال مغربی سرحد کی ابھی تک موجود ریاستوں میں سے سب سے زیادہ اہم ریاست' تھی لیکن اس کے لئے اپنے طرزِ حکمرانی کی وجہ سے اپنے وجود کو زیادہ عرصہ تک برقرار رکھنا ممکن نہیں تھا جو کہ بدلتے حالات اور اس کے اندر سے وجود میں آنے والی طاقتوں سے متصادم تھا۔ پاکستانی اور عالمی منظر میں آنے والی تبدیلیوں اور واقعات نے بھی تبدیلی کے اس عمل کو تیز کر دیا۔

3 جون کے منصوبہ کے اعلان سے قبل 2 جون 1947ء کو وائسرائے نے ظہرانہ کے موقع پر نواب بھوپال اور مہاراجہ بیکانیر سے ایک ملاقات کی۔ وائسرائے اپنی ذاتی رپورٹ میں کہتا ہے کہ:

"جب میں نے اس منصوبہ کی تفصیل اُسے بتائی تو نواب بھوپال نے کہا ایک بار پھر جلالت مآب کی حکومت نے نوابوں کو مشکل میں تنہا چھوڑ دیا ہے۔ ہم کیبنٹ مشن کی پیش کی ہوئی اسکیم کے مطابق ممکن الوقوع کمزور مرکز کے ساتھ شامل ہو سکتے تھے لیکن اب ایک مضبوط مرکز ہوگا، ہم جس مملکت کے ساتھ بھی ملیں گے، وہ ہمیں مکمل طور پر تباہ کر دے گی۔"

جہاں تک ریاست سوات کا تعلق ہے تو نواب بھوپال کی پیش گوئی حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی۔ یہ کچھ عرصہ تک تو اپنے علاحدہ وجود کو برقرار رکھ سکی لیکن 1969ء میں اس کے الگ وجود کا خاتمہ ہو گیا۔ جب اُسے اس مملکت میں مدغم کر دیا گیا جس کے ساتھ اس نے شمولیت اختیار کی تھی یعنی پاکستان۔

مسلم لیگ کی قیادت نے 15 اگست 1947ء کو انگریزوں کے چلے جانے کے بعد نوابی ریاستوں کی اپنی علاحدہ حیثیت برقرار رکھنے کی حمایت کی تھی لیکن پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد انہوں نے اپنا رخ بالکل مخالف سمت کی طرف موڑ لیا۔ S.J.Olver اپنے ایک خفیہ مکتوب میں بیان کرتا ہے کہ 'قلات کی ریاست کو پاکستان میں شامل ہونے کے لئے دباؤ کے طور پر اُس کی تابع (لس بیلہ، خاران، اور مکران جو پہلے ریاست قلات کی محکوم رہ چکی تھیں) ریاستوں کی جانب سے پاکستان میں شامل ہونے کے لئے پیش کشوں کا انتظام کروایا گیا اور پھر انہیں منظور

کرلیا گیا۔اس طرح ان تینوں ریاستوں کی شمولیت کا قانونی جواز مشکوک ہے۔'

پاکستان کے وجود میں آنے کے فوراً بعد سے پاکستانی حکمرانوں کی ان ریاستوں کے بارے میں پالیسی ان کے مفادات کے خلاف تھی۔ ان کی طرف سے شمولیت پر رضامندی کے حصول کے بعد وہ ان کا پاکستان میں ادغام چاہتے تھے۔ لیاقت علی خان نے اپنی اس خواہش کا اظہار ان الفاظ میں کیا کہ وقت آگیا ہے کہ ہم ان ریاستوں کو ضم کر دیں۔' اگر چہ اپنے اس خواب کو حقیقت کا جامہ پہنانے سے پہلے ہی اسے قتل کر دیا گیا لیکن پاکستانی حکام نے اُس کی پالیسی کو جاری رکھا اور چند برسوں کے اندر ہی سرحدی ریاستوں دیر، سوات اور چترال کے علاوہ سب کو ضم کر لیا گیا۔ ان تینوں ریاستوں کے مدغم نہ کرنے کی وجہ یہ رہی کہ ان کی تزویراتی اہمیت کی وجہ سے مرکزی حکومت ان پر سے اپنے بلاواسطہ قبضہ سے دست بردار ہونے پر آمادہ نہیں تھی۔'

ماخذ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ دیگر ریاستوں کے مقابلہ میں ریاست سوات سے زیادہ چھیڑ چھاڑ نہیں کی گئی۔ اس کا ایک سبب تو یہاں کے حکمرانوں کا رویہ تھا۔ دوسرا یہ کہ اس کی سرحدیں براہِ راست افغانستان سے نہیں ملتی تھیں۔ افغان اور پختونستان عامل نے پڑوسی ریاست دیر میں بہت کام دکھایا۔ درحقیقت ان سرحدی ریاستوں کا وجود کسی حد تک اس عامل پر منحصر تھا۔ برطانیہ کے یہاں سے رخصت ہونے کے بعد افغانستان سے سرحدی جھگڑا برقرار رہا۔ یوں افغان عداوت حکومت پاکستان کو پریشان کیے رکھتی رہی۔ چوں کہ افغان سرحد جزوی طور پر دیر اور چترال کی ریاستوں سے لگتی تھی اس لئے پختونستان کے مسئلہ پر کابل کے پیدا کردہ تناؤ سے ان سرحدی ریاستوں کی تزویراتی اہمیت بڑھ گئی تھی۔ اس صورت حال نے پاکستان کے وفاقی حکام کو ان سرحدی ریاستوں کے معاملہ میں احتیاط برتنے پر مجبور کئے رکھا۔

کچھ پاکستانی حکام ان سرحدی ریاستوں کے سلسلہ میں ہچکچاہٹ کا شکار تھے۔ 1962ء میں پولیٹیکل ایجنٹ کی جانب سے دیئے گئے اس مشورہ سے یہ حقیقت عیاں ہے کہ 'پاکستانی حکومت کی جانب سے قوانین کی توسیع سے یہاں پر یہ تاثر اُبھرے گا کہ یہ ریاستی انتظامیہ پر اُس کے مکمل قبضہ کی ابتداء ہے۔ ہمیں یہ تاثر پیدا کرنے سے احتراز کرنا چاہئے۔' پاکستانی حکام کے حلقہ میں بہت سوں سے والی صاحب کے دوستانہ مراسم تھے۔ انہیں وہاں بڑا اثر و رسوخ حاصل تھا جس کی وجہ سے وہاں ان کی حمایت تھی اور وہ اس ریاست کو اسی طرح برقرار رکھنا چاہتے تھے۔

والی کے دو بیٹوں کی شادیاں ایوب خان کی بیٹیوں سے ہوئی تھیں جس کی وجہ سے والی کی حیثیت خاصی مستحکم تھی۔ والی صاحب نے اسی حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ 'صدر ایوب مجھ سے کہا کرتے تھے: ' دیر کو تو میں آج پاکستان میں مدغم کرلوں لیکن اس سے تمہاری حیثیت پر اثر پڑے گا، اس لئے میں ایسا نہیں کر رہا۔'

ریاست کی آئینی حیثیت

نوابی ریاستوں کی جانب سے مکمل آزادی کے مفروضہ کو تسلیم کئے جانے کے بعد 15 اگست 1947ء کو حکومت پاکستان اور ریاست سوات نے اپنے مابین مستقبل کے تعلقات کا تعین ضابطۂ الحاق کی شکل میں کیا۔ یہ معاہدہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء کی شرائط سے مطابقت رکھتا تھا جنھیں حکومت پاکستان نے قبول کر لیا تھا۔ ریاست میں اپنے اقتدار اعلیٰ کو برقرار رکھتے ہوئے یہاں کے حکمران نے دفاع، خارجہ امور اور مواصلات پر حکومت پاکستان کا اختیار تسلیم کر لیا تھا۔ اس ضابطہ کی بنیاد پر ریاست سوات نے نہ صرف پاکستان کے وفاق میں اس کے ایک وفاقی جزو کی حیثیت سے جگہ حاصل کر لی بلکہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء کی ذیلی حصہ 5 کے شق (اے) میں اپنے لئے حوالہ بھی حاصل کیا۔[1]

دیر کے علاوہ دیگر وفاقی ریاستوں کی طرح ریاست سوات نے بھی 1954ء میں ضمنی ضابطۂ الحاق کو عملی صورت دی جس کے مطابق والی نے اپنے اختیارات پاکستان کے وفاقی قانون ساز ادارے کو سونپ دیے۔ اب اسے پاکستان کے دیگر حصوں کی طرح اس ریاست کے لئے بھی قانون سازی کا حق وفاقی اور دیگر متفرقہ میدانوں (فہرست II اور VII,III شیڈول آف گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء) میں مل گیا اور اسے ان پر ریاست میں عمل درآمد کا حق حاصل ہو گیا۔ حکمران کے اعلان میں مزید کہا گیا کہ:

"میں مزید یہ اعلان کرتا ہوں کہ پاکستان کا وہ آئین جسے پاکستان کی قانون ساز اسمبلی بنائے گی اسی طرح اس ریاست کا بھی آئین ہوگا جس طرح پاکستان کے دیگر علاقوں کے لئے ہوگا اور اس پر اس کی تمام شقوں کے مطابق جس وقت عمل درآمد کیا جائے گا اور اس آئین کی تمام شقیں اس کے نافذ ہوتے ہی موثر ہوں گی۔ اور اس سے متصادم دیگر تمام آئینی شقوں کو کالعدم کر دیں گی۔"

اس معاہدے سے قانون ساز اسمبلی نے وہ اختیار حاصل کر لیا جس کے تحت وہ سوات کو پاکستان کی آئینی تنظیم میں ایسی جگہ دے سکے جسے وہ موزوں سمجھے۔ قانون ساز اسمبلی نے بنیادی اصولوں کے لئے قائم کمیٹی کی سفارش پر جمہوریہ پاکستان میں سوات کو دیگر ریاستوں کی طرح جگہ دے کر اسے بھی جمہوریہ کا حصہ بنا دیا۔ اس بنا پر قانون ساز اسمبلی کی طرف سے سوات کو آئین پاکستان میں جگہ دیئے جانے کے بعد ریاست اس کی پابند ہو گئی۔ اب اگر اسمبلی چاہے تو ریاست سوات کو گورنر یا چیف کمشنر کے تحت کوئی صوبہ بنا دے یا کسی اور میں اسے مدغم کر دے یا اسے پہلے کی طرح کام کرتا رہنے دے۔

1956ء کے آئین کی تشکیل اور اعلان سے قبل بنیادی اصولوں کے لئے قائم کمیٹی اور قانون ساز اسمبلی کے جوائنٹ سیکرٹری عبدالحمید نے سوات اور دیگر وفاق کا حصہ بننے والی ریاستوں کے مستقبل کے بارے میں مختلف امکانی

صورتوں پر تفصیلی بحث وتمحیص کی۔ آئینی پوزیشن اور امکانی صورتوں کے مکمل تجزیہ کے بعد یہ کہا گیا:

"اگر حکومت ہندوستان اس عہدے سے حاصل ہونے والے اختیار کے ذریعہ کچھ ریاستوں کو مکمل طور پر ختم کرسکتی ہے اور دیگر کو گورنر یا چیف کمشنر کے تحت صوبائی حیثیت دے سکتی ہے تو بالآخر پاکستان کی قانون ساز اسمبلی اسی انداز کو اپناتے ہوئے ایسا کیوں نہیں کرسکتی۔ قانون ساز اسمبلی کو پورا اختیار حاصل ہے کہ وہ وفاق میں شامل ریاستوں کے لئے کوئی موزوں آئین تشکیل کر سکے اور اسے جو اختیار حاصل ہے اُس کے تحت یہ ان ریاستوں کو ختم کرسکتی ہے۔ آئین کے نفاذ کے بعد انہیں پاکستان ہی کے کسی پڑوسی صوبہ میں مدغم کرسکتی ہے۔ یا مستقبل میں ادغام کی کوئی صورت پیش کرسکتی ہے اس لحاظ سے ادغام ناممکن نہیں ہے۔"

لیکن صوبہ سرحد کی ریاستوں اور قبائلی علاقوں کو ادغام یا مکمل طور پر ختم کرنے کی جگہ 1955ء میں ون یونٹ آف ویسٹ پاکستان کے تشکیل پانے کے وقت خاص علاقے قرار دے کر قانون ساز اسمبلی کی طرف سے فراہم کردہ ایک خاص تعلق کی ضمانت دی گئی۔ اس کی وجہ بعض صوبائی سیاست دانوں اور افغانستان میں اس ادغام کے خلاف چیخ وپکار اور احتجاج کی فضا تھی جس نے تناؤ کی کیفیت پیدا کر کے حکومتِ پاکستان کو کسی ممکنہ قبائلی جنگ سے خوفزدہ کر دیا۔ 1956ء کے آئین نے نہ صرف یہ کہ ان ریاستی حکمرانوں کے حقوق ومفادات کی ضمانت دی بلکہ دفعہ 104 کے تحت شمال مغربی صوبہ کی ان ریاستوں کو خاص علاقہ کی اپنی حیثیت برقرار رکھنے کی اجازت دے کر خاص حیثیت عنایت کی۔ مزید برآں اس دفعہ کے تحت مغربی پاکستان کی صوبائی قوت نافذہ کو کسی کارروائی سے قبل صدر پاکستان کی اتفاق رائے سے مشروط کر دیا گیا۔

1962ء کے آئین میں سرحدی ریاستوں کو قبائلی علاقہ قرار دیا گیا اور اس آئین کی 'دفعہ 223 کے تحت یہ لازم کر دیا گیا کہ قبائلی علاقہ میں کوئی مرکزی یا صوبائی قانون صدر یا گورنر کی ہدایت کے بغیر نافذ نہیں کیا جا سکے گا'۔ ایڈیشنل پولیٹیکل ایجنٹ چترال کی جانب سے چترال کے مستقبل کے بارے میں اٹھائے گئے ایک سوال کے جواب میں یہ بیان کیا گیا کہ

"یہاں اس بات پر زور دینے کی ضرورت نہیں کہ اس معاملہ میں اس وقت کئے گئے کسی فیصلہ کا اطلاق صرف چترال تک محدود نہیں رہے گا بلکہ ملاکنڈ ایجنسی کی دو دیگر ریاستوں (دیر اور سوات) کی آئینی اور انتظامی ڈھانچہ کو بھی متاثر کرے گا۔ اس لئے اس معاملہ کا فیصلہ کسی موزوں موقع کے لئے مؤخر کر دیا جانا چاہیے۔ فیصلہ کے وقت اس کو بہر لحاظ دیکھا جائے گا۔"

حکومتِ پاکستان اپنے قوانین کی ان ریاستوں تک توسیع کرسکتی تھی لیکن ان قوانین کا نفاذ عملاً ریاستی انتظامیہ کی مرہونِ منت ہوتا تھا۔ اس لئے پاکستانی قوانین کی ریاستوں تک توسیع اور پھر ان کے نفاذ کا معاملہ بہت ہی مشکل مسئلہ تھا۔ اس مشکل سے بچنے اور کسی تناؤ سے اجتناب کی خاطر یہ پالیسی اپنائی گئی کہ ریاستی حکومتوں کو آمادہ کیا جائے کہ وہ کسی خاص قانون کو نافذ کرنے کے لئے خود ہی ضروری انتظامات کریں۔

25 مارچ 1969ء کو ایوب خان کی حکومت سے دست برداری اور ملک میں مارشل لاء کے نفاذ کے بعد 1962ء کے آئین میں صوبہ سرحد کی ریاستوں کو دی گئی 'قبائلی علاقہ کی حیثیت' کو عارضی آئینی حکم نامہ کی دفعہ 3 شق (ا) کے تحت برقرار رکھا گیا۔ جس میں کہا گیا کہ

"8 جون 1962ء سے نافذ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین کی تنسیخ کے باوجود آگے چل کر آئین سے مراد یہی آئین ہوگا اور وقت بہ وقت چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے کسی حکم یا فرمان کے اجراء کے علاوہ حکومت پاکستان اسی آئین کے تحت چلتی رہے گی۔ سوائے اُن باتوں کے جو اس حکم میں کہی گئی ہیں۔"

حالاں کہ عارضی آئینی حکم نامہ مجریہ 1969ء کے تحت ریاست سوات کی حیثیت کو بہ حال رکھا گیا تھا لیکن چند ماہ کے اندر اس ریاست کا خاتمہ کر دیا گیا۔ 1954ء کے ضمنی ضابطۂ الحاق کے تحت والی نے اپنے بیشتر اختیارات پاکستان کی قانون ساز اسمبلی کو سونپ دیئے تھے جو آئین پاکستان کے تحت ریاست سوات کو کوئی مناسب حیثیت دینے کی مجاز تھی۔ عارضی آئینی حکم نامہ 1969ء کے تحت یحییٰ خان چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور صدر کی حیثیت سے قانون ساز اسمبلی کے اختیارات استعمال کر سکتا تھا۔ اسی اختیار کے تحت والی کے اقتدار اور سوات کی ریاستی حیثیت کا خاتمہ کر دیا گیا۔

ادغام کی وجوہات:

مطلق العنانیت

باپ کی تخت سے اُس کے حق میں دست بردار ہونے کے بعد میاں گل عبدالحق جہان زیب (1908ء تا 1987ء) نے 12 دسمبر 1949ء کو اقتدار سنبھالا۔ اُس نے ترقیاتی کاموں اور منصوبوں پر عمل درآمد جاری رکھا۔ تعلیم، صحت اور مواصلات اس کی ترجیحات تھیں۔ قبائلی تنظیم کے باوجود ریاست سوات امن، سکون اور ترقی کے نمونہ کے طور پر ابھری۔ تاہم یہ ایک مطلق العنان قسم کی ریاست تھی اور حتمی طور پر بتدریج کھلنے والے منظر نامہ میں اس کے لئے اپنے وجود کو برقرار رکھنا ممکن نہیں تھا۔

باچا صاحب کچھ برطانوی اداروں کے لئے بڑے پُرجوش تھے۔ انہوں نے ٹیلی فون نظام لگانے کی استدعا کی اور برطانوی تیکنیکی مدد سے اسے لگایا۔ برطانوی امداد اور تیکنیکی مشورہ نے بادشاہ کو اندرونی بغاوت سے محفوظ بنایا اور سوات کے پختون پہلی بار مستقلاً کسی آمر کے زیر تسلط آ گئے۔ صورت حال کو اُس حقیقت نے مزید تکلیف دہ بنا دیا تھا

کہ انہوں نے خود ہی اس بادشاہ کو منتخب کیا تھا؛ میاں گل عبدالودود اور میاں گل جہان زیب نے مستحکم اور رفاہی اندازے حکومت کی اور اس بات میں کوئی شک نہیں کہ پڑوسی ریاستوں دیر اور چترال کے مقابلہ میں یہ ترقی اور استحکام کا ایک نمونہ تھی لیکن یہ ریاست مکمل طور پر 'سخت قسم کی مطلق العنان حکومت' کے تحت تھی اور یہاں کا حکمران ہی حکومت تھا اور حکومت ہی حکمران تھی۔ پیٹر بائن نے میاں گل جہان زیب کا مشاہدہ یوں کیا۔

''اس حد تک مطلق العنان کہ اگر چاہتا تو ہلاتا جلتا ہاتھ تک نہ اپنی رعایا میں سے کسی کا سر قلم کرسکتا تھا۔۔۔دراصل ریاست سوات اس بات کی ایک مثال ہے کہ مطلق العنانیت کس حد تک رفاہی ہو سکتی ہے۔ یہ ایک سیوز مانی ہے۔ میرا ماننا ہے اور یہ امر خاصا دلچسپ ہے کہ مطلق العنانیت بہترین صورت میں قابل تعریف انداز میں چل سکتی ہے۔ جیسے کہ جمہوریت بدترین صورت میں ایک گھناؤنے انداز میں چل سکتی ہے۔''

ای ڈبلیو آرلیبی کا یہ مشاہدہ بھی ریاست سوات پر لاگو ہوسکتا ہے۔

''ایک رفاہی آمر کی جسے اپنے عوام کی بہبود کی ہمہ وقت فکر لاحق ہو شخصی حکومت کی روایت ابھی زندہ ہے۔ یوں ایک باہمی وفاداری لوگوں کو اپنے حکمران سے جوڑے رکھتی ہے لیکن یہ وفاداری بنیادی طور پر غیر مزاحم قسم کی ہوتی ہے جو حکمران کی کسی اندرونی اور بیرونی منظم حملہ کی صورت میں بے طاقتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے بچا نہیں سکتی۔ جس طرح دنیا کے دیگر حصوں میں منتشر کسانوں کو کوئی خطرناک یا کسی انقلابی صورت حال میں کوئی فیصلہ کن کردار ادا کرنے کے قابل نہیں کرتا۔''

تقسیم ہند سے پہلے محمد یونس نے سوات کے حکمرانوں کو ایک بہت ہی صائب مشورہ دیا تھا کہ 'قدیم وفاداریاں ہماری پالیسیوں کی مزید رہنمائی نہیں کرسکتیں۔ ریاست سوات کا بانی وقت کے بدلتے مزاج کو دیکھتے ہوئے خود کو ان دوررس تغیرات کے مطابق ڈھال لے تو اچھا ہوگا۔' اس لئے کہ ان ریاستوں کے عوام کے اندر اپنے اپنے علاقوں میں ذمہ دار حکومتیں قائم کرنے کی خواہش انگڑائیاں لے رہی ہے۔ اُس نے میاں گل جہان زیب کو امید کی کرن قرار دیتے ہوئے مزید کہا کہ 'جدید نقطہ نظر اور شخصیت پر مغرب کی چھاپ، جہان زیب خان کو اپنے اردگرد کے خام قبائیلوں میں ایک ممتاز مقام کا مالک بنا دیتی ہے۔'

وزیر اعظم پاکستان لیاقت علی خان نے بھی ریاست سوات کے امور میں وہاں کے لوگوں کی عملی حصہ داری کی ضرورت پر زور دیا۔ 12 دسمبر 1949 میں والی کی دستار بندی کی تقریب میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے کہا:

''آج کی دنیا میں کسی ریاست کی ترقی کا اندازہ وہاں کے لوگوں کی خوشحالی اور اپنے ملکی معاملات میں ان کی حصہ داری سے لگایا جاتا ہے۔ کسی ملک کو آج کل صرف اس صورت میں مستحکم اور ترقی یافتہ گردانا جاتا ہے جب وہاں کے لوگ صرف معاشی طور پر خوشحال نہ ہوں بلکہ وہ اپنے ملک کا انتظام چلانے میں مکمل طور پر حصہ لیتے ہوں۔''

والی صاحب نے اپنے پورے دورِ حکومت میں محمد یونس اور لیاقت علی خان کے مشورہ اور امیدوں کو نظرانداز کیا۔ اُس نے نہ تو عام لوگوں کو معاشی طور پر خوشحال بنانے کی طرف زیادہ توجہ کی نہ ہی انہیں ریاستی امور میں شریک

ہونے کی اجازت دی۔ حالاں کہ ایک طرف سے حکومتی امور میں حصہ داری کے لئے مطالبہ زور پکڑ رہا تھا۔ جب کہ 1954ء میں اُس نے خود یہ دعویٰ کیا تھا کہ میری ہمیشہ سے یہ کوشش اور خواہش رہی ہے کہ ایک ترقی یافتہ ذمہ دار حکومت کے مقصد کے حصول کے لئے عام لوگوں کو ریاستی امور میں زیادہ سے زیادہ شریک کروں۔

ذمہ دار نمائندہ حکومت کی عدم موجودگی

آل انڈیا اسٹیٹس مسلم لیگ نے 25 جون 1948ء کو کراچی میں ایک تین روزہ اجلاس منعقد کیا۔ اجلاس کے دوسرے دن پاس ہونے والی پانچ قراردادوں میں سے سب سے اہم قرارداد میں پاکستان میں موجود ریاستوں میں ایک ذمہ دار حکومت کے قیام کا مطالبہ کیا گیا اور اس ضمن میں پاکستان کی وزارت خارجہ کی انڈین وزارت خارجہ کے مقابلہ میں بے عملی پر افسوس کا اظہار کیا گیا۔ وزیر داخلہ خواجہ شہاب الدین نے نوابی ریاستوں میں ذمہ دار حکومت کے قیام کے سلسلہ میں کانفرنس کی آرا، کو متعلقہ وزیر تک پہنچانے کا عہد کیا۔

چوں کہ آل انڈیا اسٹیٹس مسلم لیگ دو شاخوں میں بٹ چکی تھی۔ پاکستان لیگ کے آئین کی نمایاں ترین خصوصیت اُس کا یہ بیان تھا کہ 'پاکستان میں شامل ہونے والی تمام ریاستوں میں ذمہ دار حکومت کا قیام'۔ روزنامہ ڈان نے ان تمام ریاستوں میں موجود سیاسی پس منظر کا جائزہ لینے کے بعد اپنے تبصرہ میں کہا کہ امید ہے کہ نئی لیگ عام لوگوں کو ریاستی سیاسی زندگی میں شامل کرنے کی تحریک کی قیادت کرے گی اور ان کی توانائیوں کو خرچ کرنے کا صحیح راستہ ڈھونڈ نکالے گی۔ حکمرانوں کے لئے صلاح یہ ہے کہ وہ اس تحریک کے ساتھ تعاون کریں۔

حالاں کہ ریاست سوات میں کسی سیاسی سرگرمی کی اجازت نہیں تھی لیکن شیر افضل اور حمد افضل نے 1948ء میں ریاست سوات مسلم لیگ کی داغ بیل ڈالی لیکن چوں کہ حکمران کسی آزادانہ تحریک کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں تھے، اس لیے ریاست سوات مسلم لیگ بیرونی دباؤ برداشت نہ کرسکی۔ سوات میں سیاسی سرگرمی اور میل ملاپ کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی اس لئے ایسی ابتدائی کاوشوں کو انتہائی بے دردی سے کچل دیا گیا۔

1951ء میں حکومت پاکستان نے سرحدی ریاستوں کے عوام کی اپنی حکومتوں کے معاملات میں مؤثر شمولیت کے مقصد کے حصول کے لئے عملی اقدامات کا ارادہ کیا۔ خیال یہ تھا کہ حکمران کی جانب سے بدلتے منظرنامہ کے مطابق خود کو ڈھال کر ایک آئینی حکمران کی حیثیت قبول کرنے پر رضامند ہوئے بغیر کسی حقیقی ترقی کا حصول ممکن نہیں ہے۔ مزید یہ کہ حکمران اِس طرح اپنے عوام کے مقابلہ میں صرف اپنی حیثیت ہی مستحکم نہیں کریں گے بلکہ وہ اپنے لوگوں میں انقلابی اور ابتری کے وہ رجحانات پیدا کرنے کا سبب بننے سے بچ جائیں گے جو مسلسل انہیں ان کے

قانونی حقوق اور جائز خواہشات سے محروم کر کے انہیں ایک عالمِ جبر میں رکھنے سے ان علاقوں میں پیدا ہونا لازمی امر ہے۔ ریاست سوات کے بارے میں خصوصاً کہا گیا کہ

"والی نے مواصلات کی ترقی، صحت کے مسائل کے حل اور اسکولوں کے قیام کی طرف خاصی توجہ دی ہے۔ عزت مآب گورنر کی جانب سے اپنے لوگوں کو مناسب نمائندگی دینے کا سوال بھی اٹھایا گیا لیکن یہ ایک فطری امر ہے کہ اس بات کے نتائج سامنے آنے میں وقت لگے گا۔"

گورنر نے کسی بھی سرحدی ریاست میں جمہوریت کی طرف پیش قدمی کے لئے واضح اقدامات کی سفارش نہیں کی۔ بس یہ کہا کہ "موقع آنے پر ان اقدامات کو متعارف کرانے کے لئے وہ قدم اٹھائیں گے۔" حکومت پاکستان نے اُس کی رائے سے اتفاق کیا۔ ولکاکس کا یہ لکھنا بالکل جائز لگتا ہے کہ "جمہوری اصلاح میں بالفعل موجود مسائل صاف ظاہر تھے۔ جہاں وفاداری اس امن و امان کے لئے شرطِ اول ہو وہاں اختلاف کو کیسے برداشت کیا جاسکتا ہے۔ جب ریاست کی سماجی ساخت کا استحکام اِس معاشی عدم مساوات کا مرہونِ منت ہو جس میں ایک جنگ جُو اقلیت عیش کرتی رہے وہاں اکثریت کی حکمرانی کا خواب کیسے پورا ہوسکتا ہے۔"

حکومتِ پاکستان نے کسی طرح کی نمائندہ حکومت قائم کرانے کے لئے ضمنی ضابطہ الحاق پیش کیا جس پر نواب دیر کے علاوہ دیگر ریاستی حکمرانوں نے دستخط کر دیئے۔ والی صاحب نے 12 فروری 1954 کو اس پر دستخط کئے لیکن دیگر حکمرانوں کے برعکس ان کو پیش کی جانے والی شرائط بڑی فیاضانہ تھیں۔ حالاں کہ اُسے ایک مشاورتی کونسل قائم کرنے کے لئے کہا گیا جس کے پندرہ ارکان منتخب اور دس ارکان نامزد ہوں لیکن اِس کونسل کا صدر، وزیراعلیٰ اور حکمران وہ خود تھا۔ اِس مشاورتی کونسل کا بنیادی فریضہ یہ تھا کہ "وہ انتظامیہ، ترقیاتی منصوبوں اور قانون سازی کی تجاویز کے بارے میں عمومی پالیسی کے ضمن میں حکمران کو مشورے دے لیکن اُن معاملات کے بارے میں اُسے کچھ کہنے کا اختیار حاصل نہیں تھا جن میں وہ اپنی صوابدید یا ذاتی رائے سے تصفیہ کر سکتا ہو۔"

اس کونسل کو در حقیقت کوئی اختیار حاصل نہیں تھا اور "سوات میں مطلق العنان طرزِ حکومت اور سماجی استحصال میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں آئی۔" عملاً کونسل بالکل غیر اہم رہی اور کوئی بامعنی فعال کردار ادا کرنے کی جگہ یہ والی کی آلۂ کار بن کر اُس کے ہاتھوں میں کھیلتی رہی۔ نتیجتاً ایک ذمہ دار نمائندہ حکومت متعارف کرانے کے سلسلہ میں کسی قسم کی کوئی پیش رفت نہیں ہوسکی۔ نہ تو یہ والی کے جابرانہ اور آمرانہ طرزِ حکومت میں کوئی تغیر لاسکی اور نہ ہی ان لوگوں کی شکایات کا کوئی ازالہ کرسکی جو اس طرزِ حکمرانی کو بدلنے کے خواہاں تھے۔

معاشرہ کا جاگیردارانہ ڈھانچہ اور جاگیردار طبقہ کی ناراضگی

ریاستِ سوات کا روایتی معاشرتی ڈھانچہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے جاگیردارانہ تھا اور بالعموم زمینوں کے مالکان کی بہت قدر و منزلت تھی۔ خوانین، مَلک اور بارسوخ ستانہ داریوں تو اقلیت میں تھے لیکن سارا سیاسی غلبہ انہی کو حاصل تھا اور طبقہ خواص انہی پر مشتمل تھا۔ عبدالودود، جو ایک چالاک سیاست دان اور مدبر ہونے کی وجہ سے سیاسی تنظیم کی تمام پیچیدگیوں سے واقف تھا، نے

"باثر یوسف زئی شخصیات کے درمیان توازن برقرار رکھا۔ پختون غلبہ پر زور دینے کے ساتھ ساتھ اُس نے اونچے پہاڑوں میں موجود کوہستانیوں، گلہ بان گوجروں اور مسلم پراچہ کاروباری طبقہ کو بھی کافی توجہ اور وسائل دیے تاکہ ایک تو یہ لوگ مطمئن رہیں اور دوسرا یہ کہ پختونوں کی زورآوری کو بھی قابو میں رکھا جا سکے۔"

میاں گل جہان زیب کہتے ہیں کہ جاگیرداری کے مسئلہ پر ان کا اپنے باپ کے ساتھ نقطہ نظر کا اختلاف تھا۔ 12 دسمبر 1949ء کو اقتدار سنبھالنے کے بعد وہ اس کو بدل سکتے تھے اور 1950ء میں انہوں نے اس جاگیردارانہ نظام کو توڑنے کا آغاز کر دیا۔ جاگیردار طبقہ پہلے ہی اپنے فیصلہ کن کردار، حیثیت اور پوزیشن کے خاتمہ سے نالاں اور عبدالودود کے آمرانہ طرزِ حکومت سے تکلیف محسوس کر رہا تھا۔ جب جہان زیب نے پختون غلبہ اور جاگیردارانہ ڈھانچہ کو بالکل ختم کرنے کی کوشش کی تو یہ طبقہ بگڑ اٹھا۔

حالاں کہ یہ روایتی طور پر دو ڈلوں (دھڑوں) میں بٹے ہوئے تھے لیکن ضرورت پڑنے پر جب ان کا کوئی مشترکہ مفاد خطرہ میں ہوتا تو یہ لوگ متحد ہو جاتے تھے۔ اس سے پہلے 1863ء کی امبیلہ جنگ، 1895ء اور 1897ء کی ملاکنڈ جنگوں، 1915ء میں نواب دیر کے خلاف جنگ، ریاست سوات کی تشکیل کے بعد اور اپریل 1915ء میں عبدالجبار شاہ کو حکمران منتخب کرنے، 1917ء میں اُسے تخت سے الگ کرنے اور پھر 1917ء ہی میں میاں گل عبدالودود کو تخت پر بٹھانے کے مواقع پر انہوں نے ایسا ہی کیا تھا۔

سوات میں دونوں ڈلوں (دھڑوں) سے تعلق رکھنے والے سرکردہ خوانین نے خفیہ ملاقاتیں کر کے والی سے تعلق ختم کرنے، اُس کے اقتدار کا خاتمہ کرنے اور ریاست پر کی جانے والی حکومت کے انداز کو بدلنے کا عہد کیا۔ اس منصوبہ کا پتہ چل گیا۔ نتیجتاً کچھ خوانین خود ساختہ جلاوطنی اختیار کر کے ریاست سے چلے گئے۔ جو لوگ رہ گئے انہوں نے بھی دراصل ایک حکمت عملی کے تحت ایسا کیا تاکہ اپنے جلاوطن ساتھیوں کی مالی مدد کر سکیں۔ اس کے علاوہ انہیں اپنے ڈلوں (دھڑوں) کے مفادات اور اپنی عوامی حیثیت کا دفاع بھی کرنا تھا۔

یہ منصوبہ تو ناکام ہو گیا اور میاں گل جہان زیب نے اسے اپنے خلاف ایک بغاوت قرار دے کر الزام لگایا کہ کچھ جلاوطن خوانین نے انہیں ہلاک کرنے کا منصوبہ بنایا تھا لیکن اس پورے معاملہ نے مسائل اور بے چینی پیدا کی۔

سراج الدین خان نے وزیراعظم پاکستان لیاقت علی خان کے نام اپنے ایک خط میں لکھا کہ ہندوستان کی حکومت نے اپنے ہاں تمام ریاستوں کو ملک میں مدغم کر دیا ہے اور یہ کہ سوات کے لوگوں کو پاکستان کے ساتھ ادغام کے بارے میں بڑی توقعات تھیں لیکن وزیراعظم نے لوگوں کی خواہشات کے برعکس والی کے سر پر پگڑی باندھ دی۔ والی کے لئے مناسب یہ تھا کہ وہ حکومت کا باوقار انداز اختیار کرے اور اپنے عوام کو سہولیات فراہم کرے نہ کہ انہیں در بدر کرے۔ یہ خط لاہور کے ایک روزنامہ میں شائع ہوا۔ اس کے بعد اس موضوع پر کئی خطوط شائع ہوئے۔2

والی کو اس قسم کے خطوط اور اخباری بیانات سے چڑ تھی۔ ان جلا وطن حضرات کے بیان کے مطابق اُن سے مختلف ذرائع سے رابطے کئے گئے۔ والی کا دعویٰ اس کے برعکس ہے۔ دراصل پولیٹیکل ایجنٹ نے فریقین میں تصفیہ کے لئے کوششوں کا آغاز کیا لیکن یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔ 1953ء تک خوانین واپس لوٹ آئے اور والی صاحب نے خود تسلیم کیا کہ' یہ ایک بڑا اور طاقت ور گروہ تھا۔ زمینی املاک اور دیہاتوں پر قبضہ کے لحاظ سے نہیں بلکہ اثر و رسوخ کے لحاظ سے جو انہیں حاصل تھا۔' دوران حاشیہ۔ یہ لوگ اُس وقت اپنے مقاصد کے حصول میں ناکام رہے لیکن اُن کے مقصد اور خواب کو ختم نہیں کیا جاسکا۔ بعد میں ان لوگوں نے آمریت اور والی مخالف افکار اور سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ وہ والی کو ہٹانے میں تو کامیاب ہوئے لیکن اُس کے ساتھ ہی ریاست سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔

اصلاحات کا مطالبہ

سراج الدین خان والی کے قریبی ساتھی بیگورہ کے شیرزادہ خان کا بیٹا تھا۔ وہ تحصیل دار تھا اور سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تحریروں سے متاثر تھا۔ اُسے نہ تو اپنے عہدہ کی پرواہ تھی اور نہ ہی باپ کی والی سے دوستی کا خیال تھا۔ اپنی تحصیل داری کے دوران وہ والی کی شدید ناراضگی کے باوجود اصلاحات کے لئے کوشاں رہا۔ نتیجتاً اُس نے اپنے عہدہ سے استعفیٰ دے دیا لیکن ایک سرکاری رپورٹ کے مطابق 'اُسے نوکری سے نکال دیا گیا' تھا اس لئے کہ 'وہ کٹر مودودی تھا'۔

سراج الدین خان وہ پہلا شخص تھا جس نے کھلم کھلا حکمران سے اصلاحات کا مطالبہ کیا۔3 اُس نے میاں گل جہان زیب کو اصلاحات کی اپنی یادداشت اُس کی تخت نشینی سے دو دن پہلے پیش کی تھی۔ اس یادداشت میں کہا گیا تھا کہ پاکستان بننے کے بعد بھی نوابی ریاستوں کا وجود اس ملک کے نام پر ایک دھبہ ہے۔ سوات میں سے جمہوریت کو متعارف کرانے اور یا اسلامی نظام کے نفاذ کے ذریعہ صاف کیا جاسکتا ہے۔ لوگوں کی اکثریت اَن پڑھ ہونے کی وجہ سے جمہوریت ناقابل عمل ہے البتہ اسلامی نظام کا نفاذ حکمران اور محکوموں دونوں کے لئے بہترین رہے گا۔ اس تجویز کو

بدکر دیا گیا۔

سراج الدین خان نے خوانین کی جلاوطنی کے بعد وزیراعظم پاکستان کے نام ایک خط لکھا جو کہ اخباروں میں شائع ہوگیا۔ وہ اخباروں کے نام مسلسل خطوط کے ذریعے مطلق العنانیت اور ریاست میں موجود بدعنوانی کے خلاف رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لئے کوشاں رہے۔ سوات میں عیسائی مشنری اسکول کی حوصلہ افزائی کے خلاف اُس نے روزنامہ کوہستان کو ایک خط لکھ کر اس اسکول کو کیڈٹ کالج میں بدلنے کی تجویز پیش کی۔ یہ خط اس روزنامہ کے لاہور ایڈیشن میں 15 اکتوبر اور راولپنڈی ایڈیشن میں 17 اکتوبر 1962ء کو چھپا۔ اس کے نتیجہ میں سراج الدین خان کو والی کے دربار بلاکر بے رحمی سے پیٹا گیا اور تین سال کے لئے جیل بھیج دیا گیا۔

اس واقعہ سے بہت ناراضگی پھیل گئی۔ روزنامہ کوہستان کے ایڈیٹر نسیم حجازی اور سید عالی رضوی، روزنامہ نوائے وقت کے مجید نظامی، روزنامہ امروز کے ایڈیٹر اور دیگر اخبارات مسلسل ڈیڑھ مہینے تک ریاستی حکومت کی ناروا زیادتیوں کے خلاف مہم چلاتے رہے۔ سراج الدین خان کے ایک دوست عبدالرؤف نے مغربی پاکستان کے ہائیکورٹ میں اس قید کے خلاف ایک عرض داشت پیش کی۔ چیف جسٹس جناب منظور قادر اور جسٹس جناب شبیر احمد پر مشتمل ڈویژن بینچ نے 14 دسمبر 1962ء کو آئین کی دفعہ 98 کے تحت یہ درخواست سماعت کے لئے منظور کر لی۔ ایسا تاریخ میں پہلی بار ہوا کہ ہائی کورٹ نے سواتی حکام اور وہاں کے ایک باشندہ کے اوپر اپنے دائرہ اختیار کو استعمال کیا۔ عبدالرؤف نے سیاست دانوں اور اسمبلی ممبران سے رابطہ کیا اور اسمبلی میں آزاد گروپ کے سربراہ حبیب اللہ خان سعدی نے سراج الدین خان کے بارے میں 6 دسمبر 1962ء کو مغربی پاکستان کی صوبائی اسمبلی میں ایک تحریک التوا پیش کی جو کہ وزیر قانون کی مخالفت کے باوجود بحث کے لئے منظور ہوگئی۔ سراج الدین خان کو شدید دباؤ کے نتیجہ میں 40 دن کے بعد رہا کر دیا گیا لیکن اس سے والی اور اُس کے اختیارات اور زیادتیوں کے خلاف سیاسی حلقوں اور اخبارات میں ناراضگی کی سطح بہت بڑھ گئی۔ اس واقعہ کے بعد ایوب خان نے ایک ترمیم کے ذریعہ ریاست پر ہائی کورٹ کے دائرہ اختیار کو ختم کر دیا۔

سراج الدین خان نے اپنی جدوجہد جاری رکھی اور قبائلی علاقہ اور ریاستیں کے نام سے ایک کتابچہ لکھ کر اسے 1966ء میں چھپوا دیا، جس میں اُس نے نوابی ریاستوں کی حیثیت، قبائلی علاقہ، ان کے بارے میں حکومتِ پاکستان کی پالیسی اور ریاست سوات کے معاملات کا تنقیدی جائزہ پیش کیا۔ اُس نے سوات کے بارے میں ایک اور کتاب لکھی اور اسے بڑی مشکلوں سے لاہور سے چھپوایا لیکن اس کتاب کی تقسیم سے قبل اُسے اپنے والد کا خط ملا جسے کتاب کے موضوع کے بارے میں سُن گُن ہوگئی تھی۔ اس خط نے سراج الدین کو مشکل میں ڈال دیا اس لئے کہ اس میں کہا گیا تھا کہ اگر اُس نے اپنی کتاب تقسیم کی تو اُس کے پورے خاندان کو بہ طور سزا شدید مصائب و آلام کا سامنا کرنا

پڑے گا۔ سراج الدین خان نے کتاب کی ساری کاپیاں جلا کر اپنی جان لینے کی ٹھان لی۔ کتاب کی کاپیاں تو جل گئیں لیکن خودکشی کی اُس کی کوشش ناکام ہوگئی۔ بعد میں اُس نے سرگزشت سوات کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں سوختہ کتاب کے تقریباً سارے مواد کو شامل کیا گیا۔ اُس نے سوات میں اصلاحات کے لئے اپنی کاوشوں کو جاری رکھا جس کے نتیجہ میں اُسے شدید مشکلات اور نقصانات اٹھانے پڑے لیکن اُس کی تحریروں اور جدوجہد نے یقیناً ریاست سوات کے خاتمہ میں ایک اہم کردار ادا کیا۔

عبدالرؤف (بازار گے، بونیر، کا ایک باشندہ تھا) نے کئی سال دہلی میں گذارے تھے اور تقسیم کے بعد لاہور میں قیام پذیر تھا اور وہاں اپنا کاروبار کر رہا تھا۔ وہ ترقی پسند، سیاسی لحاظ سے فعّال اور سیاست دانوں اور صحافیوں سے رابطے رکھتا تھا۔ اُس نے سوات رائٹس ایسوسی ایشن کے نام سے ریاست میں اصلاحات اور لوگوں کے شہری حقوق کے لئے ایک تحریک شروع کی جس کے تحت وہ اجلاس منعقد کرتا، اخبارات میں مضامین لکھتا اور صوبائی اور قومی قانون ساز اسمبلیوں کے ارکان کے ذریعے قراردادیں اور تحاریکِ التوا پیش کراتا۔ اور قبائلی علاقوں اور نوابی ریاستوں کے پاکستان میں ادغام کے لئے مسلسل کوششیں کرتا رہا۔ وہ اس انجمن کے صدر کی حیثیت سے صدر، گورنر، وزراء، مرکزی قانون ساز اسمبلی کے ارکان اور تمام سیاسی جماعتوں کے سربراہان کو تار بھیجتا رہا اور پمفلٹ اور کتابچے شائع کرتا رہا۔

جوابی اقدام کے طور پر والی نے عبدالرؤف کو اُس کے اپنے بھائی کے ذریعے بونیر میں اپنی زمینوں سے محروم کر دیا (میاں گل عبدالودود اور میاں گل جہان زیب دونوں کا یہ ایک مشہور حکمت عملی تھی) اور اُس کی ملکیت کے دستاویزی ثبوت بھی ضبط کر لئے۔ مارچ 1962ء کو جب وہ والی کی عدالت میں حاضر ہوا تو اُسے گرفتار کر لیا گیا۔ اُس کی گرفتاری نے پاکستان میں کئی لوگوں کو ناراض کر دیا۔ محمود علی قصوری نے عبدالرؤف کے ساتھ اپنے تعلق کی وجہ سے پولیٹکل ایجنٹ سے کہا کہ والی اُسے کوئی تکلیف نہ پہنچائے۔ والی نے پاکستانی حلقوں کے سخت سیاسی دباؤ کی وجہ سے تین مہینے بعد اُسے چھوڑ دیا۔ پاکستان کے سیاسی اور صحافتی حلقوں میں اپنے اثر و رسوخ کی وجہ سے عبدالرؤف کے اس معاملہ سے بہت دور رس اثرات مرتب ہوئے۔

ریاست کے اندر بھی جدید تعلیم یافتہ لوگوں کا ایک حلقہ اس مطلق العنان طرزِ حکومت سے ناخوش تھا۔ سوویت یونین کی ایک سرکردہ نیوز ایجنسی اے پی این نے بعد میں اپنے ایک تحریری تبصرہ میں کہا کہ "بیسویں صدی کے دوران سوات کے سابقہ حکمران سے زیادہ اختیارات کا حامل کوئی اور فردِ واحد نہیں رہا۔" کچھ لوگ والی کی جانب سے ملازمتیں دینے میں امتیازی سلوک پر مبنی پالیسی، کم تعلیم یافتہ لوگوں کے اہم انتظامی عہدوں پر فائز ہونے اور اقربا پروری سے بھی نالاں نہیں تھے بلکہ ملازمتوں کے عدم تحفظ کے بھی شاکی تھے۔ یہاں کسی کی ملازمت کا تمام تر دارومدار والی کی من مرضی پر ہی تھا۔ اس سلسلہ میں وہ کسی ضابطہ کا پابند نہیں تھا۔

جون 1961ء میں 'فدائین سوات' کے نام سے ایک خفیہ تحریک شروع ہوئی۔ دسمبر 1964ء میں اسے 'جمہوری محاذ' کا نیا نام دیا گیا۔ دیگر کئی نام جیسے 'سوات قومی تحریک'، 'سواتی روروئی' (سواتی اخوت) اور 'پختون روروئی' (پختون اخوت) زیرِ غور آئے لیکن جنوری 1967ء میں اسے 'ملکی روروئی' (قومی اخوت) کا نام دے دیا گیا۔ اس کی بنیاد رکھنے والے تعلیم یافتہ اور ریاستی ملازم تھے جو سیدو شریف میں بہ سلسلۂ ملازمت اقامت گزیں تھے لیکن اُن کا تعلق دیہی علاقوں سے تھا۔

ان کے بنیادی مقاصد اور دل چسپی کے امور میں مطلق العنانیت کا خاتمہ، والی پر اصلاحات، قوانین اور ضوابط متعارف کرانے، جمہوری طرزِ حکومت کے آغاز کے لئے دباؤ، لوگوں کی عزت و وقار کا خیال رکھنے اور شہری حقوق کا تحفظ شامل تھا۔[4] اسکول کے دو اساتذہ مولوی فضل ربی اور محمد عارف بالترتیب اس کے پہلے صدر اور جنرل سیکرٹری بنائے گئے۔ مولوی فضلِ ربی اپنے دعویٰ کے مطابق نظریاتی اختلافات کی وجہ سے صدارتی عہدہ سے مستعفی ہوئے اور ایک عام رکن کی حیثیت سے تنظیم سے وابستہ رہے۔ جب کہ محمد عارف اس ضمن میں کہتے ہیں کہ اُسے تنظیم کی کونسل نے گروپ بندی کرنے کے الزام میں صدارت سے ہٹا دیا تھا۔ اس کے بعد جہان زیب کالج کے ایک پروفیسر امان الملک صدر بنے اور آخر تک اس عہدہ پر برقرار رہے۔

یہ ایک جان جوکھوں والا کام تھا۔ حقِ اظہار اور ضمیر کے معاملات کو ریاست کی حدود میں حرام سمجھا جاتا تھا۔ اس تنظیم اور اس کی سرگرمیوں سے تعلق کا راز کھلنے پر منحرفین کی ذات، ملازمت اور خاندانوں کے لئے ایک دورِ ابتلا میں داخل ہونا لازم تھا۔ تحریک کو خفیہ رکھ کر والی پر اصلاحات اور تبدیلی کے دباؤ ڈالنے کے لئے انوکھے طریقے اور غیر معمولی حکمتِ عملی اپنائی گئی اور ایک زیرِ زمین پروپیگنڈہ مہم شروع کر دی گئی۔ وقفے وقفے سے پمفلٹ لکھے جاتے اور انہیں پشاور میں اجمل خٹک اور افضل بنگش کی مدد سے طبع کرایا جاتا۔ متعین تاریخوں اور وقت پر انہیں ریاست بھر میں عوامی مقامات، سرکاری دفاتر اور عمارات پر چسپاں کیا جاتا۔ انہیں تحصیلوں کے اندر پھینکا جاتا بلکہ والی کے محل کے اندر بھی اُس کے محافظین میں سے تحریک کے ہمدردوں کے ذریعہ پھینکا جاتا[5]۔ 1965ء کے پاکستانی صدارتی الیکشن میں اس تحریک نے خفیہ طور پر فاطمہ جناح کے لئے مہم چلائی۔ وجہ ظاہر تھی۔ ایوب خان کے والی کے ساتھ خاندانی تعلقات تھے۔

وہ خوانین جنہوں نے 1951ء میں والی کے خلاف ایک کوشش کی تھی اور جن کے مقاصد ابھی تک پورے نہیں ہوئے تھے۔ تحریک نے ان کی حمایت بھی حاصل کر لی۔ اس سے یہ تحریک بے حد مضبوط ہو گئی۔ یہ ریاست کے ہر گاؤں تک پہنچ گئی اور ہر طبقہ فکر کے لوگوں میں اس کی حمایت پیدا ہو گئی۔ والی کی ذاتی زندگی کے بعض پہلو جیسے شراب

پیتا اور ایک رقاصہ لڑکی سے اُس کی شادی جیسے معاملات بھی عام لوگوں میں ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ حالاں کہ اس بارے میں اُس کے بڑے بیٹے میاں گل اورنگ زیب کا کہنا تھا کہ یہ شادی اُس کا ذاتی معاملہ تھا اور یہ صرف 'خاندان کے لئے برا تھا'۔ بہرصورت اس قسم کے معاملات اور مزید برآں والی کے بنگلہ پر طبقہ خواص کے ایک حلقہ کی خواتین کی محفلیں عام لوگوں میں نامقبول باتیں تھیں۔[6] ایک ہی جیسے معاملات میں والی کی جانب سے صادر کیے گئے بالکل متضاد فیصلے بھی (جن کی بنیاد صرف ذاتی پسند ناپسند تھی) لوگوں میں زیرِ بحث تھے۔ بعض اوقات عوام اور کبھی کبھی اپنے افسران کے ساتھ اُس کا انتہائی ہتک آمیز رویہ بھی اُس کی مخالفت میں اضافہ کا ایک سبب تھا۔ روز افزوں اقربا پروری، تحصیل داروں، حاکموں اور مشیروں کی جانب سے رشوت کی گرم بازاری اور چند چہیتوں کا سرکاری حکام کی مدد سے جنگلوں کا صفایا بھی عام تھا۔ اسی طرح ملازمتوں میں بھرتی اور ترقیوں کے لئے نہ تو کوئی اصول وضوابط تھے اور نہ معیار اور نہ ہی مقابلہ کے امتحانات کا کوئی تصور تھا۔ ان ساری باتوں نے مل کر لوگوں کے ایک خاص حصہ میں (جس میں تعلیم یافتہ اور اَن پڑھ دونوں شامل تھے) والی کے خلاف شدید قسم کی ناراضگی پیدا کر دی تھی اور اس بے چینی کو 'ملکی رورولی' نے استعمال کیا۔[7] اس کے اثرات کو کم نہیں گردانا جاسکتا۔

جماعتِ اسلامی کا کردار

جماعتِ اسلامی جو پاکستان کی ایک مذہبی سیاسی اور انتہائی منظم جماعت ہے اور جس کا اپنا پروگرام اور اپنے اصول ہیں۔ ریاست کے کچھ باشندے اس سے متاثر ہو کر اس میں شامل ہو گئے۔ ایک بے لچک مطلق العنان حکمران کی حیثیت سے والی کسی قسم کی سیاسی سرگرمی برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں تھا، حالاں کہ 1954ء میں ضمنی ضابطہ الحاق پر دستخط کرنے کے بعد یہ سرگرمیاں اب شجرِ ممنوعہ نہیں رہیں۔ والی نے خود بیان کیا ہے کہ 'سیاست دان یہاں احتجاج کر سکتے ہیں بلکہ کچھ سیاسی جماعتوں نے ایسا کیا بھی۔' لیکن حقیقت یہ تھی کہ ریاست میں نہ تو اُس نے کبھی احتجاج کی اجازت دی اور نہ ہی سیاسی سرگرمیوں کی۔

جماعت کے بعض ارکان کو سخت تنگ کیا گیا بلکہ 1952ء میں پنجاب میں آئے ہوئے سیلاب میں مدد دینے کے لئے جب اُس کے ارکان نے فنڈ اکٹھا کرنے کی کوشش کی تو ان میں سے بعض کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا گیا۔ کچھ فرار ہونے میں کامیاب ہوئے۔ جماعت اسلامی نے ملک بھر میں مطلق العنانیت کے خلاف ایک پروپیگنڈہ مہم چلائی جس نے والی کی پوزیشن کو بہت نقصان پہنچایا۔ جماعت کے گرفتار ارکان کو تو چھوڑ دیا گیا لیکن عداوت برقرار رہی۔ جماعت اور اُس کے اخبارات نے والی اور ریاست مخالف اپنے پروپیگنڈہ کو جاری رکھا حتیٰ کہ

سماجی اور معاشرتی عوامل

ریاست میں آنے والی سماجی و معاشی تبدیلیوں اور واقعات نے بھی ادغام کے معاملہ میں اپنا حصہ ڈالا۔ والی نے اپنے باپ کے پرانے وفاداروں اور حامیوں سے منہ موڑ کر نئے وفاداروں اور حامیوں پر تکیہ شروع کیا اور نوزائیدہ تاجر پیشہ طبقہ کی حمایت کر کے اُسے اپنی دولت اور حیثیت بڑھانے کا موقع دیا گیا۔ ان اندرونی تبدیلیوں سے روایتی مفادات یافتہ طبقہ اور قیادت کی حیثیت پر زد پڑی۔ یہ بات بھی اُن کی ناراضگی بڑھانے کا سبب بن گئی۔ اوپر آنے والا نیا طبقہ اپنی حیثیت پر نازاں تو تھا لیکن پرانے طبقہ کی طرح وفادار نہیں تھا۔ اپنے اپنے مقاصد کے حصول کے لئے دونوں گروہ آمریت اور والی مخالف تحریک کا حصہ بن گئے۔ ادغام کی راہ ہموار کرنے میں اس اتحاد نے بھی حصہ لیا۔

دوسری نمایاں معاشی پیش رفت مصنوعی ریشمی کپڑا بننے والی ملوں کا قیام تھا۔ درآمد شدہ دھاگے، مشینری اور پیداوار پر ٹیکس کی چھوٹ کی وجہ سے یہ ملیں بہت کم لاگت پر بہترین کپڑا تیار کرنے لگیں۔ ملک کے دیگر حصوں میں لاگو ٹیکسوں کی وجہ سے وہاں کے صنعت کار بازار میں سوات کی ملوں میں تیار کردہ کپڑے کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ سوات کے بعض مل مالکان کی ملک کے دیگر حصوں میں بھی ملیں تھیں۔ وہ سوات کے نام پر درآمد کردہ دھاگہ اور دیگر چیزیں سوات سے باہر بھی استعمال کرتے تھے۔ ملک کے صنعت کار جو ان سہولیات سے محروم تھے، وہ بھی ان ریاستی حکمرانوں کے خلاف پروپیگنڈہ میں شریک ہو گئے۔ انہوں نے روزنامہ نوائے وقت کے ساتھ ساتھ پنجاب سے تعلق رکھنے والے دیگر صحافتی اداروں کے ذریعہ بھی اس پروپیگنڈہ مہم کو تیز کر دیا۔ یاد رہے جماعت اسلامی پہلے ہی صحافتی حلقوں سے اپنے تعلق کو اس مقصد کے لئے استعمال کر رہی تھی۔

سیاستدانوں کا کردار

پاکستان کے بعض سیاست دانوں اور کچھ حکومت میں شامل لوگ جیسے عبدالقیوم خان، خواجہ شہاب الدین، اجمل خٹک، افضل بنگش، ارباب سکندر خان خلیل اور پیر فضل خالق ان سرحدی ریاستوں سے خوش نہیں تھے۔ عبدالقیوم خان جو کہ شمال مغربی سرحدی صوبہ کے وزیر اعلیٰ تھے خصوصاً ان ریاستوں کے مسلسل وجود کے سخت خلاف تھے۔ وہ ان ریاستوں میں عدم استحکام پیدا کر کے کسی مناسب کارروائی کے لئے زمین ہموار کرنا چاہتے تھے۔ سوات کے والی

مخالف خوانین کو انہوں نے اپنی حمایت کی یقین دہانی کرائی تھی لیکن جب ان لوگوں نے 1951ء میں جلاوطنی اختیار کی تو انہوں نے اپنے سیکرٹری شمس الحق کے زیرِ اثر اِس معاملہ سے لاتعلقی اختیار کر لی۔ شمس الحق والی کا دوست تھا لیکن ریاست کے بے چین عناصر کے لئے وہ ایک محرک کے طور پر کارگر تھے۔ جب وہ صوبہ سے مرکز منتقل ہو گئے تو ریاست کے لئے بالکل بے اثر ہو گئے لیکن والی مخالف عناصر کو انہوں نے جو تحریک دی تھی وہ اُن کے منظر سے ہٹ جانے کے باوجود زندہ رہی اور بالآخر ثمر بار ہوئی۔

جہاں تک صوبائی گورنر خواجہ شہاب الدین کا تعلق ہے تو وہ سواتی حکمرانوں سے ان کی انگریز حکومت، اسکندر مرزا اور اسی طرح کے لوگوں سے ان کے دوستانہ تعلقات سے ناخوش تھے۔ وہ اُن کے اختیارات اور اثر ورسوخ کو گھٹانا چاہتے تھے۔ حکومت پاکستان کی پالیسی یہ تھی کہ ریاستی حکمرانوں سے ضمنی ضابطہ الحاق کی رسمی منظوری حاصل کرلے۔ والی سے دستخط لینے میں شہاب الدین کے خصوصی کردار نے بہت اہم کام کیا۔ اس لیے کہ والی کے اپنے بیان کے مطابق اُس کی حیثیت ایک نگران منتظم کی سی ہو گئی اور سب جانتے تھے کہ اب ریاست کا کسی بھی وقت ادغام ہو سکتا ہے۔ شہاب الدین ہی کے کہنے سے والی نے جدید تعلیم کو ریاست میں پروان چڑھایا جو تعلیم یافتہ طبقہ میں جمہوری روح پیدا کرنے کا سبب بنی۔

اجمل خٹک زیرِ زمین منحرف تنظیم 'ملکی ورور لی' کے ہم کار دھاری تھے۔ اس کے لئے 'سوات جل رہا ہے' کے نام سے پہلا پمفلٹ انہوں نے ہی تحریر کیا تھا۔ نئی بننے والی تنظیم 'سوات لبریشن موومنٹ' کو بھی اجمل خٹک کی تائید و حمایت حاصل تھی۔ افضل بنگش، ارباب سکندر خان خلیل اور پیر فضل خالق نے بھی ان دونوں تنظیموں کی ہم کاری اور حمایت کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس سے یقیناً ادغام کی منزل آسان ہوئی۔

طلباء عنصر

پاکستان میں صدر ایوب کی حکمرانی کے خلاف غم و غصہ 1968ء میں اپنے عروج پر پہنچ گیا اور اکتوبر 1968ء میں بڑے پیمانے پر عوامی مظاہرے ہوئے۔ طلباء بھی اس تحریک میں شامل ہو گئے۔ اس تحریک میں شامل نہ ہونے پر جہان زیب کالج کے طلباء کو دوسری جگہ طلباء کی طرف سے مسلسل طعنے مل رہے تھے۔ اسی ضمن میں انہیں ایک تحقیر آمیز خط کے ساتھ چوڑیاں بھیجی گئیں۔ حالاں کہ ریاست میں طلبہ سیاست اور احتجاج پر پابندی تھی لیکن اس خط اور چوڑیوں نے اپنا کام دکھا دیا۔ طلباء نے ایوب مخالف مظاہرہ اور جلسہ کا اہتمام کیا۔ اس سے سوات میں بھی حالات گمبھیر ہو گئے۔ طلباء کو پیٹا گیا۔ کچھ کے نام کالج سے خارج کر دیئے گئے اور کچھ گرفتاری سے بچنے کے لئے فرار ہونے میں

کامیاب ہو گئے۔ان سواتی طلباء نے پریس کانفرنس منعقد کیں اور ملک بھر کے طلبہ نے ان کی حمایت میں احتجاج کیا اور اخباری بیانات جاری کئے۔

اس دوران ایوب خان حکومت سے دست بردار ہو گئے اور ملک میں ایک بار پھر مارشل لاء نافذ کیا گیا۔سواتی طلباء کے ایک راہنما افضل خان نے (جو کہ گرفتاری ہونے سے بچ کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا) ڈپٹی چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نور خان سے ملاقات کی (نور خان ہی طلباء اور مزدوروں کے معاملات کے نگران تھے) اور ان تک اپنی فریاد پہنچائی۔نور خان نے اُسے اپنی مدد کا یقین دلاتے ہوئے بتایا کہ اس سلسلہ میں کچھ نہ کچھ یقیناً کیا جائے گا۔

طلباء میں سے افضل خان، علی حیدر (سابقہ طالب علم)، عدالت خان اور نسیم کے آمریت مخالف اجلاسوں، پریس کانفرنسوں، اخباری بیانات اور ریاست کے باہر سے کئے جانے والے پروپیگنڈے نے یقیناً اوغام کے عمل کو تیز کر دیا۔انہوں نے سوات یوتھ فرنٹ کے نام سے ایک تنظیم بھی بنائی تھی۔وہ راولپنڈی کے طلباء کے تعاون سے اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے تھے۔ان میں طلباء راہنما جیسے غزالہ شبنم، شیخ رشید (جو بعد میں نواز شریف، پرویز مشرف، میر ظفر اللہ خان جمالی، چودھری شجاعت حسین اور شوکت عزیز کی حکومتوں میں وفاقی وزیر کی حیثیت سے کام کرتے رہے) اور رعنا انور شامل تھے۔راولپنڈی پریس کلب نے بھی ان کی بہت مدد کی۔

سوات لبریشن موومنٹ کا کردار

اس تناؤ والی صورتِ حال میں والی نے امان اللہ خان، محمود الحسن بٹ اور اسلم آفندی کے گھروں کی تلاشی کا حکم دیا۔یہ سب کے سب کسی وقت اُس کے قریبی ہم نشین رہے تھے لیکن اب اُس کے مخالف تھے۔یہ ایک اشتعال انگیز کارروائی تھی۔امان اللہ خان، محمود الحسن بٹ، سرن زیب (سواتی)، ہمایون خان، قلندر شاہ پاچا، دانی گل، شیرزادہ (ٹھیکیدار) اور دوسروں نے راولپنڈی میں ملاقات کی (بٹ کو جنرل پیرزادہ نے آگے بڑھایا تھا) اور سوات لبریشن موومنٹ کی تشکیل کر دی گئی لیکن قیادت کے معاملہ پر آکر سوئی اٹک گئی۔سب کو اپنے اہل خاندان کے تحفظ کا خوف دامن گیر تھا۔بالآخر یہ فیصلہ کیا گیا کہ محمد آفرین خان نامی ایک شخص کو (جو کہ پنڈی کے ایک غیر معروف علاقہ میں رہتا تھا) چیئرمین بنالیا جائے۔وہ اس عہدہ کے لئے ایک مثالی فرد تھا۔اس لئے کہ اُس کا سارا خاندان پنڈی میں مقیم تھا اور اُسے کچھ بھی کھونے کا کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا۔تمام تر سرگرمیوں کا اہتمام جیسے پریس کانفرنس اور اخباری بیانات وغیرہ اسلم آفندی کے ذمہ تھا۔جسے سیکرٹری مقرر کیا گیا۔آفرین خان کو اخباری سرخیوں کے ذریعہ معلوم ہوا کہ اُسے سوات لبریشن موومنٹ کا چیئرمین بنایا گیا ہے۔پروفیسر ضمیر زیدی (درحقیقت اسلم آفندی) کے مطابق تحریک کا مقصد

ریاست کا ادغام ہرگز نہیں تھا بلکہ خیال یہ تھا کہ والی پر دباؤ ڈال کر لوگوں کی شکایات کا ازالہ کروایا جائے اور اس ضمن میں مذاکرات کے لئے ایک گول میز کانفرنس کا انعقاد کیا جائے' اور یہ کہ

اس پورے عمل کے دوران سواتی راہنما پر امید تھے کہ والی کا رویہ نرم ہوگا اور انہیں گفت گو کے لئے بلایا جائے گا۔ ان کے وہم وگمان میں بھی ادغام کی بات نہیں تھی لیکن بد قسمتی سے تحریک میں تیزی آنے کے ساتھ ساتھ والی کے رویہ میں سختی اور ہٹ دھرمی بڑھتی چلی گئی۔

درحقیقت یہ تحریک اخبارات میں چل رہی تھی۔ عام لوگوں میں اس کا کوئی اثر نہیں تھا۔ سرن زیب (سواتی) یہ حقیقت تسلیم کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ ایک خود ساختہ لبریشن موومنٹ تھی تحریک نہیں تھی۔ سواتی حکام نے آفرین خان کی جانب سے 28 جون 1969ء کو پاکستان ٹائمز راولپنڈی کی اشاعت میں ایک اخباری بیان چھاپنے پر پاکستان پریس انٹرنیشنل کے منیجر کو ان الفاظ پر مشتمل نوٹس بھیجا۔

''آپ پر لازم ہے کہ ہمارے لئے بھی اور اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کے لئے بھی متعلقہ نمائندہ سے معلوم کریں کہ وہ بتائے کہ یہ آفرین خان نامی شخص کون ہے۔ ہماری معلومات کے مطابق یہ ایک نقلی آدمی ہے۔ امکانی طور پر اسلم آفندی یا محمود الحسن بٹ (دونوں غیر سواتی) جو کہ ایک فرضی نام سے ایک کھیل کھیل رہے ہیں۔ اگر ہماری یہ بات نہیں مانی گئی تو ہم قانونی کارروائی پر مجبور ہو جائیں گے۔''

سوات لبریشن موومنٹ کی جانب سے اخباروں میں شد و مد سے مطلق العنانیت کے خلاف کیا جانے والا پروپیگنڈہ ادغام کے عمل کو تیز کرنے میں یقیناً بڑی حد تک مؤثر ثابت ہوا۔

پاکستان کی سیاست میں آنے والی تبدیلیاں اور جنرل پیرزادہ کا کردار

والی صاحب نے قیوم خان کی جانب سے ریاست کو صوبہ کا حصہ بنانے کی کوشش وقتی طور پر ناکام بنا دی تھی اور ریاست کچھ عرصہ تک قائم رہی لیکن والی نے بدلتے منظر نامہ کو صحیح طور پر جانچنے میں غلطی کی، جس سے بے اطمینانی میں اضافہ ہوا اور اُس کی حکمرانی کے خلاف ایک زیادہ متفقہ تحریک کا باعث بنا۔ اس نے جنرل پیرزادہ کو موقع فراہم کیا اور اُس کا خصوصی کردار اس سلسلہ میں والی اور ریاست دونوں کے لئے مہلک ثابت ہوا۔

ایک افواہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ افواج پاکستان میں اپنی ملازمت کے دوران والی کے بیٹے اور ولی عہد میاں گل اورنگ زیب نے جو کہ جنرل ایوب خان کا داماد بھی تھا، جنرل پیرزادہ کی توہین کی تھی اور یہ کہ ایوب خان کی صدارت کے دوران اُس کو نظر انداز کر کے اُس کی جگہ کسی اور کو ترقی دی گئی تھی اور اُس کی مرضی کے خلاف اُس کا صدارتی سیکرٹریٹ سے جنرل ہیڈ کوارٹرز تبادلہ کر دیا گیا تھا۔ اس لئے وہ انتقاماً ریاست سوات کو فوری مدغم کر کے میاں

گل اورنگ زیب کو آئندہ والی بننے سے روکنا چاہتا تھا۔ جب وہ یحییٰ خان کا چیف آف سٹاف بنا تو اس نے محمود الحسن بٹ کو (جو کہ سوات کا ایک غیر سواتی باشندہ تھا) ایک انجمن بنا کر آمریت کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے کے لئے کہا، اور اخبارات سے کہا کہ والی کے حق میں کوئی بیان نہ چھاپیں۔

میاں گل اورنگ زیب کہتے ہیں کہ 'نہ تو میں نے کبھی جنرل پیرزادہ کی توہین کی تھی اور نہ ہی اُسے نظر انداز کر کے کسی اور کو ترقی دی گئی تھی۔ حقیقت میں ایوب خان نے طبی لحاظ سے مطلوبہ معیار نہ ہونے کے باوجود اُسے ترقی دے دی تھی۔' اور یہ کہ 'سوات کا ادغام ہونا ہی تھا۔ چوں کہ تمام ریاستوں کو مدغم کرنا تھا اس لئے صرف سوات کو استثنائی صورت نہیں دی جاسکتی تھی۔' تاہم میاں گل اورنگ زیب سے مصنف کے انٹرویو اور ڈاکٹر نجیب اللہ کی گفت گو سے اس بات کا اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ جنرل پیرزادہ اور میاں گل اورنگزیب کے درمیان کچھ نہ کچھ تلخی ضرور تھی۔ والی صاحب کی اس بات سے بھی اس بات کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ 'اورنگزیب اور پیرزادہ کے تعلقات اچھے نہیں تھے۔'

دیگر عوامل

جنرل ایوب کے زوال سے 'ملکی رورولی'، ریاست بدر طلباء اور ریاست کے باہر اور اندر رہنے والے آمریت اور والی مخالف عناصر اور نام نہاد 'سوات لبریشن موومنٹ' کی سرگرمیوں اور پروپیگنڈہ مہم میں بہت تیزی آگئی۔ والی کے خلاف جنرل یحییٰ خان کے نام بے شمار خطوط ارسال کئے گئے: اکثر جعلی ناموں سے اور ایک ہی شخص نے کئی کئی نقول پر دستخط کئے۔ اس قسم کے خطوط اور تار سوات کے ساتھ ساتھ ملک کے دیگر حصوں سے بھی ارسال کئے گئے۔[8]

والی نے خان بہادر سلطنت خان آف ځوره کے بیٹے فتح محمد خان اور اُس کے بھائیوں کو اور بیج بنڑ کے سردار خان کو اس الزام میں گرفتار کرلیا کہ وہ اُس پر حملہ کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ حالاں کہ خان بہادر کسی زمانہ میں اُس کے باپ یعنی باچا صاحب کا دستِ راست ہوا کرتا تھا۔ اُس نے پہلے ہی پروفیسر عبدالواحد خان کی ملازمت ختم کردی تھی۔ وہ 'ملکی رورولی' کے ابتدائی ارکان اور اُس کے انتظامی کونسل کے رُکن تھے۔ والی مخالف سرگرمیوں جیسے الزامات کے تحت بہت سے دیگر افراد کی ملازمتیں ان کی اپنی یا ان کے قریبی رشتہ داروں کی سرگرمیوں کی وجہ سے یا تو ختم کردی گئی تھیں یا اُن پر کارروائی جاری تھی۔[9]

والی مخالف موقف رکھنے کے الزام میں امان اللہ خان اور ملک شیر محمد خان (سابق ریاستی وزیر خزانہ اور والی کے قریبی ہم نشین) کو گرفتار کرنے کا حکم دیا گیا۔ امان اللہ خان نے بلا مزاحمت خود کو گرفتاری کے لئے پیش کردیا۔ جب کہ ملک شیر محمد خان کی رہائش گاہ کا ملیشا نے محاصرہ کرلیا اور اُسے گھر پر نظر بند کردیا گیا۔ اس کارروائی کے دوران گولی

چلنے کا واقعہ پیش آیا اور اشیر پاچا کا ایک ملازم (جو کہ اپنے مالک کے ساتھ سابق وزیر خزانہ سے ملاقات کے لئے آیا تھا) مارا گیا۔ 10

اس واقعہ کی اطلاع ملتے ہی سوات لبرلیشن موومنٹ کے چیئرمین آفرین خان، قلندر شاہ پاچا اور چاچا دین گل صدر یحییٰ سے فوری ملاقات کر کے اُسے سوات کی انتہائی ابتر صورت حال بتانے چل پڑے۔ وہ چونکہ پنڈی میں موجود نہیں تھا اس لئے اُس کے ملٹری سیکرٹری لیفٹیننٹ کرنل عارف (بعد میں جنرل عارف) سے رابطہ کیا گیا۔ اُس نے صوبائی حکام سے کہا کہ وہ والی کوالیسے واقعات کے سدِ باب کے لئے کہے۔

اجمل خٹک، افضل بنگش، ارباب سکندر خان خلیل، پیر فضل خالق، یحییٰ خان کے ایک بھائی اور کچھ دیگر سیاستدان پہلے ہی والی مخالف تحریکوں کا ساتھ دے رہے تھے۔ کچھ قائدین نے محمود علی قصوری اور ذوالفقار علی بھٹو سے مل کر اُن سے تعاون مانگا۔ بھٹو نے انہیں اپنی مدد کی یقین دھانی کرائی بلکہ صورت حال کو ذاتی طور پر جانچنے کے لئے آفرین خان کے ہمراہ سوات جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ سفر سے ذرا پہلے کسی صحافی نے آفرین خان کو خبردار کیا کہ بھٹو کو سوات نہ لے جایا جائے۔ ورنہ صورت حال بے حد خراب ہو جائے گی اور کئی مسائل پیدا ہو جائیں گے۔ جس کے نتیجہ میں یہ پروگرام بالکل آخری لمحہ میں منسوخ کر دیا گیا۔

دیر میں بھی حالات بدل گئے اور نواب کے خلاف غم وغصہ نے گھمبیر شکل اختیار کر لی۔

"بالآخر بندھ ٹوٹ پڑا۔ پاکستانی حکام کی اُن کی بے جا دخلتوں نے جو خسرو کی حمایت سے انتہائی حد تک بڑھ گئی تھیں مشوانیوں کو کھلم کھلا بغاوت پر مجبور کر دیا۔ دیر بھر میں فسادات کے نتیجہ میں تقریباً سارے سرکاری دفاتر، اسکول اور ہسپتال تباہ کر دیئے گئے۔ حالات کو قابو میں لانا خسرو کے بس سے باہر تھا۔ تشدد کا سلسلہ خراب موسم اور گولہ بارود ختم ہو جانے پر جا کر تھم گیا۔"

لگتا ہے اس سے بھی ان ریاستوں کے ادغام کے فیصلہ پر اثر پڑا ہو گا۔

ادغام

شامل کردی تھی ورنہ اصل متن میں اس کا ذکر نہیں تھا۔ یہ تقریر 28 جولائی 1969 کو نشر ہوئی۔ تاہم والی صاحب کے مطابق:

"جب ریاست کے ادغام کا فیصلہ ہو گیا تو میاں گل اورنگ زیب اور نواب دیر کو راولپنڈی بلا کر انہیں ادغام کے بارے میں پیغام دے دیا گیا... یہ (25 جولائی اور) جمعہ کا دن تھا جب کہ آئندہ پیر کے دن 28 جولائی 1969 کو ریاست کا ادغام ہوا۔"

اگر والی کی بات صحیح ہے تو پھر ادغام سے متعلق عام سوچ غلط ہے اور ادغام کا فیصلہ یحییٰ خان کی تقریر سے پہلے کر لیا گیا تھا۔ جیسا کہ نور خان نے پہلے ہی افضل خان سے کہا تھا کہ وہ کارروائی کرنے والے ہیں۔

ادغام کا فوری ردِعمل

والی کے مخالفین نے ریاست کے ادغام کا خیر مقدم کیا لیکن اُس کے حامیوں اور حکومتِ افغانستان نے اس پر ناراضگی کا اظہار کیا۔

والی کے حامیوں نے اس فیصلہ پر احتجاج کیا اور محمود الحسن بٹ کی پاک سٹی فیکٹری اور دیگر املاک پر حملہ کر دیا جو کہ ایک غیر سواتی تھا اور والی مخالف کیمپ کے سرخیلوں میں سے ایک تھا۔ وہ پہلا شخص تھا جس نے ادغام کے اعلان کے بعد پاک سٹی بلڈنگ پر پاکستان کا جھنڈا لہرایا تھا۔ پولیٹیکل ایجنٹ ہمایوں خان نے، جسے سوات کا قبضہ لینے کے لئے بھیجا گیا تھا، حکمت عملی سے کام لیتے ہوئے ادغام مخالف لوگوں کا غصہ ٹھنڈا کیا۔ اُس نے انہیں اپنی مکمل حمایت و تائید کا یقین دلاتے ہوئے کہا کہ وہ احتجاج بند کر دیں تاکہ والی صاحب اور خود اُن کے خلاف فوجی کارروائی کا جواز نہ بن جائے۔ اُس نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ اس سلسلہ میں ادغام کے خلاف خطوط اور عرض داشتوں کی مہم شروع کریں جسے صدر یحییٰ خان کے آگے پیش کیا جا سکے گا۔

ریاست کے حق میں نعرے لگاتا جلوس والی کے بنگلے تک آیا جہاں انہوں نے سامنے آ کر لوگوں کو پرسکون رہنے کے لئے کہا۔ اُس کی جانب سے کہے جانے والے اس دعویٰ پر کہ وہ اپنے حق میں ہونے والے ایسے احتجاج کی حمایت نہیں کرتے، سوالیہ نشان لگایا گیا تھا۔ احتجاج ختم ہو گیا۔ لکھے گئے خطوط اور دستخطوں کے ضمن میں ایک جملہ معترضہ: دستخطوں کی تعداد سوات کی کل آبادی سے دگنی تھی۔ یہ کھلی جعل سازی یحییٰ خان تک نہیں پہنچ سکی اس لئے کہ ہمایوں خان نے خود ہی اس کو جلا ڈالا۔

افغان حکومت نے ان تین سرحدی ریاستوں، سوات، دیر اور چترال کے ادغام پر احتجاج کیا۔ ایک ترجمان نے اس ضمن میں کہا کہ اُس وقت تک اس ادغام کا کوئی جواز نہیں بنتا جب تک پختون عوام اس کی توثیق نہ کر دیں۔ اس

ادغام میں والی کا کردار

یہ سوال ابھی تک جواب طلب ہے کہ والی صاحب خود کہاں تک ریاست سوات کے ادغام کے ذمہ دار ہیں۔

جاگیرداری کے خاتمہ کے سلسلہ میں اپنی کوششوں کی صفائی پیش کرتے ہوئے والی صاحب کہتے ہیں کہ 'میرا اپنا خیال یہ تھا کہ سوات کے لوگوں کو ایک آئینی قسم کی حکومت کے لئے تربیت دی جائے۔ اگر آپ لوگوں کو تعلیم دیں، پھر اُن سے مشورہ نہ لیں اور انہیں بولنے کا حق وغیرہ جیسی چیزیں نہ دیں۔ پھر لوگ احتجاج کرتے ہیں.... اگر آپ لوگوں کو تعلیم دے دیں تو وہ کسی غیر تعلیم یافتہ آدمی کی اطاعت کیسے کریں گے۔' وہ مزید کہتے ہیں:

> ''ایک بار میرے والد نے کہا... کہ آمریت بہترین طرزِ حکومت ہے بہ شرطیکہ آدمی کا دماغ نہ پھر جائے۔ ان کا اسی نظریہ پر عمل تھا۔ میں نے بھی اس پر عمل کیا لیکن مجھے پتہ تھا کہ ایک وقت ایسا آئے گا کہ میں اس پر مزید عمل نہیں کر سکوں گا۔ مجھے وقت کے ساتھ چلنا ہوگا۔ مجھے پیش بینی سے کام لینا ہوگا۔ میں کیمونزم اور اس سامجی اکھاڑ پچھاڑ پر کتابیں پڑھتا رہا ہوں۔ انگلستان میں بھی وہ نوابوں اور رئیسوں کے اختیارات پر نظرثانی کر رہے ہیں اور ان پر اور بعد از موت ان کی املاک پر بہت زیادہ محصولات کے ذریعہ اس مراعات یافتہ طبقہ کو ختم کر رہے ہیں۔ اس لئے جب میں حکمران بنا تو میں نے مرحلہ وار آہستہ آہستہ اس جاگیرداری نظام کو بدلنا شروع کیا۔''

والی صاحب کا یہ متنازعہ فیہ دعویٰ اپنی وضاحت آپ کرتا ہے۔ جاگیرداری کے خاتمہ کے لئے کوشش کرتے ہوئے انہیں مرحلہ وار ایک آئینی حکومت کو متعارف کرانے کا آغاز کرنا چاہیے تھا نہ کہ ایک نمائشی قسم کی مشاورتی کونسل بنا کر صرف ایک قسم کی لیپاپوتی سے کام لینا۔ وہ انگلستان کی مثال کی نقل تو کرنا چاہتے تھے لیکن صرف نوابوں اور رئیسوں کی حد تک وہاں کے بادشاہ کی نہیں، جس کے اختیارات بہت پہلے کم کئے جا چکے تھے۔ ان کی کارروائیاں تضادات پر مبنی تھیں۔ انہوں نے لوگوں کو تعلیم یافتہ بنانے کی کوشش کی اور اس کے ساتھ ساتھ روایتی قیادت کے اختیارات ختم کر دیئے لیکن ایک آئینی طرزِ حکومت متعارف کرانے اور اپنے اختیارات کم کرنے سے انکاری رہے۔

والی صاحب بیرونِ ریاست سے آنے والے ملاقاتیوں سے تو بہت نرم اور بلا تکلف انداز سے ملتے تھے لیکن اپنی رعایا سے تعلق رکھنے والے ملاقاتیوں اور اپنے حکام سے اپنے رویہ میں وہ تبدیلی نہیں لا سکے۔ وہ اپنے عوام سے تو بہت کچھ کی توقع رکھتے تھے لیکن خود ان سے ان کی بات اور مدعا جاننے کے لیے زبانی پوچھنے کے بجائے سر کی جنبش

سے کرتے تھے۔ بدعنوانیوں اور بے انصافیوں کے خلاف کچھ کہنے کی جرأت کرنے والوں کی بے رحمانہ مار پیٹ، گرفتاری اور اذیت کا سلسلہ جاری رہا۔ وہ کسی قسم کی نمائندہ حکومت قائم کرنے یا خود کو کسی قانون اور ضابطہ کا پابند بنانے کے لئے ہرگز تیار نہیں تھے بلکہ اکثر تو وہ اپنے فرامین کو بھی درخور اعتنا نہیں سمجھتے تھے۔

والی صاحب زمینی حقیقت کا پہلے سے اندازہ کرنے میں ناکام رہے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگ احتجاج پر مجبور ہو گئے۔ انہوں نے کسی قسم کی رعایت دینے، اصلاحات متعارف کرانے یا اپنے اختیارات میں ذرہ بھر کمی کرنے پر کسی قسم کی آمادگی ظاہر نہیں کی بلکہ وہ اپنی بات منوانے کے لئے اور زیادہ اکھڑ پن اور خودسری کا شکار ہو گئے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ اسی طرح مکمل اختیارات کے ساتھ حکمرانی کریں گے۔

پاکستانی سیاست کا منظرنامہ بدلنے کے ساتھ ہی والی کے پرانے دوستوں اور قریبی اتحادیوں نے سوچا کہ انہیں اصلاحِ احوال کے لئے مشورہ دینے کا مناسب موقع ہے۔ کامران خان اور محمد افضل خان (افضل خان لالا) نے موجودہ طرزِ حکومت کو بدلنے کے لئے مجوزہ اصلاحات پر مشتمل ایک یادداشت تیار کی۔[11] اسے میاں گل اورنگ زیب کی وساطت سے والی صاحب کی خدمت میں پیش کر دیا گیا۔[12] اس یادداشت کا جواب انہوں نے اس طرح دیا کہ 'میں حکمران ہوں، سوات پر مجھے حکومت کرنی ہے۔ قوانین کو حکومت نہیں کرنی۔' میاں گل اورنگ زیب نے یہ بات تسلیم کی کہ 'یقیناً انہوں نے مجھے کاغذ کا ایک ٹکڑا دیا تھا لیکن تب بہت دیر ہو چکی تھی۔ ریاست ادغام کے کنارے تک آ پہنچی تھی۔' نہیں کوئی ایسی 'دیر نہیں ہوئی تھی۔' والی صاحب اب بھی اس پوزیشن میں تھے کہ مناسب آئینی اقدامات اٹھاتے، اصلاحات متعارف کراتے، طرزِ حکومت میں تبدیلی لاتے اور ادغام سے ریاست کو بچا لیتے۔

والی صاحب خود کہتے ہیں: 'آدمی کو اصل صورتِ حال جانچ کر اس کے مطابق راہ نکال لینی چاہیے۔' سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اُس وقت اُن کے پاس بہترین راستہ کونسا تھا؟ انہوں نے تو صدر پاکستان یحییٰ خان سے یہ کہہ دیا کہ 'ریاست پر قبضہ کر لو۔' اس طرح انہوں نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ جس کے نتیجہ میں ریاست جاتی رہی۔ اُن کا عہدہ جاتا رہا اور ان کی رعایا اپنی ریاست سے محروم ہو گئی۔ انہیں عوام کے جائز مطالبات مان لینے چاہیے تھے، ان کی مبنی برحقیقت شکایات کا ازالہ کر کے سوات کی علاحدہ شناخت برقرار رکھنے کی حتیٰ الوسع کوشش کرنا چاہیے تھی۔ ایک بار انہوں نے دعویٰ کیا کہ 'میری پالیسی تھی کہ ہمیشہ چوکنا رہوں اور اپنی جداشناخت کو برقرار رکھوں۔' لیکن اُن کی خودسری اور ہٹ دھرمی نے ان کے اور ان کی حکومت کے خلاف مہم چلانے اور پروپیگنڈے کو پھلنے پھولنے کے لئے بہترین مواقع فراہم کئے جو صرف ان کے زوال کا باعث ہی نہیں بنا بلکہ ریاست ہی کا خاتمہ ہو گیا۔

ادغام کا اعلان ہو گیا لیکن قانوناً والی صاحب اب بھی سارے اختیارات کے مالک تھے۔ اس لئے کہ ادغام کا

نہ تو ابھی باقاعدہ اطلاع نامہ جاری ہوا نہ تبادلہ اختیارات اور نہ ہی حکمران سے اختیارات لے لئے جانے کی کوئی رسمی کارروائی سرانجام پائی لیکن انہوں نے یہ سمجھتے ہوئے اپنے اختیارات استعمال کرنے اور سرکاری فرائض سرانجام دینے ختم کردیئے کہ "لوگوں کو معلوم ہو گیا ہے کہ ریاست کا ادغام کردیا گیا ہے۔ اس لئے میرے پاس کوئی اختیارات نہیں ہیں۔" تاہم وہ روزمرہ کا کام دیکھتے رہے اس لئے کہ قانوناً وہ اب بھی حکمران تھے۔ یہ اور ادغام مخالف احتجاج اور خطوط اور دستخطوں کی مہم نے ان لوگوں کو پریشان کردیا جنہوں نے کسی نہ کسی شکل میں والی مخالف سرگرمیوں میں حصہ لیا تھا۔ لہٰذا اعلانِ ادغام کو منسوخ ہونے سے روکنے کے لئے انہوں نے سیاست دانوں اور حکام سے رابطے کئے تاکہ ادغام کو یقینی بنادیا جائے۔

مزہ کی بات یہ ہے کہ ریگولیشن I آف 1969ء کو (جس کے تحت چترال، دیر اور سوات کے حکمرانوں سے ان کے اختیارات لے لئے گئے) بالعموم ضابطہ ادغام کہا جاتا ہے لیکن نہ تو اسے اس قسم کا عنوان دیا گیا ہے اور نہ ہی اس میں ان تین ریاستوں کے ادغام کی بات کی گئی ہے۔ اس کا عنوان ہے چترال، دیر اور سوات (انتظام) ضابطہ 1969ء۔ اس میں کہا گیا ہے کہ یہ ایک ضابطہ قانون ہے جس کے تحت ان قبائلی علاقوں کی انتظامیہ میں تبدیلیاں کردی گئی ہیں جو سابقہ ریاستوں چترال، دیر اور سوات پر مشتمل تھا۔ تاہم اس ضابطہ کے شق 3 میں مذکورہ ریاستوں کے حکمرانوں کے اختیارات کے استعمال اور انتظامی امور کی انجام دہی کے خاتمے کی بات کی گئی ہے۔ اور ان ریاستوں کی دیر، سوات اور چترال کے سابقہ ریاستوں کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ اس ضابطہ کے تحت ریاست سوات 15 اگست 1969ء کو باقاعدہ طور پر ختم ہوگئی۔

نوٹس

1. میمورنڈم آن فیڈ ریلڈ سٹیٹس آف پاکستان، از عبدالحمید، جوائنٹ سیکرٹری، دستور ساز اسمبلی آف پاکستان، صفحہ 2۔ ایم اے جناح کے پرزور موقف کہ ہر انڈین ریاست مکمل خودمختار اور آزاد تھی کہ وہ دونوں ریاستوں، انڈیا اور پاکستان، میں سے کسی ایک سے بھی الحاق نہ کرے۔ اگر اس کی مرضی ہو کے لئے دیکھیں نیشنل ڈاکومینٹیشن سینٹر، اسلام اباد، پاکستان، انڈیا آفس ریکارڈز، فائل نمبر R/3/1/137 اور L/P&S/13/1827۔

2. سراج الدین خان، بالمشافہ گفت گو، ریکارڈ شدہ، سنگوٹہ، سوات، 11 جون 1998ء۔ سواتی تارکین وطن کے سلسلہ میں گورنر این ڈبلیو ایف پی کے نام تحریر شدہ خط (جو کہ یقیناً سراج الدین خان نے لکھا تھا) جس میں سوات میں آمرانہ طرزِ حکمرانی کا ذکر کرکے گورنر سے مدد کے لئے کہا گیا تھا تاکہ جانے والے بہ حفاظت اپنے گھروں کو لوٹ سکیں، ضبط شدہ جائیدادیں اُن کو

واپس کی جائیں اور ریاست میں ان کی جان و مال کے تحفظ کی ضمانت دی جائے کے لئے دیکھیں ٹرائبل افیئرز ریسرچ سیل، ہوم اینڈ ٹرائبل افیئرز ڈیپارٹمنٹ، گورنمنٹ آف این ڈبلیو ایف پی، پشاور، سیریل نمبر سوات /4، فائل نمبر 29، St.S(I)،1934ء۔

سرن زیب سواتی کا یہ دعویٰ کہ ریاست کے حکمرانوں سے اصلاحات کا مطالبہ کرنے والا پہلا شخص سراج الدین خان نہیں زرد اللہ خان ہے (سرن زیب سواتی بنام سلطان روم (مصنف) 4 جون 1999ء، ذاتی ذخیرہ کتب و دستاویزات) غلط ہے۔ زرد اللہ خان نے صرف 'سرخ پوشوں' کے ایک جلسہ میں شرکت کی تھی جس کا سرن زیب سواتی نے اپنے خط اور کتاب تاریخ ریاست سوات دونوں میں اعتراف کیا ہے۔

یہ نتیجہ مصنف نے اُن تمام ملاقاتوں کے بعد نکالا ہے جو اس سلسلہ میں اس نے تحریک سے تعلق رکھنے والے افراد سے کیں۔

تحریک سے تعلق رکھنے والے تمام افراد جن سے مصنف نے بالمشافہ گفت گو کی ہے اس بات پر متفق ہیں۔

اس بیان کی بنیاد مصنف کی انتہائی ثقہ لوگوں سے اس ضمن میں ملاقاتیں ہیں۔ مزید یہ کہ یہ بات زبان زد خاص و عام ہے۔ اس لئے یہ فرض کرنا مشکل نہیں ہے۔

مصنف کی تحریک سے متعلق لوگوں سے ملاقات و گفت گو اور عام لوگوں کی باتوں سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے۔

مولوی فضل کریم نے 1985ء میں مصنف کی موجودگی میں الٰہی کالونی کراچی کی ایک مسجد میں جمعہ کے خطبہ کے دوران لوگوں سے تاکیداً کہا کہ وہ نفاذ شریعت کے لئے جنرل ضیاء الحق پر زور ڈالنے کے لئے اُسے دوسروں کے نام سے بھی تار دیں، جیسا کہ انہوں نے والئی سوات کے خلاف کیا تھا۔

مثال کے طور پر افضل خان کے بھائی کو جو سینٹرل اسپتال میں ڈسپنسر کے فرائض انجام دے رہے تھے اس لئے نوکری سے نکال دیا گیا کہ افضل خان نے طلبہ ریلی کی قیادت کی تھی۔

شیر افگن عرف کاکا، بالمشافہ گفت گو، ریکارڈ شدہ، 24 جون 1998ء اور بذریعہ ٹیلی فون گفت گو، 3 اکتوبر 2000ء۔ ضمیر زیدی کا یہ بیان درست نہیں کہ وہ ملک شیر محمد خان کا نوکر تھا۔ وہ شیر محمد خان کا نہیں بلکہ اشبر پاچا کا نوکر تھا جو کہ فائرنگ کے اس واقعہ کے دوران اس سابقہ وزیر کے حجرہ میں موجود تھا۔ مصنف نے ضمیر زیدی کے بیان کو شیر افگن، سابقہ وزیر کے بیٹے، کے بیان پر ترجیح دی تھی اور نتیجتاً اپنے مضمون 'ریاست سوات کا پاکستان سے ادغام: اسباب اور اثرات' میں غلطی سے اُسے 'ملک شیر محمد خان کا نوکر' قرار دیا تھا لیکن ضمیر زیدی کا یہ بیان بھی اُس کے مضمون میں دیگر کئی بیانات کی طرح غلط نکلا ہے۔

ان میں سے ہر ایک کا یہ دعویٰ ہے کہ آئینی مسودہ اُس کی تحریر تھی۔ عبدالحلیم ایڈووکیٹ (ریاستی اسسٹنٹ سیکرٹری کم انفارمیشن آفیسر) جنہوں نے یہ مسودہ پڑھا ہے قانون کے بارے میں اپنی مہارت کی بنیاد پر کہتے ہیں کہ یہ ایس ایم ظفر یا محمود علی قصوری میں سے کسی ایک کا تحریر کردہ تھا۔ محمد افضل خان، بالمشافہ گفت گو، ریکارڈ شدہ، برہ درش خیلہ، سوات، 7 جون 1998ء: کامران خان، بالمشافہ گفت گو، ریکارڈ شدہ، گل کدہ، سوات، 14 ستمبر 1998ء: عبدالحلیم، بالمشافہ گفت گو ریکارڈ شدہ، سیدو شریف، سوات، 6 جولائی 1998ء اور زبانی 5 اگست اور 17 اکتوبر 2000ء۔

میمورنڈم کے بارے میں ضمیر زیدی کے متنازعہ فیہ دعوے غلط ہیں۔ دیکھیں 'سوات مرجر وید پاکستان اینڈ اِٹس کانسیکوئنسز' غیر مطبوعہ، مصنف کا ذاتی ذخیرہ کتب و دستاویزات، صفحہ 2۔

گیارہواں باب

بعد از ادغام

ریاست سوات اور والی کی حکمرانی کا 15 اگست 1969ء کو باقاعدہ اختتام ہوگیا لیکن اس علاقہ کو ون یونٹ کی تشکیل کے وقت جو خصوصی حیثیت دی گئی تھی، ابھی تک برقرار ہے۔ اُس وقت سے آئینی دستاویزات میں اسے جوں کا توں رکھا گیا ہے۔ اسے لوگوں کی مرضی کے بغیر ختم نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے یہ خصوصی حیثیت ابھی تک قائم ہے اور یہ علاقہ صوبائی زیرِ انتظام قبائلی علاقہ (پاٹا) کا حصہ ہے۔

ادغام کے اثرات

ریاست سوات کے ادغام کے فوائد ونقصانات کا فیصلہ آدمی کے نقطۂ نظر اور طرزِ فکر پہ منحصر ہے لیکن یہاں دو غیر ریاستی باشندوں کی آراء بیان کرنا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔ دونوں کا تعلق چارسدہ سے ہے۔ عبدالولی خان اور پیر فضل خالق۔

عبدالولی خان کے مطابق ریاست کے دور میں امن وامان تھا۔ فوری انصاف تھا۔ سڑکوں کی مناسب دیکھ بھال تھی اور قیمتیں کم تھیں۔ ریاست کی پختون شناخت، اس کے جھنڈے پر اس کی علامت اور پشتو زبان سرکاری زبان تھی۔ اُس نے مینگورہ کے شیرزادہ خان کے حجرہ میں والی کے مخالفین سے کہا کہ پاکستانی نظامِ حکومت کی برائیوں سے وہ بہ خوبی واقف ہیں۔ ریاست سوات سے اُس کا مقابلہ ہرگز ممکن نہیں۔ اگر ادغام ہوگیا تو پاکستانی نظام کی تین برائیاں یعنی پٹواری، پولیس اور وکیل بھی سوات میں داخل ہو جائیں گی اور لوگوں کے دکھوں میں بے پناہ اضافہ ہو جائے گا۔ تاہم پیر فضل خالق کا اس سلسلہ میں کہنا تھا کہ ریاست سوات میں مقدمات اور فیصلے بغیر دلیل، بغیر وکیل، اور بغیر اپیل (بے دلیلہ، بے وکیلہ، اور بے اپیلہ) کے کئے جاتے ہیں۔ یعنی والی کے سامنے دورانِ مقدمہ حجت کی اجازت نہیں۔ فریقین وکیلوں کی خدمات سے محروم ہوتے ہیں اور والی کے فیصلے حتمی ہوتے ہیں اُن کے خلاف کوئی

شنوائی نہیں کی جاسکتی۔

آمریت کا خاتمہ

ادغام سے اُس آمریت کا خاتمہ ہوگیا جس میں پیٹر مائن کے بقول 'اگر حکمران چاہتا تو بلا تأمل اپنے عوام میں سے کسی کا سر کاٹ سکتا تھا' اور جہاں حکمران پر کسی اپنے حکم کا لحاظ رکھنا بھی لازم نہیں تھا۔ مثال کے طور پر اُن کا ایک حکم یہ تھا کہ سیدوشریف کے سرکاری گھروں میں رہائش پذیر اگر کسی ملازم کو نوکری سے نکال دیا گیا تو گھر خالی کرنے کے لئے اُسے ایک ہفتہ کی مہلت دی جائے گی اس دوران اُسے گھر سے نہیں نکالا جائے گا۔ اُس نے افضل خان کے ایوب مخالف طلبہ تحریک میں اہم کردار ادا کرنے کی وجہ سے اُس کے بھائی کو نوکری سے برخواست کر دیا اور فوراً اُس کے گھر کا سارا سامان باہر پھینک دیا۔ اسی طرح پروفیسر عبدالواحد خان کو 18 مارچ 1969ء کو جہان زیب کالج کے وائس پرنسپل کے ذریعہ والی کا یہ زبانی حکم سنایا گیا کہ 'تمہاری ملازمت ختم کر دی گئی ہے، ایک گھنٹہ کے اندر اندر سرکاری گھر خالی کرو'، انہوں نے اُس دن شدید بارش کے باوجود اس حکم کی تعمیل کی۔

ادغام سے اُن لوگوں کی تالیفِ قلب ہوئی جنہیں ریاست کے دوران ریاستی حکمرانوں کی ذاتی پسند ناپسند یا چند لوگوں کی بے جا سرپرستی کی وجہ سے جسمانی، نفسیاتی اور مالی مشکلات و مصائب کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ وہ لوگ جو والی کے ہم نشیں رہے تھے لیکن پھر اُس کے خلاف ہو گئے تھے، انہیں بھی تسکین نصیب ہوئی۔ درآں حالیکہ وہ والی کو اصلاحِ احوال پر مجبور نہیں کر سکے تھے لیکن اُسے اقتدار سے الگ ہوتے دیکھ کر انہیں اطمینان ضرور نصیب ہوا۔ اسے انہوں نے اپنی کامیابی کا 'پہلا دور' قرار دیا۔

سیاسی آزادی

والی کی جانب سے ضمنی ضابطۂ الحاق کی منظوری کے باوجود ریاست میں نہ تو اظہارِ رائے کی آزادی تھی اور نہ ہی کسی سیاسی سرگرمی کی اجازت تھی۔ ادغام کے ساتھ ہی سیاسی سرگرمیوں پر سے پابندی ہٹ گئی اور قانون کی نظر میں کم از کم اصولی طور پر سب مساوی ہو گئے۔ زین العابدین کے کہنے کے مطابق ووٹ ڈالنے کے لئے حق دار ہونے کی سابقہ شرائط اتنی سخت تھیں کہ بہت کم لوگوں کو یہ حق حاصل تھا۔ اب ادغام کے بعد وہ سب کچھ بدل گیا۔ اب سب کو انسان گردانا جانے لگا۔ جب کہ والی کے عہدِ حکومت میں بہت کم افراد کو انسان سمجھا جاتا تھا اور اکثریت کو دو ٹانگوں والا جانور سمجھا جاتا تھا۔ ضمیر، اظہار اور سیاسی سرگرمیوں کی آزادی اب ایک حقیقت بن چکی تھی۔

ملازمتیں

پہلے ریاستی انتظامیہ اور دیگر عہدوں کے لئے مقابلے کے امتحانات نہیں ہوتے تھے۔ نہ تو ملازمت کو کوئی تحفظ حاصل تھا، نہ ملازمت کے لئے مساوی مواقع تھے۔ نہ ہی دوران ملازمت ترقی کے لئے کوئی یکساں نظام رائج تھا۔ تمام تقرریاں، ترقیاں اور برخواستگیاں حکمران کی مرضی پر موقوف تھیں۔

اب مقابلتاً سب کو یکساں مواقع کی فراہمی کا اہتمام تھا۔ ریاستی دور میں ملازم صرف اپنی کسی کوتاہی یا غلطی کی وجہ سے ملازمت سے ہاتھ نہیں دھو بیٹھتا تھا بلکہ کسی رشتہ دار کے کئے کا خمیازہ بھی اُسے بھگتنا پڑ سکتا تھا۔ یہ عدم تحفظ ختم ہو گیا اور اب حکام اور ملازمین کو ایک معلوم پالیسی کے تحت ترقی ملنے کا ایک یقینی نظام مل گیا۔

جائیداد کا تحفظ

عبدالودود اور جہان زیب کی حکومتوں کے دوران ایک بڑا مسئلہ ان کی ناراضگی کی صورت میں جائیداد سے محرومی کا تھا۔ کسی کو بھی ریاست میں جاری بدنام زمانہ طریقوں سے حکمران یا اُس کا کوئی منظورِ نظر اپنی جائیداد سے محروم کر سکتا تھا۔ فتح محمد خان کے مطابق یہ سب اب ختم ہو گیا۔ اب کوئی حکمران بھی نہ تو کسی کو جائیداد سے محروم کر سکتا ہے اور نہ ہی سوات سے باہر نکال سکتا ہے۔

سوات پر افغانستان کے دعویٰ پر ایک ضرب

یوں تو سوات نے کئی صدیوں تک اپنی آزادانہ حیثیت کو برقرار رکھا، تاہم برطانیہ اور افغانستان دونوں کی سوات، دیر، باجوڑ اور سرحدی قبائلی علاقہ پر حریصانہ نگاہیں لگی ہوئی تھیں۔ تاریخی پس منظر بیان کرتے ہوئے اس مسئلہ کا تجزیہ کرتے ہوئے اسلم آفندی کہتا ہے کہ آمریت اور والی مخالف تحریک نے 'اونٹ کی پیٹھ پر آخری تنکے کی صورت اُس کی کمر بھی توڑ ڈالی' ورنہ تو 'ریاست سوات وغیرہ کی ''متنازعہ علاقہ'' والی حیثیت جاری رہتی'۔ وہ مزید کہتا ہے:

''افغان حکومت نے شدید احتجاج کیا لیکن حکومت پاکستان نے ایک اچھی دلیل کے ساتھ اس کا جواب دیا کہ ادغام کا فیصلہ لوگوں کی خواہشات کے عین مطابق کیا گیا ہے۔ پچھلے منظر نامہ کو ذہن میں رکھتے ہوئے سوات کا پاکستان کے ساتھ ادغام کوئی معمولی تاریخی واقعہ نہیں۔ اس لئے کہ یوسف زئی قبائل نے جو بنیادی طور پر افغانی تھے اس ادغام کے ذریعہ رضا کارانہ طور پر خود کو پاکستان کا حصہ بنا دیا.....اور ایک زمانہ کے بعد بالآخر ان افغان یوسف زئی قبائل نے پاکستان کے حق میں ووٹ دے کر اس علاقہ پر افغان حکومت کے دعویٰ کو ختم کر دیا۔''

انتشار اور بے یقینی

ادغام کا اعلان 28 جولائی 1969ء کو ہوا لیکن 'دیر، چترال اور سوات (انتظامی) ضابطہ قانون، 1969ء' کا اجراء 15 اگست 1969ء کو ہوا۔ اس کی شق 3 بہ عنوان 'حکمران انتظامی وظائف ختم کردیں وغیرہ' میں کہا گیا کہ

''اس ضابطہ قانون کے روبہ عمل آنے کے بعد اس سے پہلے کے قانون، ضابطہ، رسم، رواج، احکامات یا ہدایات کے باوجود اس کے آغاز سے

(الف) صراحت شدہ علاقوں (دیر، چترال اور سوات) میں سے ہر ایک کا حکمران اپنے اختیارات پر عمل درآمد ختم کردے اور وہ تمام معاملات جو کہ صوبائی قانون ساز ادارہ کے تحت آتے ہیں یا ان علاقوں کی انتظامیہ سے متعلق ہیں ان کے بارے میں وہ کوئی کارروائی نہ کرے۔

(ب) اختیارات اور وظائف جن کا جزو (الف) میں حوالہ دیا گیا ہے، جن پر اس ضابطہ قانون کے اگو ہونے سے پہلے مذکورہ بالا علاقوں میں سے کسی کا حکمران عمل درآمد کررہا تھا، اب صوبائی حکومت کی عمومی دیکھ بھال اور ہدایت کے مطابق اُس کا مقرر کردہ افسر، شخص یا با اختیار جیسا کہ صوبائی حکومت چاہے عمل درآمد کرے گا۔''

اس کے باوجود بھی 'کوئی افسر، شخص یا با اختیار' ان حکمرانوں کے اختیارات و وظائف سرانجام دینے کے لئے مقرر نہیں کیا گیا۔ 16 اگست 1969ء کو اس ضابطۂ قانون کو قابلِ عمل بنانے کے لئے یہ حکم جاری ہوا۔

''مغربی پاکستان کی حکومت بہ خوشی ملاکنڈ ڈویژن کے کمشنر کو اختیارات تفویض کرتی ہے کہ وہ صوبائی حکومت کی عمومی دیکھ بھال اور ہدایت کے مطابق وہ تمام اختیارات استعمال کرنے اور وظائف سرانجام دینا شروع کردے جو کہ اس ضابطۂ قانون کے عین پہلے ان صراحت شدہ علاقوں کے حکمران استعمال کرتے تھے یا سرانجام دیتے تھے۔''

اس طرح ادغام کے اعلان نے دور دور تک ایک انتشار اور الجھن کی سی کیفیت پیدا کردی اور سوات پر بے یقینی کی سیاہ چادر تن گئی۔ والی صاحب نے اپنے سرکاری وظائف کی ادائیگی بند کردی لیکن اُن کی جگہ کوئی ایسا با اختیار شخص بھی موجود نہ تھا جو ان وظائف کو سرانجام دے۔ ریاست کے انتظامی حکام بھی الجھن کا شکار تھے۔ ادغام کا اعلان آئندہ حکومت کے لئے مناسب منصوبہ بندی اور اس کے عواقب و نتائج کا اندازہ لگائے بغیر کردیا گیا تھا۔ اس کے بعد میں کافی منفی اثرات اور متنازعہ فیہ نتائج سامنے آئے۔

ملازمتوں کا مشکل مسئلہ

ضابطۂ قانون I آف 1969ء کے تحت ریاست سوات کے سابق ملازمین حکومت مغربی پاکستان کے ملازمین بنوائے گئے جیسا کہ اس ضابطہ کی ایک شق کی ذیلی شق بہ عنوان 'سابقہ ریاستوں کے ملازمین کی ملازمتوں کا

تبادلہ میں بیان کیا گیا ہے۔

''وہ تمام افراد جو کہ اس ضابطہ کے آغاز سے قبل کوئی شہری عہدہ یا ملازمت رکھتے تھے۔اس میں وہ ملازم بھی شامل ہیں جو امن دامان قائم رکھنے کے لئے موجود فوج کے ملازم تھے اور صراحت شدہ علاقوں کی انتظامیہ کے تحت خدمات بجالا رہے تھے۔ان سب کو ضابطہ کے لاگو ہونے سے مغربی پاکستان کے ملازم گردانا جائے گا۔''

لیکن آنے والی ذیلی شق (2) میں اسے مشروط کر دیا گیا تھا۔

''باوجود یہ کہ قانون، ضابطہ، حکم یا ہدایت جس کا اطلاق وقتی ہو یا ملازمت کی طے شدہ شرائط اس کے خلاف کیوں نہ ہوں پھر بھی وہ لوگ جن کا حوالہ شق (1) میں دیا گیا ہے ان کی ملازمتوں کے بارے میں صوبائی حکومت ایسے شرائط کا رطے کرسکتی ہے جن کا اطلاق اُن پر ہوگا۔''

ملازمین کی ملازمتوں کی ہیئت بدلنے اور نئے قوانین وضوابط کی تشکیل اور نیا معیار بنانے سے پہلے ہی ڈپٹی کمشنر سوات نے 9 نومبر 1970ء کو پاکستانی قانون کو آڑ بنا کر مختلف شعبوں میں مختلف عہدوں پر تعینات ملازمین کی ایک بڑی تعداد کو جبراً ریٹائر کر دیا۔سابقہ ریاستی قوانین کو بہانہ بنا کر پاکستانی قوانین کے مطابق پنشن اور دیگر فوائد کے ان کے حق سے بھی انہیں محروم کر دیا گیا۔کچھ لوگوں کو بغیر کسی مناسب وجہ کے ان کی ملازمتوں سے محروم کر دیا گیا۔ایسا سب کچھ یحییٰ خان کی اُن یقین دھانیوں کے باوجود کیا جارہا تھا جو کہ ادغام کے وقت اُس نے کرائی تھیں۔

سرکاری ملازمین کو صوبائی تنظیم میں کھپانے میں تاخیر سے لوگوں میں خوف اور بے چینی پھیل گئی۔کسی دل جلے کا یہ کہنا بالکل صحیح تھا کہ حکومت نے اسکول، کالج، اسپتال اور ڈسپنسریوں کو تو اپنے قبضہ میں لے لیا ہے لیکن ان جگہوں پر ملازمت کرنے والوں کو ابھی پاکستانی تسلیم نہیں کیا گیا ہے۔یوں گویا سرکاری اداروں میں پرائیویٹ اساتذہ خدمات انجام دے رہے ہیں جو کہ تمام منطقی اصولوں کی خلاف ورزی ہے۔

1971ء میں مندرجہ ذیل اطلاع نامہ کے ذریعہ یکم جنوری 1971ء سے سابقہ ریاستی ملازمین کو صوبائی ملازموں میں شامل کرلیا گیا۔دیکھئے اطلاع نامہ نمبر پی ایس ر/ او ایس ر/ این ڈبلیو ایف پی 17-70/1، تاریخ 01/01/1971 کا پیراگراف 11۔لیکن سب ریاستی ملازمین کو صوبائی ملازمتوں میں جذب نہیں کیا گیا تھا۔ایسا کرنے میں تاٗخیر کر کے کچھ کو برخواست اور بہت سوں کو جبری ریٹائر کر دیا گیا اور جن کو صوبائی ملازمتوں میں جذب کیا گیا ان کی درجہ بندی مقرر کرنے میں تاخیر سے ان کو مزید پریشانی میں مبتلا کر دیا گیا۔

سابقہ ریاستی ملازموں کو موجودہ کے ساتھ ساتھ مزید حقوق، سہولیات اور رعایات دینے کی یقین دھانیاں غلط ثابت ہوئیں۔انہوں نے اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے مختلف قسم کی انجمنیں قائم کیں۔ان تمام انجمنوں کو ایک پلیٹ فارم کے تحت لا کر متحدہ جدوجہد کے لئے سوات ایمپلائز ایسوسی ایشن قائم کی گئی۔جلوس نکالے گئے۔احتجاج کیا گیا۔یاسین میتھانے ملاکنڈ درہ تک مارچ کیا۔

نیا ڈھانچہ، نئی طرزِ انتظامیہ اور شکایات

سوات کے باشندوں کو ادغام کے بعد نیا ڈھانچہ اور نئی طرزِ انتظامیہ کی وجہ سے عجیب صورتِ حال سے گذرنا پڑا۔ نوکر شاہی کی ایک نئی تنظیم آموجود ہوئی جو ایک مشترک طریق عمل کے تحت کام کرنے لگی لیکن اُس نے لوگوں کے مسائل حل نہیں کئے۔ ان میں کوئی جواب دہ نہیں تھا اور ہر ایک عذر پیش کرتا تھا کہ یہ میرے دائرہ اختیار میں نہیں اور یہ میری ذمہ داری نہیں۔ کسی حد تک یہ بات صحیح تھی اس لئے کہ مرکزی اور صوبائی گرفت اور اختیارات کی وجہ سے ان کے اختیارات محدود تھے۔ اور مشروط طور پر اس بات سے بھی اتفاق کیا جا سکتا ہے کہ 'نئی انتظامیہ کی راہ میں رکاوٹیں موجود ہیں اس لئے کہ بنیادی قانونی اور انتظامی ڈھانچہ تو وہی کا وہی رہا لیکن اب انتظامیہ کے پاس نہ تو وسائل ہیں اور نہ ہی وسیع پیمانہ پر اصلاحات کرنے کے لئے مشینری موجود ہے۔' لیکن نئی انتظامیہ کا طریقہ اور پالیسی مسائل کو حل کرنے کی جگہ وقت۔ گذاری پر مبنی تھی۔

نتیجتاً ہر طرف وسیع پیمانہ پر بدنظمی، عدم تحفظ، پہلے سے بڑھ کر بدعنوانی، بے انصافی اور قدرتی وسائل کا قتل عام نظر آنے لگا۔ لوگوں میں غصہ پیدا ہوا بالخصوص ان لوگوں میں جو ایک نیک مقصد کے لئے خلوص کے ساتھ آمریت کے خلاف سرگرم رہے تھے اور دو سال کے اندر اندر انہوں نے آواز اٹھانی شروع کر دی۔ مثلاً دانی گل (جو کہ آمریت مخالف مہم کی صفِ اوّل سے تعلق رکھتے تھے) کی قیادت میں ایک وفد نے جوائنٹ سیکرٹری صغیر انور کے سوات کے سرکاری دورہ کے دوران انہیں ایک یادداشت پیش کی۔ یہ دورہ وہ دو سینئر افسران کے خلاف شعبہ جاتی کارروائی کے سلسلہ میں کر رہے تھے جس کی تفتیش ریٹائرڈ جسٹس عبدالحمید نے زمرد کان فائرنگ کے سلسلہ میں کی تھی۔ جس میں چار افراد ہلاک اور 18 دیگر زخمی ہو گئے تھے۔ اس یادداشت میں بیان کردہ شکایات کا نچوڑ یہ تھا۔

''عجیب بات ہے کہ جب سے ریاست سوات کا ادغام مغربی پاکستان کے ساتھ ہوا ہے کسی ایک شکایت کا ازالہ بھی صحیح انداز میں نہیں کیا گیا ہے۔ انصاف کا حصول صرف ان کے لئے ممکن ہے جو یا تو انتظامیہ میں رسوخ رکھتے ہیں یا رشوت دے سکتے ہیں..... ریاست کے ادغام کے بعد نئی انتظامیہ یہاں ہونے والے کسی ایک ترقیاتی کام کی مثال پیش نہیں کر سکتی.....

موجودہ انتظامیہ کے پاس فنڈز کی موجودگی کے باوجود اسپتالوں، اسکولوں، سڑکوں اور صفائی وغیرہ کی صورتحال بد سے بد تر ہوتی جا رہی ہے۔ مینگورہ کے لئے فراہمی آب کا منصوبہ ابھی تک زیرِ غور ہے۔ بازار میں گھروں کی تعمیر کے لئے لکڑی نایاب ہے۔ حالاں کہ سابقہ ریاست نے گھروں کی تعمیر کے لئے خواہش مند لوگوں کو یہ سہولت دے دی تھی۔''

اسی طرح پروفیسر عبدالواحد خان جو کہ پہلے ابنِ زیاد، خالد ناصر اور ابو طارق کے نام سے لکھا کرتے تھے اور جنہوں نے اس سے پہلے آمریت کے خلاف 'سوات: زیادتیوں کا گہوارہ' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا۔ انہوں نے بھی ادغام کے بعد نئی انتظامیہ کی بیگانگی والے رویہ اور سوات کی افسوسناک صورتِ حال کا رونا رو دیا۔ انہوں نے

لوگوں کی شکایات کو یہ عنوانات دیئے۔ 'یہ سوات ہے' اور 'ہم کدھر کے رہے۔' سراج الدین خان جنھوں نے آمریت کے خلاف لکھ کر سب سے زیادہ اذیتیں برداشت کی تھیں، انہوں نے بھی اس موضوع پر ان عنوانات کے تحت لکھا: 'ضم شدہ قبائلی ریاستوں کے مسائل' اور 'سوات حال کے آئینے میں۔'

ایم ایس انور نے کئی وفود سے ملاقاتیں کر کے اور اپنے سامنے پیش کردہ یادداشتوں، پمفلٹوں اور خطوط کا جائزہ لینے کے بعد صورتِ حال کو اختصار کے ساتھ یوں بیان کیا۔

''میرا تاثر یہ ہے کہ سوات کے لوگوں پر ریاست کے ابتدائی طور پر مغربی پاکستان اور بعد میں صوبہ سرحد کے ساتھ ادغام کا کچھ اچھا اثر مرتب نہیں ہوا ہے۔ نئی انتظامیہ کو رکاوٹوں کا سامنا ہے۔ چوں کہ بنیادی قانونی انتظامی ڈھانچا تو وہی کا وہی ہے، جب کہ انتظامیہ کے پاس نہ تو وسائل ہیں اور نہ ہی وسیع پیمانہ پر اصلاحات کرنے کے لئے مشینری موجود ہے۔ اگر چہ یہ بات غیر منصفانہ لگتی ہے لیکن سوات کے عام لوگوں کا یہ خیال ہے کہ نئی انتظامیہ کا رویہ ان کے مسائل کے حل کرنے اور ان کی شکایات کا ازالہ کرنے کے لئے غیر ہمدردانہ ہے۔ اور یقیناً والی کی آمرانہ حکومت سے کسی طرح بھی یہ بہتر نہیں۔''

افسوس کی بات یہ تھی کہ صوبائی نوکر شاہی نے ایم ایس انور کی بیان کردہ شکایات کا ازالہ کرنے کے لئے قدم اٹھانے کے بہ جائے اس پر اعتراضات کئے کہ اس نے وفود سے ملاقات کیوں کی اور ان کی درخواستیں کیوں وصول کیں۔

ریاستی دور میں دفتری سرخ فیتہ نہ ہونے کی وجہ سے معاملات بہت جلد نمٹائے جاتے تھے اور ترقیاتی کام اور منصوبے مقررہ وقت میں مکمل کرلئے جاتے تھے۔ اب فیصلہ سازی، منصوبہ بندی، فنڈ مختص کرنے اور اس کی ادائیگی کے سارے اختیارات سوات سے مرکزی اور صوبائی حکومتوں کو منتقل ہوگئے تھے۔ ڈپٹی کمشنر سوات ارشد فاروق ریاستی دور اور بعد از ریاست دور کی تنظیم، اُس وقت کے والی اور اب اُس کی جگہ لینے والے کے اختیارات کا موازنہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ

''ریاست سوات کا ادغام تین سال پہلے ہوا۔ سابقہ والی ممکن ہے ایک جابر آمر قسم کا حکمران ہو لیکن اُس کی نظم حکومت میں فیصلے بہت جلد ہوجاتے تھے اور کئی ترقیاتی کام مکمل کئے گئے تھے۔ اب ڈپٹی کمشنر اس کی کرسی پر بیٹھتا ہے تو لوگ ہر قرین قیاس مسئلہ لے کر اُس کے پاس آتے ہیں... لیکن اُس کے پاس ان کے مسائل کا ازالہ کرنے اور ان کے فائدے کے منصوبے تیار کرنے کے لئے وسائل بے حد محدود ہیں۔''

نئے منتظمین کے لئے از خود اقدامات کرنے کی راہ میں یقیناً کچھ قانونی رکاوٹیں حائل تھیں لیکن اپنی برطانوی نوآبادیاتی تربیت اور سوچ نے انہیں ترقیاتی منصوبوں یا سوات کی مجموعی ترقی کے لئے بالکل بہرا بنادیا تھا۔ وہ اگر چاہتے تو اپنے ضلع کی ترقی کے لئے صوبائی اور مرکزی حکومت سے اپنے قلم کے زور پر لڑ جھگڑ کر بہت کچھ کر سکتے تھے۔ یہ کام کرنے میں وہ بری طرح ناکام رہے بلکہ ملاکنڈ ڈویژن کے پہلے کمشنر سید منیر حسین نے یہ تحریر کیا کہ

'سوات میں مزید کسی ترقیاتی کام کی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں پہلے ہی ضرورت سے زیادہ کام ہو چکے ہیں۔ ہمارا کام اب صرف انہیں برقرار رکھنا ہے۔'

اس سوچ اور طرزِ عمل کی وجہ سے مزید کوئی ترقیاتی کام تو کیا ہوتا سڑکوں اور دیگر موجود ترقیاتی کاموں کی مناسب دیکھ بھال بھی رک گئی۔ صحت کی مفت سہولت دم توڑ گئی اور یہ احساس پیدا ہوا کہ پاکستانی حکومت کی چھتری کے نیچے آنے سے امیدوں کی کھیتی ہری ہو جانے اور ایک بہتر زندگی کا آغاز ہونے کی جگہ سوات ایک اندھی کھائی میں گر پڑا ہے۔ صورتِ حال ہر لحاظ سے ابتر ہوتی چلی گئی۔

یہ تبدیلی اتنی اچانک آئی کہ ساری آبادی ایک قسم کے صدمہ سے دوچار ہوگئی۔ پہلے غیر سواتیوں کو انہیں غیر قانونی سرگرمیوں سے روکنے کے لئے یہاں رہنے کے لئے تحریری ضمانت دینی پڑتی تھی۔ حکمران یا ولی عہد کی اجازت کے بغیر انہیں یہاں زمین خریدنے کی اجازت نہیں تھی۔ یہ اجازت بہت ہی خاص صورتوں میں دی جاتی تھی۔ یہاں کاروبار کرنے یا صنعت لگانے کے لئے بھی ضمانت درکار تھی۔

والی کی اجازت کے بغیر سوات کی عورتوں کی غیر سواتی افراد سے شادی ممنوع تھی۔ عورتیں سوات سے بغیر راہداری لئے نہیں جا سکتی تھیں حتیٰ کہ علاج کی غرض سے جانے کے لئے بھی راہداری درکار تھی۔ یہ بات مقامی اور غیر مقامی دونوں قسم کے باشندوں پر لاگو ہوتی تھی۔ راہداری کی زرِ ضمانت یکساں شرح سے نہیں تھی۔ سوات سے عورتوں کی سمگلنگ روکنے کی غرض سے بھی ضمانتیں لی جاتی تھیں۔

ادغام کے ساتھ ہی ان پابندیوں اور اجازت نامے لینے کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ کئی غیر سواتی سوات میں بس گئے جس کی وجہ سے طاقت کے ڈھانچہ میں ہی تبدیلی نہیں آئی بلکہ نئے مسائل نے جنم لیا۔ آبادی میں تیزی سے ہوئے اضافہ اور مینگورہ اور اُس کے مضافات میں تیز اور بغیر کسی منصوبہ کے پھیلاؤ نے سوات کے لوگوں اور ٹاؤن کمیٹی پر بے حد دباؤ بڑھا دیا۔ ملک کے ہر طرف سے لوگوں کی آمد نے زمین کی قیمتوں میں بے تحاشہ اضافہ کر دیا اور سراج الدین خان کے مطابق سواتی معاشرہ نئے دور کی برائیوں کا آسان ہدف بن کر اُن میں لت پت ہو گیا۔

ملکیت زمین کے تنازعات

مختلف لوگوں کی طرف سے اس بات کی سفارش کے باوجود والی صاحب نے جدید خطوط پر بندوبست اراضی کا کام نہیں کیا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ادغام کے بعد زمین کی ملکیت پر جھگڑے شروع ہو گئے۔ وہ لوگ جن کی زمینیں شاہی خاندان یا دیگر طاقتور خوانین نے بزور یا کسی اور طرح سے قبضہ میں لے لی تھیں، انہوں نے اپنی زمینوں کا قبضہ واپس

لینے کے لئے کوششیں شروع کردیں۔ کچھ نے عدالتوں میں درخواستیں دائر کردیں۔ گوجر جو اکثر و بیشتر مزارعین تھے اور اس خاص نسب کی وجہ سے ملکیت زمین کے حق دار نہیں تھے، انہوں نے انتظامی تبدیلی اور پاکستان پیپلز پارٹی کے نعروں سے شہ پاکر جن زمینوں پر وہ کام کرتے تھے، ان پر اپنی ملکیت کا دعویٰ کردیا بلکہ وہ لوگ جنہوں نے اپنی زمینیں بیچ دی تھیں ان میں سے بعض نے یہ کہہ کرکہ یہ ان سے ضبط کرلی گئی تھیں ان پر دوبارہ دعویٰ کردیا۔ کچھ بہت پرانے زمینی جھگڑے دوبارہ زندہ ہوگئے۔ اس تمام سے صورتِ حال بے حد گمبھیر ہوگئی اور تصادم کے نتیجہ میں جانی اور مالی نقصانات کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

اس بحرانی کیفیت سے نکلنے کے لئے شمال مغربی سرحدی صوبہ کی حکومت نے اکتوبر 1970ء میں اطلاع نامہ نمبر 66/ایس او (ایس پی ایل) ایچ ڈی/70 بتاریخ 8 اکتوبر 1970ء کے ذریعے ایک کمیشن کی تشکیل کردی جس کا کام تھا ضلع سوات میں زمینی املاک کے سلسلہ میں سر اٹھانے والے جھگڑوں کی کمیت اور کیفیت معلوم کرنا۔ خصوصاً (الف) والی اور بے دخل کئے گئے دعویدار اور (ب) زمیندار اور مزارعین' (الف) قسم کے کیسوں کی تعداد 469 تھی جب کہ (ب) قسم کے کیسوں کی تعداد 26 تھی۔ کمیشن نے اپنی رپورٹ حکومت کو پیش کردی۔ اور دستاویزی صورت میں کمیٹی کے اُن ارکان کو جن کو کمیشن کی سفارشات پر غور و خوض کے لئے اجلاس میں حاضر ہونا تھا بتایا گیا کہ

"کمیشن نے ہر دعویٰ کا فراہم کردہ ثبوتوں کی روشنی میں پوری طرح جائزہ لیا ہے۔ یہ ایک انتہائی وقت طلب کام تھا جو بہ حسن و خوبی انجام دے دیا گیا ہے۔ اس مرحلہ پر ہر سفارش کی جانچ پڑتال صوبائی یا مرکزی سطح پر کسی اور با اختیار ادارہ سے کرانا مستحسن نہیں ہوگا۔ علاوہ ازیں ایسا کوئی قدم تنازعات کی پٹاری دوبارہ کھول دے گا۔ اس لئے یہ بے حد اہم ہے کہ ہم کمیشن کی ساری سفارشات کو من و عن قبول کرنے کے لئے اپنا ذہن بنالیں۔"

اس سلسلہ میں مزید یہ تجویز کیا گیا کہ حکومت کی طرف سے قانونی فیصلہ اور اُس کے اعلان کے بعد اُس پر مکمل عمل درآمد انتہائی اہم ہوگا۔ اس لئے اس باب کو ہمیشہ کے لئے بند کرنا ہوگا اور تصفیہ شدہ تنازعات کے سلسلہ میں از سرِ نو تفتیش کی اجازت کسی صورت نہ دی جائے لیکن اس مسئلہ میں اصل مسئلہ عمل درآمد ہی کا تھا۔ اس لئے کہ 'سفارشات کی کاغذی منظوری' اس پر 'درحقیقت عمل درآمد سے بالکل مختلف چیز' تھی۔ یہ قانونی فیصلہ اور رپورٹ بے نتیجہ ہی رہی اس لئے کہ اس پر بحیثیت مجموعی عمل درآمد ہی نہ ہو سکا۔

جنگلات کی بے دریغ کٹائی

جنگلات کی منصوبہ بند ناروا کٹائی کا کام ریاستی دور ہی میں شروع ہوگیا تھا۔ والی کی طرف سے جنگلات کو

ایک سیاسی رشوت کے طور پر استعمال کیا جانے لگا تھا لیکن عام لوگوں پر والی کی جانب سے اس سلسلہ میں نئی قسم کی پابندیاں عائد تھیں ۔ادغام کے ساتھ ہی یہ پابندیاں ہٹ گئیں اور ملنے والی آزادی کا بہت بری طرح استعمال کیا گیا۔ جنگلات کو ٹھیکیداروں نے سرکاری حکام کے گٹھ جوڑ سے قتل عام کر کے تباہ کر دیا تا کہ زمین کا ممکنہ حد تک خون کر کے اپنی جیبیں بھری جاسکیں ۔اس سے علاقہ اپنے جنگلات سے محروم ہوگیا۔سوات کے اکثر وبیشتر پہاڑ ننگ دھڑنگ رہ گئے ۔ قدرتی ماحول برباد ہوگیا۔مٹی کی فرسودگی کا عمل تیز ہوگیا۔وادی کا قدرتی حسن تہ وبالا ہوگیا اور ماحول برباد ہونے سے آب وہوا میں خوفناک تبدیلیاں پیدا ہوگئیں ۔

تحریک بحالئی ریاست

پولیٹیکل ایجنٹ ہمایوں خان نے ادغام کے وقت ادغام مخالف جذبات کو وقتی طور پر ٹھنڈا کر دیا تھا لیکن سیدوشریف سے تعلق رکھنے والے ایک طالب علم محمد ابرار (المعروف ابرار چٹان) نے تحریک بحالئی ریاست کے نام سے ایک تحریک شروع کی۔وہ نعرہ بازی کرتا تھا۔پوسٹر تقسیم کرتا تھا۔ڈپٹی کمشنر سوات نے فرنٹیئر کرائمز ریگولیشن کے تحت اُس کی گرفتاری کا حکم جاری کیا۔وہ ناکام رہا۔والی صاحب کے حامی لاتعلق رہے اور یہ تحریک عوامی حمایت نہ ہونے کی وجہ سے اپنی موت آپ مرگئی۔اس بات سے اسلم آفندی کے اس دعویٰ کی توثیق ہوجاتی ہے کہ سوات کے یوسف زیوں نے پاکستان کے حق میں ووٹ دے دیا ہے۔ابرار چٹان نے بھی بعد میں اپنی اُس تحریک کو ماننے سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ یہ ریاست کی بحالی کے لئے نہیں تھی بلکہ سابقہ شاہی خاندان کو خوش کرنے کی ایک کوشش تھی۔ اس تحریک کے صرف تین بنیادی ارکان تھے (ابرار چٹان،میاں گل فروش آف قندیل اور ایک کوئی اور)اور اس کا مقصد ریاست کی بحالی نہیں بلکہ سابقہ حکمرانوں کی خوشنودی ہی تھا۔

انتظامیہ کے لئے پیچیدگیاں

ڈپٹی کمشنر سوات نے 1972ء میں اضافی پیچیدگیوں پر بحث کرتے ہوئے بتایا۔

''سوات ملیشا کا سوال ،کالام کے لوگوں کے لئے جنگلاتی لکڑی کے آمدنی میں ان کے حصہ میں اضافہ کا معاملہ،سوات پولیس،عشر کا ایک جبری نظام،موٹر خانہ اور کئی اور چیزیں بھی حتمی طور پر تصفیہ طلب ہیں۔مسائل کی موجودہ صورتِ حال مراعات یافتہ طبقہ کو بحالئی ریاست اور اس طرح کی دوسری باتیں کرنے کا موقع فراہم کرتی ہے۔''

معیارِ تعلیم کا زوال

"طلباء اور اساتذہ پر نظم وضبط کی کڑی پابندیاں ہٹنے سے معیارِ تعلیم اور تعلیمی اداروں کی مجموعی فضا ادغام کے بعد خراب ہوگئی اساتذہ طلباء کو احتجاج پر اکساتے تھے۔ جہان زیب کالج کے طلباء نے اگلی کلاسوں میں جانے کے لیے لئے جانے والے سالانہ امتحان کا بائیکاٹ کر کے بلا امتحان ترقی کا مطالبہ کر دیا۔ طلباء یونین کی جانب سے جبری بائیکاٹ کی وجہ سے فضا میں تناؤ پیدا ہوگیا۔ پرنسپل نے کالج کے ضوابط کی خلاف ورزی کرتے ہوئے تمام طلباء کو ترقیاں دے دیں۔ ان کے نمبروں کی پروا نہیں کی۔ اس طرح مستقبل میں اپنے تعلیمی ادارہ کی تعلیمی زبوں حالی کی راہ ہموار کردی۔ اس معاملہ پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈپٹی کمشنر سوات نے بتایا: 'بد معاملگی کی کیا عجب صورت ہے کہ جہاں ضلعی انتظامیہ نے طلباء کو امتحان دینے پر آمادہ کرنے کی پوری کوشش کی، وہیں تعلیمی حکام نے خود اپنے وضع کردہ قوانین و ضوابط کی پروا نہ کرتے ہوئے امتحانات کے پورے عمل کو بے معنی بنا دیا ہے۔'[1]

معاشی پہلو

معاشی نقطۂ نظر سے ریاست سوات کے حکمرانوں کا کردار قابلِ تعریف نہیں رہا۔ اسلم آفندی نے ادغام کے اعلان کے بعد کہا تھا کہ 'یہ ہماری جیت کا صرف پہلا دور ہے۔ اصل جیت تب نصیب ہوگی جب سوات کے لوگوں کو غربت سے نجات حاصل ہوگی۔' لیکن جیت کا یہ خواب صرف خواب ہی رہا۔ اس مقصد کے حصول کے لئے حکومتِ پاکستان نے کبھی کوئی سنجیدہ قسم کے اقدامات نہیں کئے۔

ادغام کا فوری نتیجہ لوگوں کے لئے زیادہ مثبت ثابت نہیں ہوا۔ سابقہ ریاستی ملازمین کے ایک حصہ کو پنشن کے فوائد کے بغیر جبری طور پر ریٹائر کر دیا گیا۔ آنے والے برسوں میں سوات کی ریاستی ملیشیا کو بھی درہم برہم کر دیا گیا۔ مسلسل ہڑتالوں اور ملیں بند ہو جانے اور تنازعات سے مصنوعی ریشمی کپڑے کی صنعت بری طرح متاثر ہوئی جس سے وہاں کام کرنے والے مزدور بے روزگار ہوگئے۔ البتہ کسانوں، مزارعین اور غریب طبقہ پر سخت پابندیاں ختم ہونے سے انہیں اپنی مرضی سے روزی کمانے کے مواقع میسر آگئے۔

عدالتی پہلو

ادغام سے پہلے فیصلے منصفانہ ہوں یا نہ ہوں لیکن بہت جلد ہو جاتے تھے۔ فریقین کو نہ تو غیر ضروری اخراجات

کرنے پڑتے تھے اور نہ ہی انہیں مقدمہ بازی میں عمر عزیز بِتانی پڑتی تھی۔ اور فیصلوں پر مناسب اور مکمل طور پر عمل درآمد کیا جاتا تھا۔ 1969ء کے ضابطہ ا کے نتیجہ میں صرف یہ تبدیلی آئی کہ حکمران کے اختیارات اور وظائف ختم کر کے ان کو صوبائی حکومت کی جانب سے بااختیار بنائے جانے والے کسی شخص، افسر یا ادارہ کو سونپ دیا گیا لیکن تمام سابقہ قوانین وضوابط جوں کے توں برقرار رہے۔

اس سے انتشار اور بے یقینی کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ اس لئے کہ باقاعدہ طور پر مرتب شدہ شکل میں قوانین و ضوابط کا ایسا کوئی مجموعہ موجود نہیں تھا۔ یہ بات انتظامی مع عدالتی افسران کے ہاتھ میں چھوڑ دی گئی تھی کہ وہ اپنی صوابدید اور عقل کے مطابق رواج[2] کی تعریف اور توجیہہ کریں۔ اس لئے 1971ء کے شروع میں ایک انجمن کی تشکیل ہوئی جس کا نام 'جسٹس لیگ' رکھا گیا۔

27 جون 1970ء کو 1925ء کے کوآپریٹو سوسائٹیز ایکٹ کو سوات تک توسیع دے دی گئی۔ 31 دسمبر 1970ء کو سپریم کورٹ آف پاکستان اور صوبائی ہائی کورٹ کا دائرہ اختیار صدارتی حکم نمبر 28 کے ذریعہ سوات تک بڑھادیا گیا۔ اُسی دن گزٹ اطلاع نامہ برائے (قبائلی علاقہ جات (اطلاق قوانین) ضابطہ قانون 1970ء کا بھی اجرا ہوا، جس سے سوات میں فوجداری عدالتیں ان قوانین کے نفاذ کے ساتھ متعارف کرائی گئیں: پولیس ایکٹ، 1861ء (1861ء کا V)، فوجداری قوانین، 1898ء (1898ء کا ایکٹ V)، تعزیرات پاکستان (1860ء کا ایکٹ XLV)، شہادت ایکٹ، 1872ء (1872ء کا I) اور فرنٹیئر کرائمنر ریگولیشن، 1901ء (1901ء کا ریگولیشن III)۔ پرانے قوانین کو صرف اس حد تک ختم کیا گیا۔

پورے ملاکنڈ ڈویژن کے لئے ایک سیشن عدالت قائم کی گئی اور 1972ء کے ریگولیشن I، مجریہ 30 مارچ 1972ء، کے ذریعہ لوکل گورنمنٹ آرڈیننس 1972ء کو سوات تک بڑھادیا گیا۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے عبوری آئین کو 15 اپریل 1972ء کو نافذ کیا گیا اور قبائلی علاقوں کی وضاحت کی گئی۔ عبوری آئین کی دفعہ 260 میں قبائلی علاقہ جات کے بارے میں بیان کیا گیا کہ (الف) (ii) 'سابقہ ریاستیں امب، چترال، دیر اور سوات؛ (ب) ''صوبائی زیر انتظام قبائلی علاقہ جات'' کا مطلب ہے (i) چترال، دیر اور سوات (جس میں کالام شامل ہے) کے اضلاع'۔ اس طرح پہلی بار صوبائی زیر انتظام قبائلی علاقہ جات (پاٹا) کی تشکیل اور مکمل وضاحت کی گئی۔ اس طرح عزی خیل والا ڈلہ (دھڑا) کی جانب سے کمشنر ملاکنڈ ڈویژن کو پیش کیا گیا ملاکنڈ ڈویژن کو پس ماندہ علاقہ قرار دینے کا مطالبہ کسی حد تک تسلیم ہوا۔

عبوری آئین کی دفعہ 261 کے تحت یہ بیان کیا گیا کہ '(1) اس آئین کے دائرہ کار یا اس آئین میں تفویض کردہ اختیار کے تحت، وفاق کا انتظامی اختیار مرکز کے زیر انتظام قبائلی علاقہ جات کو وسیع ہوگا اور صوبے کا انتظامی

اختیار صوبہ کے زیر انتظام قبائلی علاقہ جات کو۔' اس کے بعد والی ذیلی شقوں 2 سے 7 تک میں کسی قانون و آرڈی ننس وغیرہ کو قبائلی علاقہ جات تک توسیع اور سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کے دائرہ اختیار کی توسیع کے سلسلے میں درکار طریق کار کی تفصیلات بیان کی گئی تھیں۔

ان اقدامات سے عام لوگوں کی شکایات کا ازالہ اس وجہ سے نہ ہوسکا کہ اصل بڑے علاقوں میں اب بھی رواج کا غلبہ تھا۔ اس کی کوئی مرتب کردہ شکل موجود نہیں تھی بلکہ یہ اصطلاح ہی غیر واضح اور مبہم تھی۔ دیوانی اور فوجداری معاملات کی بالکل صاف حد بندی بھی نہیں تھی جس کی وجہ سے اس ابہام کو منفی مقاصد کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ مزدوروں نے مطالبہ کیا کہ 'رواج اور ایف سی آر (فرنٹیئر کرائمز ریگولیشن) کو ختم کر دیا جائے۔' اور کچھ دیگر لوگوں نے مطالبہ کیا کہ سوات میں پاکستانی قوانین کو نافذ کیا جائے۔

1973ء میں 1970ء کا صدارتی حکم نمبر 28 منسوخ کر دیا گیا۔ اور پشاور ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ آف پاکستان کے دائرہ اختیار کو 9 فروری 1973ء کو 1973ء کے ایکٹ XXVII کے تحت توسیع دی گئی۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے 1973ء کے آئین کی دفعہ 247 کی ذیلی دفعہ 7 کے مطابق:

''نہ سپریم کورٹ اور نہ ہی ہائی کورٹ آئین کے تحت اپنے دائرہ اختیار کو قبائلی علاقوں میں استعمال کرے گا۔ جب تک... (پارلیمان) کسی قانون کے ذریعہ اسے اختیار نہ دے دے۔ بہ شرطیکہ یہ دفعہ کسی صورت بھی سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کے اُس دائرہ اختیار کو متاثر نہیں کرے گا جو کہ قبائلی علاقوں کے تعلق سے اس دفعہ کے یوم آغاز سے پہلے استعمال کیا جاچکا ہے۔''

17 اپریل 1974ء کو ریگولیشن I آف 1974ء کے ذریعہ سول اور ریونیو عدالتوں کا قیام مندرجہ ذیل پانچ قوانین کی توسیع کے ذریعے لایا گیا: ثالثی ایکٹ، 1940ء (1940ء کا ایکٹ X)، شمال مغربی سرحدی صوبہ کا کرایہ داری سے متعلق ایکٹ، 1950ء (این ڈبلیو ایف پی کا 1950ء کا ایکٹ XXV)، مغربی پاکستان سول کورٹس آرڈی نینس، 1962ء (ڈبلیو پی کا 1962ء کا آرڈی نینس II)، کوڈ آف سول پروسیجرز، 1908ء (1908ء کا ایکٹ V)، مغربی پاکستان لینڈ ریونیو ایکٹ، 1967ء (ڈبلیو پی کا ایکٹ XVII آف 1967ء)۔ 1974ء کے ریگولیشن II کے ذریعہ 20 مئی 1974ء کو 53 قوانین کو سوات تک توسیع دے دی گئی۔

لیکن اصل میں بڑی تبدیلی 1975ء کے ریگولیشن I، پاٹا فوجداری قانون (خصوصی قوانین) ریگولیشن (جسے فی الفور نافذ کر دیا گیا) اور 1975ء کا ریگولیشن II، پاٹا سول پروسیجر (اسپیشل پروویژنز) ریگولیشن، 26، جولائی 1975ء، تھا جسے صرف شائع کر دیا گیا اور جس کے سیکشن 3 میں یہ کہا گیا کہ یہ اُس تاریخ سے نافذ العمل تصور ہوگا جو حکومت (صوبہ سرحد کی حکومت) سرکاری گزٹ میں اس کے لئے مقرر کر دے گی۔ 9 مارچ 1976ء کو 1975ء کے ریگولیشن II کے نفاذ کی تاریخ 25 مارچ 1976ء دی گئی۔

29 دسمبر 1976ء کو جاری کردہ ریگولیشن IV آف 1976ء کے ذریعہ 1975ء کے ریگولیشن II اور 1975ء کے ریگولیشن II میں ترامیم کردی گئیں۔ اس نئی ریگولیشن کو صوبائی زیرِ انتظام قبائلی علاقہ جات کے لئے خصوصی قوانین (ترمیمی) ریگولیشن 1976ء کا نام دیا گیا اور اس کے ذریعے فوجداری اور دیوانی مقدمات میں زیادہ تر اختیارات عدلیہ سے لے کر انتظامیہ کو دے دیئے گئے۔ انتظامیہ مقدمات کو جرگوں کے حوالے کر دیتی لیکن جرگے اس ضمن میں اس لئے زیادہ مؤثر نہیں ہوتے تھے کہ ان کے فیصلے بھی انصاف کے بجائے اکثر بیرونی دباؤ کے تحت کئے جاتے تھے۔ اس تبدیلی کا ایک دوسرا پہلو یہ تھا کہ مقدمات نمٹانے میں بہت وقت لگنے لگا جس سے لوگوں میں شدید ناراضگی پیدا ہوگئی۔ لوگوں کی شکایات کا ازالہ کرنے کی جگہ ان پاٹا ریگولیشنز (1975ء کے ریگولیشن I اور 1975ء کے ریگولیشن II کو عام طور پر پاٹا ریگولیشنز کہا جاتا ہے) کی وجہ سے حالات ابتر سے ابتر ہوتے چلے گئے۔

اسلامی جمہوریہ پاکستان کے 1973ء کے آئین کی دفعہ 175(3) کے تحت عدلیہ کا انتظامیہ سے علاحدہ کیا جانا لازمی تھا۔ جب 1985ء میں وزیرِاعظم پاکستان محمد خان جونیجو نے ایمرجنسی ختم کی تو کچھ فریقوں نے پاٹا ریگولیشنز کو پشاور ہائی کورٹ میں چیلنج کر دیا۔ پشاور ہائی کورٹ کی ڈویژن بینچ نے 24 فروری 1990ء کو انہیں اسلامی جمہوریہ پاکستان کی آئین کی دفعہ 25 کے خلاف قرار دے دیا۔ اس طرح عام طور پر جانے جانے والے پاٹا ریگولیشنز غیر مؤثر ہوگئے۔

صوبہ سرحد کی حکومت نے اس فیصلہ کے خلاف سپریم کورٹ میں درخواستیں دائر کیں۔ جنھیں 12 فروری 1994ء کو 'مع حکم ادائیگی اخراجات خارج' کر دیا گیا۔

لازماً موجود عدالتی کارروائیوں، غیر ضروری تاخیر، ناقابل برداشت اخراجات، رشوتوں، رواج کا غلط استعمال اور پاٹا قوانین کے تحت حالات کو مزید ابتری نے سوات کے لوگوں کو پہلے ہی بے حد برافروختہ کر دیا تھا۔ انتظامی حلقے سپریم کورٹ کے فیصلے کو اپنے لامحدود اختیارات کے خلاف ایک ضرب سمجھ کرتاؤ میں آگئے۔ وہ اپنے ان اختیارات کو بچانا چاہتے تھے۔ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ شریعت کو صرف ملاکنڈ ڈویژن میں نافذ نہیں کیا جاسکتا۔ حکومت مجبوراً یا تو پاٹا قوانین دوبارہ نافذ کرے گی یا اسی قسم کے دیگر قوانین کو نافذ کیا جائے گا۔ جس میں انہیں بے پایاں اختیارات حاصل ہوں گے۔ اسی امید پر انہوں نے تحریک نفاذ شریعت محمدی (ٹی این ایس ایم)[3] کو اپنی کارروائیوں کے لئے کھلی چھوٹ دی۔ دراصل وہ اس کی خاموش تائید کر رہے تھے۔ سوات میں ٹی این ایس ایم کو ملنے والے انتہائی عروج اور شریعت کے نفاذ کے مطالبہ کی گھن گرج کے پیچھے ان تدابیر کا ہاتھ رہا ہے۔

جون 1971ء میں دانی گل نے کہا تھا کہ سوات کے تمام مسائل کا حل اسلامی شریعت کے نفاذ میں ممکن

ہے۔ یہ یہاں کے لوگوں کے مزاج کے بالکل مطابق ہے۔ سوات کے مسائل کے حل کی اس کلید کا پہلا خیال سراج الدین خان نے 1949ء میں پیش کیا تھا جب انہوں نے سوات کے حکمران سے شریعت نافذ کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔ اس لئے نفاذِ شریعت کے مطالبہ میں پہل کرنے کا اعزاز اگر کسی کو دیا جا سکتا ہے تو وہ سراج الدین خان اور درانی گل ہیں جنہوں نے صوفی محمد سے بہت پہلے یہ مطالبہ پیش کیا تھا۔ تاہم تینوں کے نقطۂ نظر میں ایک فرق ضرور ہے۔ پہلے دونوں کی تجاویز کا دائرہ کار ریاست سوات کے علاقوں تک محدود تھا جب کہ تیسرے کی تحریک کا پھیلاؤ پورے ملاکنڈ ڈویژن اور ضلع کوہستان تک ہے۔

نوٹس

1. 'ضلع سوات کی پندرہ روزہ سیاسی روداد، جون 1972ء کا پہلا حصہ' فائلز آف گورنر سیکریٹیریٹ، شمال مغربی سرحدی صوبہ، صوبائی ارکائیوز، پشاور، بنڈل نمبر 10، سیریل نمبر 84۔ سوات میں طلبہ کے بائیکاٹ اور احتجاج کی تفصیلات اس میں جا بجا موجود ہیں۔ اُس وقت کالج میں طلبہ کے لیڈر علی حیدر تاہم اس بائیکاٹ اور فری پروموشن کو جائز قرار دینے کی اپنی سی سعی کرتے ہیں۔ علی حیدر، بالمشافہ گفت گو، ریکارڈ شدہ، بنکورہ، سوات، 5 ستمبر 2000ء۔
2. رواج کا مطلب یوں تو رسم، فیشن، عام قاعدہ، اور چلن ہے۔ یہاں اس سے مراد رسوم، روایات، استعمال اور رسمی قوانین کے ساتھ ساتھ ریاستِ سوات کے حکام کے فیصلے اور احکام بھی ہیں۔
3. 'تحریک نفاذ شریعت محمدی' کا مطلب اسلامی قوانین کے نفاذ کی تحریک ہے۔

اس تحریک کا قیام جون 1989ء میں میدان، ضلع دیر، میں عمل آیا۔ اور صوفی محمد کو اس کا سربراہ نامزد کیا گیا۔ اِسے مرحلہ وار ملاکنڈ ڈویژن کے دیگر حصوں تک پھیلا دیا گیا۔ اس کا مقصد پاکستانی حکام کو مجبور کر کے ملاکنڈ ڈویژن میں شریعت کا نفاذ تھا۔ جب مئی 1994ء میں اس نے ملاکنڈ درہ سے گزرنے والی مشہور شاہراہ کو ایک ہفتہ کے لئے بند کر دیا تو اسے بہت شہرت ملی اور عالمی ابلاغ عامہ نے اسے بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔ آخر میں اس نے نومبر 1994ء میں تین دن تک سوات میں حکومت کی مشینری کو بالکل مفلوج کر دیا۔ اگر چہ اس تحریک کا آغاز دیر میں ہوا لیکن اسے قوت سوات میں ملی۔ اسی کے نتیجہ میں یہاں سرکشی ہوئی۔ حالاں کہ اب اس تحریک پر پابندی ہے اور اس کے سربراہ جیل میں ہیں لیکن خاصے لوگ اب بھی اس سے متاثر ہیں اور اس کی سرگرمیاں کسی نہ کسی صورت جاری ہیں۔ (2005ء کی بات ہے)۔

اختتامیہ

ارضی حکمت عملی کے لحاظ سے انتہائی اہم علاقہ میں واقع تاریخی وادئ سوات ایک عظیم تہذیب کا گہوارہ رہا ہے۔ یہاں جابجا موجود آثار قدیمہ کی دولت اسی بات پر شاہد ہے کہ یہاں کے باشندوں کی زندگیاں بار آور مصروفیات میں گذری ہیں۔ اپنی معلوم تاریخ کے زیادہ تر عرصہ میں سوات نے اپنی جداگانہ حیثیت کو برقرار رکھا ہے۔ اچھے جغرافیائی محل وقوع اور ایک مہربان دست قدرت نے اسے اردگرد کے علاقوں کے مقابلہ میں زیادہ ترقی یافتہ تہذیب کی آماجگاہ بنائے رکھا ہے۔ اس کا حال اور ماضی دونوں اس بات کے گواہ ہیں۔ یوسف زئی قبائل کے اس پر قبضہ کے بعد سے یہ علاقہ غیر ملکی یا نوآبادیاتی استعمار کے چنگل سے ہمیشہ آزاد رہا ہے۔ یہاں کے پختونوں نے اپنی آزاد حیثیت کو برقرار رکھا ہے۔

جب 1849ء میں برطانوی حکومت نے پشاور اور انڈیا کے شمال مغربی سرحد کے میدانی علاقوں پر قبضہ کرلیا تو اپنی آزادی کو برقرار رکھنے کے بارے میں فکرمند سواتیوں نے اپنی ایک ریاست بنا کر اُس کا ایک بادشاہ مقرر کردیا۔ 1857ء میں اس بادشاہ کی موت کے بعد یہ ریاست تو قائم نہ رہ سکی لیکن 19 ویں صدی کے دوسرے نصف حصہ میں سواتی برطانوی استعمار کے لئے دردِسر بنے رہے۔ انہوں نے پہلے تو اسے 1863ء میں امبیلہ کی جنگ میں چیلنج کیا۔ پھر 1895ء اور 1897ء کی ملاکنڈ جنگوں میں اس عظیم طاقت کو پریشان کئے رکھا۔ زیریں سوات کو تو برطانوی حکومت نے پشاور چترال گذرگاہ کو محفوظ بنانے کی خاطر ایک ڈھیلے ڈھالے نظام کے تحت اپنے زیرنگیں رکھا تاکہ زیریں سوات اور دیر میں سے گذر تا رسد کا راستہ کھلا رہے لیکن انہوں نے نہ تو زیریں سوات کے داخلی امور میں مداخلت کی اور نہ ہی سوات بالا کی طرف کسی توسیع کی کوشش کی۔

داخلی ہم آہنگی کی کمی، گروہی سیاست اور سواتی علاقوں پر قبضہ کے لئے دیر اور سوات کے مابین ایک طویل جنگی کش مکش نے سوات بالا کے قبائل کے کچھ حصہ میں ایک قسم کی بے یقینی پیدا کی۔ اس لئے انہوں نے کئی بار

برطانوی حکومت سے استدعا کی کہ وہ ان کے علاقے کو بھی زیریں سوات کی طرح ایک حفاظتی چھتری کے نیچے لے لے۔انہوں نے اپنی یہ پیش کش کئی افراد تک پہنچائی۔ برطانوی حکومت نے ضبط کی پالیسی اپنائے رکھی لیکن اس کے ساتھ ہی 1914ء میں سوات میں حکومت بننے کی راہ میں روڑے اٹکائے اور عبدالجبار شاہ کو متنبہ کیا کہ وہ سوات کی طرف نہ بڑھے۔

دیر کی غارت گری سے بچنے، اپنی مشکلات پر قابو پانے اور اپنے مفادات کی حفاظت کے لئے دریائے سوات کے دائیں جانب مقیم سوات بالا کے قبائل، شامیزئ، سیبوجنی اور نیک پی خیل سنڈاکئی بابا کی زیرِ سرپرستی 1915ء کے شروع میں متحد ہوئے اور کامیابی نے ان کے قدم چومے۔اپنی پوزیشن کو مزید مستحکم کرنے کے لئے دوبارانہوں نے میاں گل عبدالودود کو تخت نشین ہونے کے لئے کہا لیکن وہ ہچکچاہٹ کا شکار رہے۔انہوں نے دوبارہ عبدالجبار شاہ سے رجوع کیا۔اور ستھانہ سے اُسے لاکر سوات کا بادشاہ بنادیا۔اُس نے دوسال تک حکومت کی لیکن کئی عناصر نے مل کر اُسے اپنی حکومت مستحکم کرنے کا موقع نہیں دیا۔ستمبر 1917ء کو جرگہ نے اُسے تخت سے ہٹادیا۔اُس کی جگہ جرگہ نے میاں گل عبدالودود کو سوات کا نیا بادشاہ بنادیا۔

ریاست سوات کو مستحکم بنیادوں پر قائم کرنے کا سہرا کرشمہ ساز قائد[1] میاں گل عبدالودود کے سر بندھتا ہے۔ تاہم یہ کام انہوں نے سیاسی قیادت[2] کے ایک مضبوط گروہ کے تعاون اور'دریادلی اور حسد'[3] کی مدد سے کیا۔تاہم عبدالودود کی لیاقت اور بہت ہی کارگر اقدامات نے استحکام کے اس عمل اور ریاست کی توسیع میں انتہائی اہم کردار ادا کیا۔یہ مقصد اندرونی و بیرونی رکاوٹوں، نامساعد حالات، رقابتوں اور سازشوں کے باوجود انتہائی ماہرانہ انداز سے حاصل کیا گیا۔

انگریزوں سے عبدالجبار شاہ کی وفاداری گو بہت گہری تھی لیکن ریاست سے اُس کے عہد میں برطانوی حکومت سے تعلقات زیادہ دوستانہ نہیں تھے۔اس کی وجہ ریاست میں سنڈاکئی بابا کی موجودگی اور اثر ورسوخ تھا۔جب کہ عبدالودود کے عہد حکومت میں تعلقات بہت دوستانہ تھے۔اُس کی انگریزوں کے متعلق پالیسی اس کے دادا سیدو بابا کی طرح مفاہمت اور اطاعت پر استوار تھی۔سوات اور دیر کے درمیان تعلقات عبدالجبار شاہ کے عہد میں تناؤ کا شکار تھے۔اکثر و بیشتر جنگ وجدل کا بازار گرم رہتا تھا۔عبدالودود کے عہد میں بھی دونوں ریاستوں کے درمیان تعلقات اسی ڈھنگ پر چلتے رہے۔بالآخر برطانوی حکومت نے مداخلت کرکے 1922ء میں دونوں میں شرائط طے کردیں۔ بہ ہرحال دونوں میں تناؤ کی کیفیت برقرار رہی۔دونوں ریاستوں کے حکمران ایک دوسرے کے علاقوں پر للچائی نظریں گاڑے رہے اور ایک دوسرے کے اندرونی اور بیرونی دشمنوں سے پینگیں بڑھاتے رہے اور ایک دوسرے کے خلاف کھلم کھلا سازشوں کے ذریعے اپنی بدنیتی کا اظہار کرتے رہے۔

جہاں تک ریاست امب سے تعلقات کا تعلق ہے تو مشترک سرحد نہ ہونے کی وجہ سے عداوت اور رقابت کی کوئی فوری وجہ نہیں تھی لیکن تعلقات اُس وقت کشیدہ ہو گئے جب عبدالجبار شاہ تاج وتخت چھن جانے کے بعد دوبارہ اُسے حاصل کرنا چاہتا تھا اور جب بونیر پر قبضہ کے لئے امب اور سوات کے درمیان کش مکش جاری تھی۔ نواب دیر کی جانب سے امب اور عبدالجبار شاہ کے ساتھ سوات مخالف محاذ بنانے کے لئے کی گئی خط وکتابت اور پھر عبدالجبار شاہ اور نواب امب کا سوات کے خلاف گٹھ جوڑ مزید عداوت کی آگ بھڑکانے کا سبب بنے۔ بات جنگ تک پہنچی اور تعلقات کشیدہ ہو گئے۔ کامیابی سوات کے حکمران کو ملی۔ یہاں بھی برطانوی حکومت نے مداخلت کر کے دونوں ریاستوں کے درمیان سرحد کی حد بندی کر دی اور دونوں پر پابندیاں عائد کر کے انہیں مستقبل میں جنگ وجدل کا بازار گرم کرنے سے روکا لیکن دونوں ریاستوں کے درمیان تعلقات کبھی بھی دوستانہ نہیں رہے۔

جب برطانوی ہند کا بٹوارا ہوا اور دو نئے ملک معرض وجود میں آگئے تو سواتی حکمران نے پہلے حکومت پاکستان کے ساتھ سٹینڈ اسٹل ایگریمنٹ کیا اور پھر 3 نومبر 1947ء کو پاکستان کے ساتھ شامل ہونے کی منظوری دی۔ اس بات کو 24 نومبر 1947ء کو گورنر جنرل آف پاکستان نے باقاعدگی کے ساتھ منظور کر لیا۔ انہوں نے تحریک پاکستان کے دوران مسلم لیگ کے ساتھ تعاون کیا۔ سواتی حکمران دل کی گہرائیوں کے ساتھ اس نئی مملکت کے وفادار تھے اور اس نئے ملک کی اخلاقی اور مالی امداد کرتے رہے۔

کالام پر قبضہ کا معاملہ دونوں کے درمیان وجہ نزاع بنا رہا لیکن اسے بھی 1954ء میں دوستانہ انداز سے حل کر لیا گیا۔ کالام اور جوڑاس (دارل اور تانگیر کی سرحد پر) جیسے تنازعات کے باوجود پاکستان کی مرکزی حکومت اور ریاست سوات کے درمیان تعلقات 15 اگست 1947ء سے لے کر مارچ 1969ء میں ایوب کے اقتدار سے دست برداری تک بے حد خوش گوار اور دوستانہ رہے۔

ریاست سوات کے انتظامی ڈھانچہ کا معمار اوّل تو عبدالجبار شاہ تھا لیکن اسے اُس کی فراہم کردہ بنیادوں پر استحکام کے عروج تک میاں گل عبدالودود اور میاں گل جہان زیب نے پہنچایا۔ اس میں ان دونوں کی طرف سے متعارف کرائی جانے والی ترامیم واصلاحات نے اس نیم پختہ ڈھانچہ کو انتظام وانصرام کا جیتا جاگتا نمونہ بنا دیا۔

انتظامیہ میں تقرر، ترقی اور ملازمت سے برخواستگی کا تمام تر اختیار حکمران کے پاس ہوتا تھا۔ عبدالودود کے عہدِ حکومت کا آخری دور اور میاں گل جہان زیب کا پورا دورِ حکومت مکمل مطلق العنانیت پر مبنی تھا۔ تاہم دونوں ہی مستعد اور محنتی تھے اور مجموعی طور پر حکومت پر ان کی گرفت مضبوط تھی۔ دونوں کا انداز حکمرانی رفاہی تھا۔ وہ ذاتی طور پر امور مملکت اور انتظامیہ کی کڑی نگرانی کرتے تھے اور تعطیلات کے علاوہ روزانہ کی بنیاد پر عدالت لگاتے تھے۔ چھوٹے بڑے معاملات سے خود کو آگاہ رکھتے تھے۔ بااثر اور بے اثر دونوں قسم کے لوگ اُن سے مل سکتے تھے لیکن حفظِ مراتب کا

بالخصوص جہان زیب کے زمانہ میں بہت خیال رکھا جاتا تھا۔

انتظامی ڈھانچہ اوپر سے نیچے تک انتہائی مستعدی، عجلت اور مؤثر انداز میں کام کرتا تھا۔ اس طرح کی دیگر ریاستوں میں اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ جہان زیب کے عہدِ حکومت میں براہِ راست تحصیل داروں، حاکموں، مشیروں اور وزیروں کی تقرریاں نہیں کی جاتی تھیں بلکہ حکمران کے سیکرٹریٹ میں کام کرنے والے کلرکوں کو مرحلہ وار ان مناصب پر تعینات کیا جاتا تھا۔ بعض صورتوں میں تیز رفتاری سے ترقیاں دی جاتی تھیں۔

عبدالودود نے مقامی روایات و خواہشات کی بنیاد پر قانون سازی کا جو طریقہ اختیار کیا اور اسی طرح انتظامی مشینری چلانے کے لئے مقامی افراد سے جو کام لیا گیا یہ طریقہ بہت ہی کارگر رہا۔ معاصر برطانوی رپورٹوں میں بھی ریاست سوات میں متعارف کرائے گئے قوانین و ضوابط اور تعزیرات اور ان پر عمل درآمد کو کامیاب اور انتہائی مؤثر قرار دیا گیا ہے۔

ایک باقاعدہ مؤثر محکمہ جاسوسی نہ ہونے کی وجہ سے خصوصاً جہان زیب کے دورِ حکومت میں بہت سے انتہائی غیر دانشمندانہ اقدامات کئے گئے جن کی وجہ خاص مقاصد رکھنے والے لوگوں کی فراہم کردہ غلط معلومات تھیں۔ اس خامی کی وجہ سے والی مخالف اور آمریت مخالف تحریک میں شامل بہت سے اپنے قریبی لوگوں کے بارے میں اُسے کچھ اندازہ نہ ہوسکا۔

مجرم کو حوالہ کرنے یا اُس کی نشان دہی کرنے کی اُس کے پورے علاقہ کی اجتماعی ذمہ داری کے طریق کار نے مجرموں کا صفایا کرنے میں حیرت انگیز کمالات دکھائے۔ مجرم حوالگی یا اُس کی نشان دہی میں ناکامی کی صورت میں پورے علاقہ کو جرمانہ بھگتنا پڑتا تھا۔ یہ امر بھی دل چسپی سے خالی نہیں کہ عبدالودود کی حکمرانی کے ابتدائی دور میں چوروں کو دیکھتے ہی گولی ماردی جاتی تھی۔

شہری انتظامیہ کی طرح ریاست کی فوجی تنظیم بھی اپنی امتیازی خصوصیات کی حامل تھی۔ اس کا مالی نظام بھی عبدالودود اور جہان زیب دونوں کے دورِ حکومت میں اپنا ہی ایک ضابطہ کار رکھتا تھا۔ حکمران ہی دراصل خزانہ کا مالک و نگران ہوتا تھا۔ حکمران کی اجازت اور دستخط کے بغیر وزیرِ مال اور مشیرِ مال تک ایک روپیہ بھی خزانہ سے نہیں نکال سکتے تھے جب کہ حکمران خزانہ سے جتنی رقم چاہتا نکال سکتا تھا۔ اس کا کوئی محاسبہ بھی نہیں ہوتا تھا۔ سرکاری اور نجی آمدنی اور حکمران کے منافع کو خصوصاً عبدالودود کے دور میں ایک ہی تصور کیا جاتا تھا اور اسے اسی طرح خرچ کیا جاتا تھا۔ بھاری بھرکم محصولات وصول کی جاتی تھیں۔

عدالتی نظام اسلامی نہیں تھا جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ یہ روایتی ضابطوں، اسلامی طرزِ عمل جو کہ روایتی طور طریق کے مطابق ہو، فرامین، احکامات اور حکمران کے منہ سے نکلا ہوا کوئی لفظ ان سب کا ایک ملغوبہ تھا۔ حتمی اختیار

اور فیصلہ حکمران کا ہوتا تھا اور روایتی ضوابط کی ثانوی حیثیت تھی جب کہ اسلامی قانون ان دونوں کے تابع تھا۔ عملاً حکمران روایتی ضوابط اور شریعت دونوں کے مطابق فیصلہ کرنے کا پابند نہیں تھا۔ تاہم یہ نظام انتہائی موثر تھا۔ مقدمات کے فیصلوں میں نہ تو زیادہ وقت صرف ہوتا تھا اور نہ ہی اس پر پیسہ خرچ کرنا پڑتا تھا اور فیصلوں پر صحیح انداز سے عمل درآمد ہوتا تھا۔ مقدمہ کا فیصلہ یا تو پہلی ہی ساعت میں ہو جاتا تھا یا زیادہ سے زیادہ بات دوسری ساعت تک جاتی تھی۔

دیگر پڑوسی ریاستوں کے رجعت پسندانہ رویوں اور انتہائی بری کارکردگی کے مقابلہ میں ریاست سوات میں تعلیمی میدان میں پیش قدمی بہت ہی قابل تعریف اور نمایاں رہی ہے۔ ریاست کے دور آخر میں تعلیم بالعموم مفت تھی۔ مستحق طلباء کو کتابیں اور یونی فارم ریاست کی جانب سے فراہم کی جاتی تھی۔ تاہم تعلیم نہ تو پوری آبادی کو مفت فراہم کی جاتی تھی اور نہ ہی تعلیم کا حصول سب کے لئے لازمی تھا جیسا کہ بعض پروپیگنڈہ نگاروں کا کہنا ہے۔ جس وقت تعلیم کو بڑی حد تک مفت کیا گیا تو اُس وقت تعلیمی اداروں کی تعداد اتنی نہیں تھی کہ پوری آبادی کے لئے کافی ہوتی۔ ریاست کے دور دراز علاقوں میں تعلیمی ادارے کافی تعداد میں موجود نہیں تھے۔ اسکولوں کی زمین اور کھیل کے میدانوں کے لئے زمین علاقے کے لوگ دیتے تھے۔ تعمیر کا کام ریاستی ملیشیا اور علاقہ کے لوگ کیا کرتے تھے۔ البتہ ریاست کے آخری دور میں تعمیراتی کام ٹھیکیدار کرتے تھے اور ریاست انہیں اس کام کے لئے پیسہ دیتی تھی۔ عموی انداز مائل بہ پیش قدمی تھا۔ سوات میں جدید تعلیم کے فروغ کے لئے پہلے برطانوی اور بعد میں پاکستان کی مرکزی اور صوبائی حکومتوں کی جانب سے بھی خاطر خواہ امداد فراہم کی جاتی رہی ہے۔

ریاست سوات کو دنیا میں یہ بھی ایک امتیاز حاصل تھا کہ یہاں کی سرکاری زبان پشتو تھی۔ علاوہ ازیں اس زبان میں تالیف اور دیگر زبانوں سے پشتو میں ترجمہ نگاری کے کام نے اس زبان کی ترویج اور ادب کو بڑھاوا دینے میں اہم کردار ادا کیا۔

چار ہزار مربع میل پر پھیلی ہوئی ریاست کے لئے جس کا ایک بڑا حصہ دشوار گذار اور پہاڑی علاقہ پر مشتمل تھا، علاج معالجہ کی سہولیات ناکافی تھیں لیکن دیگر ریاستوں بلکہ خود پاکستان کے زیر انتظام اضلاع کے مقابلہ میں بھی یہاں صحت کی سہولیات قابل تعریف حد تک بہتر تھیں۔ مریضوں کو دوائیں مفت فراہم کی جاتی تھیں چاہے وہ اسپتال میں داخل ہوں یا روزانہ کی بنیاد پر آنے والے مریض ہوں۔

قبل از ریاست دور میں زیادہ تر لوگ مذہبی نہیں بلکہ توہم پرست تھے۔ اور اصل مذہب جس کے وہ پیروکار تھے وہ پختو یا پختون ولی، یعنی پختون ضابطۂ اخلاق تھا۔ جدید تعلیم کے فروغ، بیرونی دنیا سے رابطوں اور ایک مؤثر نظام مواصلات کی وجہ سے لوگوں کے طرز فکر اور طرز بود و باش میں نمایاں فرق آ گیا لیکن ریاست نے جدید تعلیم کے مقابلہ میں مذہبی تعلیم کے فروغ کے لئے کچھ زیادہ مساعی نہیں کیں۔

سوات میں ایک زمانہ سے رائج ویش (تقسیم) کا نظام جدید دور کے معاشی، سیاسی اور سماجی تقاضوں کا ساتھ دینے میں ناکام رہا۔ عبدالودود کی جانب سے مستقل بنیاد پر بندوبست اراضی نے سوات کو اقتصادی اور سماجی پیش قدمی کی نئی راہ پر ڈال دیا۔ مستقل بندوبست اراضی کے نتائج کو کسی طور گھٹایا نہیں جاسکتا۔

مواصلات کے سلسلہ میں حاصل ہونے والی کامیابیاں شاندار رہی ہیں۔ اس سے ریاست اور حکمرانوں کو وہاں اپنی پوزیشن مستحکم کرنے کے مواقع میسر آئے۔ اس سے تجارتی سرگرمیوں میں تیزی آئی۔ بیرونی دنیا سے ریاست کا رابطہ بڑھا اور ریاست کے دور دراز علاقوں کا ریاست کے ترقی یافتہ علاقوں سے تعلق استوار ہوا۔

ریاست عموماً ترقیاتی کاموں کے لئے اپنے وسائل پر انحصار کرتی تھی۔ صرف فضاگٹ کے قریب کی سڑک اور بونیر کے لئے سڑک کی تعمیر کے لئے برطانوی حکومت کی جانب سے اُسے خصوصی امداد ملی۔ بونیر کی سڑک کڑاکڑ درہ میں سے نکالی گئی لیکن زیادہ تر سڑکوں اور پلوں کی تعمیر عام لوگوں سے جبری مشقت کے ذریعے اور ریاستی ملیشیا سے کرائی جاتی تھی۔ زمین لوگوں سے مفت لی جاتی تھی۔ صرف کوہستان میں سڑکوں کے لئے لی گئی زمین کی قیمت ادا کی گئی۔ یہ ایک افسوس ناک اَمر ہے کہ ترقیاتی کاموں جیسے سڑکوں، اسکولوں، اسپتالوں اور پلوں کی تعمیر میں عام لوگوں نے جتنا بڑا حصہ لیا اُسے بالعموم آج تک نظرانداز کیا گیا ہے۔

اقتصادی میدان کی ترقی اور صنعتی شعبہ کے فروغ میں حکمرانوں کی کارکردگی بالعموم اتنی قابل تعریف نہیں رہی۔

ریاست سوات جن علاقوں پر مشتمل تھا وہاں سماجی تغیر اور کچھ نئی اصلاحات متعارف کرائے جانے سے سماجی تنظیم میں بڑی تبدیلی آئی۔ اس عمل میں اہم کردار روایتی ڈلہ (دھڑا) نظام کو کمزور کرنے کی کوشش، حجرہ اور جرگہ کی اہمیت کم پڑ جانے، روایتی قیادت کے اختیارات اور طاقت کو لگام دینے اور نئی قیادت کی سرپرستی نے ادا کیا۔

لوگوں سے جدید برطانوی قسم کے ہتھیار اکٹھے کرکے انہیں غیر مسلح کرنے کو یقیناً ایک بہت بڑا کارنامہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس کو برطانوی حکومت نے عبدالودود کی زندگی کا نمایاں ترین کام قرار دیا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ لوگ بالکل ہی غیر مسلح ہو گئے تھے۔ وہ اب بھی سرکاری لائسنس کے تحت اسلحہ رکھ سکتے تھے جس کے لئے انہیں حکومت کو سالانہ خاص فیس دینی پڑتی تھی۔ درحقیقت یہ کارروائی اسلحہ ختم کرنے کی جگہ اسلحہ کو ایک نظام کے تحت لاکر اُسے باقاعدہ بنانا تھا۔ اس سے غیر لائسنس یافتہ اسلحہ تو ختم ہوگیا لیکن یہ اقرباء پروری اور حمایت حاصل کرنے کا ایک بڑا ذریعہ بن گیا۔ وفادار تو جتنا چاہتے اسلحہ لائسنس کی آڑ میں رکھ سکتے تھے جب کہ غیر وفاداروں کو ان کے اسلحہ سے محروم کردیا گیا۔ اس وقت کے مخصوص مزاج اور قبائلی سواتی معاشرہ میں اس اقدام کے سماجی و سیاسی اثرات کو یقیناً کم نہیں کیا جاسکتا۔

خان اور ملک کی طاقت کو مکمل طور پر توڑا نہیں گیا۔ بعض کو مضبوط کر کے ان کی وفاداری سے ریاست کے اختیار واقتدار کو برقرار رکھنے کا کام لیا گیا۔ حالاں کہ وہ بالکل غیر اہم تو نہیں ہوئے لیکن اُن کی حیثیت میں ایک بنیادی نوعیت کی تبدیلی ضرور لائی گئی۔

مغربیت اور سیکولر طرز زندگی کی میاں گل عبدالودود اور میاں گل جہان زیب دونوں نے حمایت جاری رکھی۔ خصوصاً جہان زیب اس سلسلہ میں اپنے باپ پر بازی لے گیا۔ اس معاملہ میں بھی ریاست سوات اپنی پڑوسی ریاستوں سے بہت آگے نکل گئی۔

میاں گل عبدالودود اور میاں گل جہان زیب دونوں کے عہد حکومت میں امن وامان کی صورت حال مثالی تھی۔ اُن لوگوں کے علاوہ جنہوں نے کسی وجہ سے حکمرانوں کو ناراض کر دیا ہو باقی سب لوگ عدم تحفظ کے احساس سے ناواقف تھے اور پرامن زندگی گذار رہے تھے۔ تاہم قوانین وضوابط لاگو کرنے کے سلسلہ میں صوابدید، اور امتیازی سلوک کا استعمال عام سی بات تھی۔ حکمران، ان کے اہل خاندان اور رشتہ دار قانون سے بالاتر سمجھے جاتے تھے۔

ریاست سوات نے وجود میں آنے والی نئی مملکت پاکستان سے بھی انہی خطوط پر تعلقات قائم کیئے جن پر اُس نے پہلے برطانوی ہند کی حکومت سے استوار کیئے تھے۔ پاکستانی حکام نے ان ریاستوں کے بارے میں اپنے قبل از تقسیم موقف کو تبدیل کر ڈالا تھا۔ ضمنی ضابطۂ الحاق پر دستخط کرنے کے بعد دیگر ریاستوں کی طرح ریاست سوات کی پوزیشن بھی نازک ہو گئی تھی۔ تین سرحدی ریاستوں کے علاوہ دیگر تمام ریاستوں کو پاکستان میں مدغم کر دیا گیا۔ ان تین ریاستوں کو پاکستانی آئین میں خاص علاقہ کی حیثیت دے کر برقرار رکھا گیا لیکن مرکزی حکومت کسی بھی وقت ان کے ادغام کی مشروط مجاز تھی۔

ضمنی ضابطۂ الحاق پر دستخط کرنے کے بعد سے ریاست سوات کے سر پر بھی ادغام کی تلوار مسلسل لٹک رہی تھی۔ یہ ہر صورت بدلتے منظر نامے اور حقیقتوں کا احساس واعتراف کر کے آئینی اصلاحات، نمائندہ اور ذمہ دار حکومت متعارف کرا کے اور سیاسی آزادیاں دے کر اس ہونی کو کچھ عرصہ کے لئے ضرور ٹالا جا سکتا تھا۔ حکمران اور مطلق العنان طرز حکومت کے لامحدود اختیارات میں کمی لانا ناگزیر تھا۔ میاں گل جہان زیب نے وقت اور لوگوں کے بدلے مزاج کے مطابق خود کو بدلنے سے انکار کیا جس نے آمریت مخالف اور والی مخالف عناصر کے لئے صرف ایک بنیاد ہی فراہم نہیں کی بلکہ ناراضگی کی ہواؤں کو اتنا تیز کر دیا کہ ریاست کا وجود برقرار رکھنے والے عناصر مغلوب ہو گئے۔ والی کی ہٹ دھرمی اور ضد صورت حال کو بدترین انجام کی طرف لے گئی۔ اس سے پاکستان کے حکمران حلقہ میں شامل مخصوص مفادات والے گروہ کو انتہائی اقدام کرنے کے لئے راستہ ہموار ہو گیا۔ جس سے صرف یہ ریاست ہی ختم نہیں ہوئی بلکہ سوات کی صدیوں سے قائم علاحدہ امتیازی حیثیت بھی ختم ہو گئی۔

کچھ اندرونی اور بیرونی عوامل کے پیشِ نظر 1950ء کے عشرہ میں دیر، چترال اور سوات کو دیگر ریاستوں کے ہم راہ پاکستان میں مدغم نہیں کیا گیا تاہم چترال اور دیر کے حکمرانوں سے ان کے اختیارات تقریباً پہلے ہی پاکستانی حکام نے لے لئے تھے۔ صرف والئی سوات ہی کے پاس ادغام کے وقت تک مکمل اختیارات تھے۔

بڑے پیمانے پر آمریت مخالف اور والی مخالف احتجاج کہیں نہیں ہوا۔ اس احتجاج میں اگر چہ آبادی کے ایک چھوٹے سے حصّہ نے حصّہ لیا لیکن ان کی پروپیگنڈہ مہم اور موثر کردار کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس تاثیر کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ حکومتِ پاکستان نے ادغام کے اعلان کے بعد افغان ترجمان کے اعتراضات کے جواب میں ادغام کے حق میں کسی آئینی یا قانونی شق کا حوالہ دینے کے بہ جائے صرف یہ کہنا کافی سمجھا کہ یہ قدم لوگوں کے اُس مطالبہ پر اٹھایا گیا ہے جس کا وہ 'ایک عرصہ سے مختلف طریقوں سے اظہار کر رہے تھے۔'

والی مخالف اور آمریت مخالف تحریک میں شامل لوگوں کے مقاصد اور انداز میں یک رنگی نہیں تھی۔ تاہم ان کی اکثریت ریاست کے خلاف نہیں تھی۔ اُن کا اصل مقصد ایسی اصلاحات کا نفاذ تھا جن کے تحت ایک آئینی حکومت کی تشکیل ہو اور ایک مؤثر طاقت ور مشاورتی کونسل کا قیام عمل میں لایا جائے۔ چاہے برطانیہ کے طرز پر اُس کا آئینی براہ والی خود ہو۔ ان کی اکثریت ریاست کے ملازمین کی تھی جو خفیہ طور پر اس زیرِ زمین تحریک کا حصہ تھے۔ وہ ادغام ، بعد بھی ملازمت کرتے رہے اور کبھی کھل کر سامنے نہیں آئے۔ اس لئے آمرانہ طرزِ حکومت کے خلاف تحریک بانے کا سہرا ان کے سروں پر سجا جو ابتداً میں میاں گل عبدالودود اور میاں گل جہان زیب کے وفادار رہے لیکن بعد میں کہیں جا کر اس سے غیر مطمئن ہوئے اور اُن کے سروں پر بھی جو ریاستی ملازمت کا کبھی حصہ نہ بنے تھے۔

6 اگست 1969ء کو افغان حکومت کے ترجمان کے بیان کا جواب دیتے ہوئے حکومتِ پاکستان نے اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ادغام سے 'ترقی کی رفتار تیز ہو جائے گی۔' صدر یحییٰ خان نے بھی وعدہ کیا کہ موجودہ سہولتوں اور مراعات کو نہیں چھیڑا جائے گا اور سابقہ حکمرانوں نے لوگوں کو جن حقوق سے محروم رکھا تھا، وہ انہیں دی جائیں گی۔ تاہم جب یہ سب کچھ نہیں ہوا تو لوگوں کی وہ امیدیں اور توقعات دم توڑ گئیں جو انہوں نے ادغام سے وابستہ کر رکھی تھیں۔

ادغام سے بہت بڑی تبدیلی تو یہ آئی کہ آمرانہ طرزِ حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور سیاسی آزادی آئی اور پہلے کے مقابلہ میں لوگوں کو زیادہ مساوی مواقع سے استفادہ کرنے کی اجازت ملی۔ قانون کے مطابق ملازمتوں کو تحفظ نصیب ہوا اور یکساں پالیسی کے تحت سب کو دورانِ ملازمت ترقی کے مواقع ملنے لگے۔ یہ تو ادغام کے مثبت پہلو تھے۔ جہاں تک اس کے منفی پہلوؤں کا تعلق ہے تو سب سے پہلے تو ریاستی ملازمین کو ایک انتہائی مشکل صورتِ حال سے دوچار کیا گیا۔ ایک اجنبی انتظامی نظم و نسق اور ایک نامانوس طرزِ حکمرانی کی کوکھ سے انتہائی بدنظمی، سوات کے قدرتی وسائل کی

لوٹ مار، سماجی ڈھانچہ میں ایک شورش کی سی کیفیت، رفاہ عامہ کے اداروں جیسے سڑکوں کی دیکھ بھال اور صحت عامہ میں شکست و ریخت جیسے مسائل نے جنم لیا۔ نظام عدل میں طول طویل عدالتی کارروائی، غیر ضروری تاخیر اور مقدمات پر اٹھنے والے اخراجات نے لوگوں میں شدید بددلی اور بے زاری کی کیفیت پیدا کر دی۔

حالاں کہ ریاست کے ادغام کے بعد بھی علاقہ کی خصوصی حیثیت برقرار رہی لیکن منصوبہ بندی، ترجیحات کے تعین، فنڈ مختص کرنے اور فیصلہ سازی کے اختیارات اور اس سب کچھ کی ذمہ داری علاقہ سے نکل کر صوبائی اور مرکزی حکومتوں کے ایک اجنبی انتظامی تنظیم کے ہاتھوں میں منتقل ہوگئی۔ اس طرح سوات ایک بڑے نو آبادیاتی نظام کا حصہ بن کر رہ گیا جس سے اُس نے اپنی وہ الگ شناخت کھو دی جو اگر ہزاروں نہیں تو سینکڑوں برسوں سے یقیناً اُس نے برقرار رکھی تھی۔

نوٹس

1۔ اکبر ایس احمد نے اپنی کتاب میلینیم اینڈ کرزما میں میاں گل عبدالودود کو کرشمہ ساز قائد پیش کرنے کا جتن کیا ہے۔

2۔ اس کا اشارہ سوات کی روایتی سیاسی قیادت کی جانب ہے جس کا فریڈرک بارتھ نے اپنی کتاب پولیٹیکل لیڈرشپ اَمنگ سوات پٹھانز میں تجزیہ کیا ہے۔

3۔ اس کا اشارہ سواتی معاشرہ کی خصوصیات دریادلی اور حسد، کی طرف ہے جس پر چارلس لینڈ ھامر نے اپنی کتاب جنیروسٹی اینڈ جیلسی میں بحث کی ہے۔

مآخذ

غیر مطبوعہ

مسوّدات

پشتو اکیڈمی لائبریری، پشاور یونیورسٹی

مسوّدہ نمبر ق۔569۔سوات نامہ خوشحال خان خٹک۔(تاریخ ندارد)

ضیاءاللہ خان (گل کدہ، سوات) کا ذاتی ذخیرہ کتب

مسوّدہ جنگ نامہ (فارسی شاعری) عبدالحق (؟) تاریخ پھاڑی گئی ہے۔

سرکاری ریکارڈ

ٹرائبل افیئرز ریسرچ سیل، پشاور

دیر ڈسٹرکٹ / ریاست کی فائلیں

سوات کی فائلیں

صوبائی آرکائیوز، پشاور (ریکارڈ سیکشن)

ٹرائبل ریسرچ سیل (ایجنسیاں) کی فائلیں۔

چیف کمشنر آفس پشاور کی فائلیں۔

دستاویزات کی مکمل فہرستوں کی فائلیں۔

ڈپٹی کمشنر آفس پشاور کی فائلیں۔

صوبہ سرحد کی اسپیشل برانچ پولیس کی فائلیں۔

صوبہ سرحد کے فنانس ڈیپارٹمنٹ کی فائلیں۔

صوبہ سرحد کے گورنر سیکرٹریٹ کی فائلیں۔

کمشنر آفس پشاور کی فائلیں۔

ضلعی ریکارڈ روم، گلکدہ، سوات

ریاست سوات اور ضلع سوات کا ریکارڈ

ضلعی رصدر قانون گو آفس، گلکدہ، سوات

بندوبست اول کی رپورٹ، ضلع سوات

ضلعی مال خانہ، سیدوشریف، سوات

ریاست سوات کا ریکارڈ

گورنمنٹ جہان زیب کالج، سیدوشریف، سوات

طلباء کے داخل خارج رجسٹر۔

مصنف (سلطانِ روم) کا ذاتی ذخیرہ کتب، ہزارہ، سوات

ریاست سوات کے مختلف علاقوں کے دستور العمل

حکمران ریاستِ سوات کے فرامین، احکام اور فیصلے

حکمران ریاست سوات کی ہدایت پر جاری کئے گئے فرامین واحکامات

متفرقات

نیشنل ڈاکومینٹیشن سنٹر، کیبنٹ ڈویژن، اسلام آباد

انڈیا آفس ریکارڈ (مائیکروفلم کاپیاں)

نجی کاغذات ودستاویزات

بہادر خان (فتح پور، سوات) کا ذاتی ذخیرہ کاغذات ودستاویزات

عبدالوہاب خان (روڑیال، سوات) کا ذاتی ذخیرہ کاغذات ودستاویزات

فضل معبود عرف بابو (سیدوشریف، سوات) کا ذاتی ذخیرہ کاغذات ودستاویزات

مصنف (سلطانِ روم، ہزارہ، سوات) کا ذاتی ذخیرہ کاغذات ودستاویزات

شخصیات جن سے مصنف نے اس ضمن میں ملاقاتیں کیں

نوٹ: بالمشافہ گفتگو میں شامل افراد کی عمریں اور دیگر تفصیلات پہلی ملاقات کے وقت کے مطابق دی گئی ہیں۔ وفات کی تاریخیں مصنف نے بعد میں معلوم ہونے پر شامل کی ہیں۔

ارزومند خان (عمر 59 سال۔ سیدو شریف، سوات، کا رہنے والا۔ جہان زیب کالج کا سابقہ اکاونٹنٹ۔ ملکی رورولی کی والی مخالف تحریک میں متحرک۔ حالیہ وکالت کے پیشہ سے منسلک۔ وفات 2011ء)، 17 جون 1998ء۔

اسلم (عمر 110/105 سال۔ ہزارہ، سوات، کا رہنے والا۔ بعض اہم واقعات کا عینی شاہد۔ ریاست کا پورا دور دیکھنے والا۔ ملاقات کے وقت ذہنی اور جسمانی لحاظ سے تن درست۔ وفات 1998ء)، 15 نومبر 1991ء۔

اسلم افندی (عمر 75 سال۔ حالیہ لنڈیکس، مینگورہ، کا رہنے والا۔ والی کا ایک دوست جو بعد میں ناراض ہوا۔ سوات لبریشن موومنٹ کا سکرٹری۔ وفات 2006ء)، 3، 4، 5 جون 1997ء۔

افضل خان (عمر 50 سال۔ بازارکوٹ، شانگلہ پار، کا رہنے والا۔ حالیہ خواجہ آباد، مینگورہ، سوات۔ جہان زیب کالج کا سابقہ طالب علم رہنما۔ بیرون سوات بحیثیت طالب علم والی مخالف تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ حالیہ اسسٹنٹ پروفیسر آف باٹنی)، 28 جون 1998ء، 3، 8 اکتوبر 2000ء۔

اکبر خان (عمر 60 سال۔ سپل بانڈئ، سوات، کا رہنے والا۔ والی کے باڈی گارڈ دستہ اور ریاست سوات میں کئی دیگر حیثیتوں میں کام کیا)، 22 نومبر 1998ء۔

امان الملک (عرف جاجا) (عمر 74 سال۔ پرونړا، سوات، کا رہنے والا۔ ملکی رورولی کا دوسرا اور آخری صدر۔ سابقہ پروفیسر آف ریاضی اور پرنسپل جہان زیب کالج۔ وفات 2003)، 19 اگست 2000ء۔

امیر زمان (عمر 66 سال۔ ہزارہ، سوات، کا رہنے والا۔ مصنف کا باپ۔ ریاست سوات کی فوج میں خدمات سرانجام دیں۔ وفات 1994ء)، 15 مارچ 1987ء۔

اولیاء خان (عمر اندازاً 78 سال۔ بڑشیر پلم، سوات، کا رہنے والا)، 30 اپریل 1997ء۔

باور خان (عمر 83 سال۔ سیدو شریف، سوات، کا رہنے والا۔ ریاستی فوج میں خدمات انجام دیں، وفات 2007ء)، 26 فروری 1997ء۔

بخت زمین خان (ہزارہ، سوات، کا رہنے والا۔ آہنی عزم و ہمت کا مالک۔ ریاست اور بعد از ریاست ادوار میں بے پناہ تکالیف برداشت کیں۔ وفات 1999ء)، 16 مارچ 1987ء۔

بونیر خان (عمر 68 سال۔ اوڈیگرام، سوات، کا رہنے والا۔ انسپکٹر اسکولز ریاست سوات، سابقہ ڈویژنل ڈائریکٹر ایجوکیشن۔ وفات 2004ء)، 16 جون 1998ء۔

بہادر (عمر اندازاً 95 سال۔ ننگولئی، سوات، کا رہنے والا۔ وفات 2001ء)، 16 مارچ 1997ء

بہادر خان (عمر 57 سال۔ فتح پور، سوات، کا رہنے والا۔ میاں دم خان کا پوتا۔ والی مخالف تحریک میں شامل)، 30 اپریل 1998ء۔

پردل خان لالا (عمر 79 سال۔ گل کدہ، سوات، کا رہنے والا۔ باچا صاحب اور والی صاحب کا پرائیویٹ سیکرٹری۔ وفات 2002ء)، 14، 19 مئی 1997ء۔

تاج محمد خان (عمر 70 سال۔ غالیگے، سوات، کا رہنے والا، ریاست سوات کا مشیر مال، سابقہ سیکرٹری داخلہ و قبائلی امور، صوبہ سرحد۔ وفات 2006ء)، 9، 16 مئی 1999ء۔

تاجونو (عمر 53 سال۔ سیدو شریف، سوات، کا رہنے والا۔ ریاست سوات میں ملازمت کی۔ حالیہ انچارج ڈسٹرکٹ مال خانہ، سیدو شریف، سوات)، 24، 27، 28 فروری 1997ء۔

ان زیب پاچا (عمر 82 سال۔ جہان آباد، سوات، کا رہنے والا۔ دوران ریاست سوات نائب سالار۔ وفات 2002ء)، 31 اگست 2000ء۔

حبیب الرحمٰن (عمر اندازاً 107 سال۔ فتح پور، سوات، کا رہنے والا)، 25 جولائی 1992ء۔

زین العابدین (عمر اندازاً 75 سال۔ چنداخورہ، سوات، کا رہنے والا۔ طبیب، جماعت اسلامی سے تعلق کی بناء پر والی نے ریاست بدر کیا، وفات 2011ء)، 21، 27 جون 1998ء۔

سراج الدین خان (عمر اندازاً 76 سال۔ سنگوٹہ، سوات، کا رہنے والا۔ ریاست سوات میں اصلاحات کا مطالبہ کرنے والا پہلا شخص۔ آمریّت کے خلاف آواز اُٹھانے پر شدید مصائب و آلام برداشت کیے۔ سراج الدین سواتی کے نام سے لکھتے ہیں۔ وفات 2006ء)، 11، 27 جون 1998ء۔

سرن زیب (عمر 65 سال۔ لیلونئ، شانگلہ، کا رہنے والا۔ سوات لبریشن موومنٹ میں متحرک۔ وفات 2003ء)، 5 اکتوبر، 25، 26 نومبر 1998ء۔

سید عبداللہ شاہ لالا (عمر 69 سال۔ تندوڈاگ، سوات، کا رہنے والا۔ دورانِ ریاست سوات تحصیل دار، اور سابقہ ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر)، 12 اکتوبر 1998ء۔

شاکراللہ (عمر 59 سال۔ چنداخورہ، سوات، کا رہنے والا۔ ریاست سوات میں ملازمت کی۔ ملکی رورولی کے بنیادی ارکان میں سے ایک، والی مخالف تحریک میں متحرک۔ حالیہ پیشہ وکالت)، 1، 27 جون 1998ء۔

شاہ سلم خان (عمر 49 سال۔گل کدہ، سوات، کا رہنے والا۔ بذاتِ خود والی صاحب کا انٹرویو لیا۔ پیشۂ وکالت سے تعلق ہے)، 10 دسمبر 1999ء، 5 جولائی 2000ء۔

شجاع الملک (عمر 68 سال۔ مینگورہ، سوات، کا رہنے والا سابقہ ایس پی)، 10 نومبر 1998ء شیر افگن (عرف کاکا) عمر 57 سال۔ مینگورہ، سوات، کا رہنے والا۔ وزیرِ مال شیر محمد خان کا بیٹا۔ حالیہ پروفیسر پولیٹیکل سائنس)، 24 جون 1998ء، 3 اکتوبر 2000ء۔

شیر باچا (عمر 86 سال۔ سپل بانڈئ، سوات، کا رہنے والا۔ باچا صاحب کا قریبی ساتھی۔ وفات 2005ء)، 6 اکتوبر 1998ء۔

شیر بہادر خان (عمر 72 سال۔ مینگورہ، سوات، کا رہنے والا۔ ریاست سوات کا مشیر، سابقہ ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر۔ وفات 2010ء)، 7 مئی 1998ء۔

ضیاء اللہ خان (عمر 69 سال۔ گل کدہ، سوات، کا رہنے والا۔ ریاست سوات کے چیف سیکرٹری کا بیٹا)، 6 جون 1998ء۔

طالع مند خان (عمر 79 سال۔ ملک آباد، شموزئی، سوات، کا رہنے والا۔ باچا صاحب کا پرسنل سیکرٹری۔ وفات 2001ء)، 16 مئی 1998ء۔

عارف حسن (عمر 55 سال۔ کراچی کا رہنے والا۔ مشہور ماہر تعمیرات و مشیر، ریاست اور بعد از ریاست ادوار میں سوات آئے۔ سوات سیرینا ہوٹل میں ملاقات کی)، 2 مئی 1999ء۔

عبدالحلیم (عمر 61 سال۔ غالیگے، سوات، کا رہنے والا۔ اسسٹنٹ سیکرٹری کم انفارمیشن افسر ریاست سوات۔ حالیہ وکیل)، 6 جولائی 1998ء، 7 اگست 1999ء، 5 اگست، 7 اکتوبر 2000ء، 29 اپریل 2002ء۔

عبدالرشید خان (عمر 75 سال۔ ڈھیرئ، سوات، کا رہنے والا۔ سرکردہ شخصیت، ملکی رورولی کی تحصیل یونٹ کا صدر)، 12 جولائی 1998ء، 8، 30 ستمبر 2001ء۔

عبداللہ قریشی (عرف طوطا پاچا) (عمر 68 سال۔ تنگوئی، سوات، کا رہنے والا۔ ملکی رورولی تحریک میں متحرک رہا۔ وفات 2007ء)، 12 جولائی 1998ء۔

عبدالمنان (عمر 64 سال۔ اخون کلے، سوات، کا رہنے والا۔ ریاست سوات میں ملازمت کی۔ ملکی رورلی کی بنیاد رکھنے والوں میں سے ایک۔ سابقہ سب انجینئر)، 27 جون 1998ء۔

عبدالواحد خان (عمر 66 سال۔ رونڑیال، سوات، کا رہنے والا۔ ملکی رورولی کے ابتدائی ارکان میں سے ایک جو کہ اُس کی ایگزیکٹو کونسل کا بھی رکن رہا۔ والی مخالف کردار ادا کرنے پر والی نے ملازمت سے برخواست کیا۔ سابقہ

پروفیسر پولیٹیکل سائنس اور سابقہ پرنسپل جہان زیب کالج)، 25 مئی 1998ء۔

عبدالولی خان (عمر 81 سال۔ ولی باغ، چارسدہ، کا رہنے والا۔ مشہور سیاست دان، ملاقات جرے سوات میں کی۔ وفات 2006ء)، 21 مئی 1998ء۔

عقل مند (عمر 80 سال۔ سیدوشریف، سوات، کا رہنے والا۔ باچا صاحب کا دستِ راست۔ وفات 2003ء)، 9 فروری، 11 اپریل، 15 مئی 1998ء۔

علی حیدر (عمر 51 سال۔ کوکڑئی، سوات، کا رہنے والا۔ بیرونِ ریاست والی مخالف تحریک کی صف اوّل میں شامل۔ جہان زیب کالج کا سابقہ طالب علم رہنما۔ حالیہ وکیل)، 5 ستمبر، 7 اکتوبر 2000ء۔

فتح محمد خان (عمر 65 سال۔ بر شیر پلم، سوات، کا رہنے والا۔ ملکی رورولی اور سوات لبریشن موومنٹ میں شمولیت اور اُس کی حمایت کی۔ سابقہ رکن دستور ساز اسمبلی مغربی پاکستان، رکن مجلس شوریٰ پاکستان، سینیٹر، اور صوبائی وزیر۔ حالیہ صوبائی وزیر)، 31 مئی 1998ء۔

فصیح اللسان (عمر 70 سال۔ کوزہ بانڈئی، سوات، کا رہنے والا۔ مشیر ریاست سوات اور سابقہ ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر اور پولیٹیکل ایجنٹ۔ وفات 1999ء)، 21 جون 1998ء۔

ل ربی (عمر 62 سال۔ بلوگرام، سوات، کا رہنے والا۔ حالیہ راولپنڈی، ریاست میں اسکول استاد۔ ملکی رورولی کے بانی اراکین میں شامل اور اُس کا پہلا صدر۔ دعوہ اکیڈمی، انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد، میں پروفیسر رہا، وفات 2002ء)، 7 ستمبر 1998ء۔

کامران خان (عمر 74 سال۔ گل کدہ، سوات، کا رہنے والا۔ والئی سوات کا قریبی ہم نشین، بعد میں مخالف۔ سوات لبریشن موومنٹ کی حمایت کی۔ سابقہ سینیٹر، وفات 2012ء)، 14 ستمبر، 7 اکتوبر 1998ء۔

گل حیدر (عمر اندازاً 75 سال۔ گل بانڈئی، سپل بانڈی، سوات، کا رہنے والا۔ باچا صاحب کا ملازمِ خانہ، جمعدار اور ملک)، 7 اکتوبر 1998ء۔

گل محمد (عمر 69 سال۔ سیدوشریف، سوات، کا رہنے والا)، 27 مئی 1999ء۔

لاجبر (عمر 95 سال۔ اشاڑے، سوات، کا رہنے والا۔ وفات 2000)، 30 اپریل، 1 مئی 1998ء۔

محمد ابرار چٹان (عمر 45 سال۔ سیدوشریف، سوات، کا رہنے والا۔ تحریک بحالئ ریاست کے تین بانیوں میں شامل)، 13 ستمبر 2000ء۔

محمد آصف خان (عمر 72 سال۔ سیدوشریف، سوات، کا رہنے والا۔ باچا صاحب کی خودنوشت کا مصنف۔ اُس کا پہلا، چوتھا و پانچواں حصہ خود لکھا۔ ایک عالم فاضل شخص، تجزیہ اور تنقیدی ادراک کی صلاحیت سے بہرہ ور، لیکن

درباری مصنف ہونے کی وجہ سے حقائق کو توڑنے مروڑنے کے مرتکب ہوئے۔ ملاقات کے دوران اُنہوں نے خود اس حقیقت کو تسلیم کیا۔ وفات 2002ء)، 17، 24 مئی، 14 جون، 9 اگست 1998ء۔

محمد آفرین خان (عمر اندازاً 70 سال۔ خوڑ کلے، شانگلہ پار، کا رہنے والا۔ سوات لبریشن موومنٹ کا چیئرمین)، 26 نومبر 1998ء۔

محمد افضل خان (عمر 70 سال۔ بڑہ دُرو شخیلہ، سوات، کا رہنے والا۔ ریاستی حکمرانوں کے خلاف سرگرمیوں اور اپنے خاندان کے اُن سے کشیدہ تعلقات کے باوجود والی سے دوستانہ مراسم استوار کئے۔ سابقہ صوبائی اور وفاقی وزیر)، 7 جون 1998ء۔

محمد ایوب (عمر 92 سال۔ غوریجو، سوات، کا رہنے والا۔ تحصیل مرزا (تحصیل میں کلرک) ریاست سوات۔ وفات 2003ء)، 16 مارچ 1997ء۔

محمد سعید (عمر 54 سال۔ گالوچ، سوات، کا رہنے والا۔ تیز حافظہ کا مالک۔ اپنے دادا کی باتیں عمدگی سے بیان کرتا ہے)، 10 جون 1998ء۔

محمد سعید خان (عمر 86 سال۔ چنگلائی (حالیہ چمن لائی)، سوات، کا رہنے والا۔ ایک سرکردہ شخصیت۔ وفات 2000ء)، 14 جون 1998ء۔

سید محمد (عمر 72 سال۔ گل کدہ، سوات، کا رہنے والا۔ ریٹائرڈ لیفٹیننٹ کرنل)، 27 مئی 1999ء۔

محمد عارف (عمر 66 سال۔ سیدو شریف، سوات، کا رہنے والا۔ ملکی رورولی کے ابتدائی ارکان میں سے ایک اور اُس کا جنرل سیکرٹری۔ سابقہ ڈی پی ای جہانزیب کالج، رابطہ سیکرٹری سوات ایمپلائز ایسوسی ایشن۔ ڈائریکٹر چترال ایریا ڈیولپمنٹ پروجیکٹ (سی اے ڈی پی)، حالیہ وکیل)، 4، 14 جولائی 1998ء، 19، 30 ستمبر 2000ء۔

محمد علی خان (عمر 50 سال۔ خوازہ خیلہ، سوات، کا رہنے والا۔ والی مخالف تحریک میں متحرک طالب علم)، 7 جولائی 1998ء۔

محمد فاروق سواتی (عمر 44 سال۔ پشاور کا رہنے والا۔ ایسوسی ایٹ پروفیسر، ڈیپارٹمنٹ آف آرکیالوجی، یونیورسٹی آف پشاور)، 8 فروری 1999ء، 20 نومبر 2000ء۔

محمد نواز طائر (عمر 64 سال۔ تھانہ، سوات، ملاکنڈ ایجنسی کا رہنے والا۔ سابقہ ڈائریکٹر پشتو اکیڈمی، یونیورسٹی آف پشاور)، 24 اپریل 1998ء۔

مدار خان (ریگا، بونیر، کا رہنے والا۔ سرتور فقیر کے بھائی کا پوتا)، 6 ستمبر 1992ء۔

میاں گل اورنگزیب (عمر 71 سال۔سیدو شریف، سوات، کا رہنے والا۔والی صاحب کا ولی عہد، سابقہ رکن مجلس شوریٰ اور قومی اسمبلی پاکستان۔حالیہ گورنر بلوچستان)، 3 مارچ 1999ء۔

میاں گل شیرین (عمر 55 سال۔ملکی روررولی اور جسٹس لیگ میں متحرک رہا۔حالیہ چیف آفیسر میونسپل کمیٹی مینگورہ)، 18، 25 جون 1998ء، 6 فروری 2000ء۔

میاں نوشیروان پاچا (عمر اندازاً 75 سال۔شوخدرہ، سوات، کا رہنے والا۔وفات 2001ء)، 17 مارچ 1997ء۔

نجیب اللہ ایف آر سی پی (عمر 74 سال۔گل کدہ، سوات، کا رہنے والا۔سابقہ محکمۂ صحت ریاست سوات کا سربراہ اور سیدو گروپ آف ہاسپٹلز کا ایم ایس۔حالیہ پیشہ طب سے منسلک)، 9، 16 مئی 1999ء۔

نذیر احمد دتو (عمر 55 سال۔فیصل آباد کا رہنے والا۔ایک سماجی کارکن۔پہلی بار سوات 1970ء میں آیا، بعد میں بھی آتا رہا۔سوات سیرینا ہوٹل، سیدو شریف، سوات، میں ملاقات کی)، 2 مئی 1999ء۔

نعیم الہادی (عمر 65 سال۔کانجو، سوات، کا رہنے والا۔ریاست سوات میں تحصیلدار، حاکم خزانہ اور سابقہ ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر)، 5، 6، 9 جولائی 1998ء۔

روان خان (عمر 75 سال۔خوازہ خیلہ، سوات، کا رہنے والا۔ایک سرکردہ شخصیت)، 7 جولائی 1998ء۔

ں (فتح پور، سوات، کا رہنے والا۔سرتور فقیر کا پوتا)، 25 جولائی 1992ء۔

اردو کتابیں

احمد حسن دانی۔*شاہ رئیس خان کی تاریخ گلگت*۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2000ء۔

اختر علی۔*انسانی حقوق اور ریاست سوات کا حکمران*۔لاہور: مکتبہ المستاز، 1963ء۔

اللہ بخش یوسفی۔*یوسفزئی*۔کراچی: محمد علی ایجوکیشنل سوسائٹی، 1960ء۔

_____ *افغان یا پٹھان*۔پیش لفظ شیخ محمد شفیق۔تیسرا ایڈیشن، کراچی: محمد علی ایجوکیشنل سوسائٹی، 1960ء۔

_____ *سرحد اور جدوجہد آزادی*۔1968، نظر ثانی واضافہ شدہ ایڈیشن۔کراچی: نفیس اکیڈمی، 1989۔

اولف کیرو۔*پٹھان*۔ترجمہ سید محبوب علی، مع ترجمہ 'اختتامیہ' اشرف عدیل، 'مقدمہ' عبدالقادر اور 'پیش لفظ' راج ولی شاہ۔تیسرا ایڈیشن، پشاور: پشتو اکیڈمی، 2000ء۔

پریشان خٹک۔*پشتون کون؟ (تاریخ، تحقیق، تنقید)*۔نظر ثانی محمد نواز طائر اور جہان زیب نیاز۔پشاور: پشتو اکیڈمی، 1984ء۔

جارج میکمن ۔شمالی مغربی پاکستان اور برطانوی سامراج ۔ترجمہ ایم انور رومان ۔کوئٹہ: نساء ٹریڈرز، 1979ء۔
جمیل یوسفزئی ۔دیرکی مختصر تاریخ: (قبل از مسیح سے عہد انگلیشیہ تک) ۔دیر: البدر بک سینٹر، 1994ء۔
خواجہ نعمت اللہ ہروی ۔تاریخ خان جہانی ومخزن افغانی ۔ترجمہ محمد بشیر حسین ۔لاہور: مرکزی اردو بورڈ، 1978ء۔
ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر ۔ہمارے ہندوستانی مسلمان ۔ترجمہ صادق حسین ۔لاہور: قومی کتب خانہ، تاریخ ندارد۔
رضا علی عابدی ۔شیر دریا ۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 1998ء۔
روشن خان ۔ملکۂ سوات ۔کراچی: روشن خان اینڈ کو، 1983ء۔
____تذکرہ: (پٹھانوں کی اصلیت اور ان کی تاریخ)۔ چوتھا ایڈیشن، کراچی: روشن خان اینڈ کو۔ 1983/1980ء۔
____یوسف زئی قوم کی سرگذشت ۔کراچی: روشن خان اینڈ کو، 1986ء۔
سبط حسن ۔موسیٰ سے مارکس تک ۔ساتواں ایڈیشن، آٹھویں اشاعت، کراچی: مکتبۂ دانیال، 1986ء۔
____پاکستان میں تہذیب کا ارتقا ۔چھٹی اشاعت، کراچی: مکتبۂ دانیال، 1986ء۔
سراج الدین سواتی (سراج الدین خان) ۔قبائلی علاقہ اور ریاستیں ۔لاہور: پاکستان پرنٹنگ پریس، 1966ء۔
____سرگذشت سوات ۔لاہور: الحمرا اکیڈمی، 1970ء۔
____سوات حال کے آئینہ میں ۔مینگورہ، سوات: مصنف خود، تاریخ ندارد۔
____ضم شدہ قبائلی ریاستوں کے مسائل ۔مینگورہ، سوات: مصنف خود، تاریخ ندارد۔
سلطان محمد خان ۔پختونوں کا تاریخی سفر بنی اسرائیل کے تناظر میں ۔کراچی: پاکستانی ادب پبلی کیشنز، 1997ء۔
سید میاں گل فردوس ۔ریاستِ سوات کا قیام و جناب ہز ہائی نیس والی صاحب سوات کا مختصر خاکۂ زندگی ۔مقامِ اشاعت و تاریخ ندارد۔
شیخ نوید اسلم ۔شمالی علاقہ جات اور پاکستان ۔لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، 2000ء۔
شیر افضل خان بریکوٹی ۔تعارف سوات ۔کراچی: مصنف خود، 75/4 لیگ ہاؤس، 1955ء۔
____پیر بابا ۔مینگورہ، سوات: شعیب سنز پبلشرز اینڈ بک سیلرز، 1999ء۔
شیر بہادر خان ۔تاریخ ہزارہ ۔1969ء، دوسرا ایڈیشن، نظرثانی واضافہ شدہ ۔ایبٹ آباد: دارالشفا، 1980ء۔
ظہیر الدین بابر ۔تزک بابری ۔ترجمہ رشید اختر ندوی ۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، تاریخ ندارد۔
عبدالحمید ترین ۔فقیر ایپی ۔کراچی: تاج کمپنی لمیٹڈ، 1984ء۔
عبدالرشید ۔اسلامی تصوف اور صوفیائے سرحد: دسویں صدی ہجری میں علمی وادبی خدمات۔

اسلام آباد: تصوف فاؤنڈیشن،1988ء۔

عبدالقیوم۔مشاہیر سرحد۔لاہور: فیروز سنز لمیٹڈ،1977ء۔

عزیز جاوید۔سرحد کا آئینی ارتقاء۔پشاور: ادارۂ تحقیق و تصنیف،1975ء۔

عقیل عباس جعفری۔ پاکستان کے سیاسی وڈیرے 1993ء۔نظر ثانی و اضافہ شدہ ایڈیشن ،کراچی: بک میکرز، 1994ء۔

علی حسن چوہان۔تاریخ گوجر (حالات حاضرہ)۔حصہ چہارم۔تاریخ و مقام اشاعت ندارد۔

عنایت الرحمٰن۔سوات کی لوک کہانیاں۔پیش لفظ محمد نواز طائر۔پشاور: پشتو اکیڈمی،1993ء۔

غلام رسول مہر۔1857ء: پاک و ہند کی پہلی جنگ آزادی۔لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ،تاریخ ندارد۔

____ سرگذشت مجاہدین۔لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ،تاریخ ندارد۔

__ جماعت مجاہدین۔لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز لمیٹڈ،تاریخ ندارد۔

__ سید احمد شہید۔تیسرا ایڈیشن،لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز،1981ء۔

رور۔تاریخ مخزن پنجاب۔اشاعت ثانی،لاہور: دوست ایسوسی ایٹس،1996ء۔

ل بخاری اور رضا ہمدانی (مدیران) اٹک کے اُس پار۔اشاعتی معلومات پھاڑے گئے ہیں۔

ل ربی راہی۔سوات تاریخ کے آئینہ میں۔دوسرا ایڈیشن، مینگورہ،سوات: شعیب سنز پبلشرز اینڈ بکسیلرز، 1997/1993ء۔

____ سوات: سیاحوں کی جنت۔مینگورہ،سوات:شعیب سنز پبلشرز اینڈ بک سیلرز،2000ء

____ ریاستِ سوات: تاریخ کا ایک ورق۔مینگورہ،سوات: شعیب سنز پبلشرز اینڈ بک سیلرز،2000ء۔

فیض الرحمٰن۔مشاہیر علماء سرحد۔کراچی: مجلس نشریات اسلام،1998ء۔

قابل خان خٹک۔سمہ اور سوات۔طباعت: جدون پریس،پشاور،1992ء۔

قاری جاوید اقبال۔ثقافتِ سرحد: تاریخ کے آئینہ میں۔اسلام آباد: لوک ورثہ اور لاہور: الفیصل ناشران، 2002ء۔

قدرت اللہ شہاب۔شہاب نامہ۔بیسواں ایڈیشن،لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز،1999ء۔

قیام الدین احمد۔ہندوستان میں وہابی تحریک۔ترجمہ محمد مسلم عظیم آبادی۔تیسرا ایڈیشن، کراچی: نفیس اکیڈمی، 1980ء۔

محمد اختر۔تاجک سواتی ومملکت گبر: (تاریخ کے آئینے میں)۔ایبٹ آباد: سرحداردو اکیڈمی، 2002ء۔

محمد ارشاد خان۔تاریخ ہزارہ: ترکوں کا عہد۔پشاور: احباب پرنٹرز اور پبلشرز، 1976ء۔

محمد اسماعیل ذبیح۔مناظر سوات۔مقام اشاعت ندارد (1954ء)۔

محمد امیر شاہ قادری۔تذکرہ علماء ومشائخ سرحد۔جلد اول۔پشاور: مکتبہ الحسن، تاریخ ندارد۔

محمد پرویش شاہین۔کالام کوہستان: (لوگ اور زبان)۔مینگورہ، سوات: شعیب سنز، پبلشرز اینڈ بکسیلرز، 1989ء

______کالام سے کافرستان تک۔لاہور: فکشن ہاؤس، 1993ء۔

______مشرق کا سوئٹزرلینڈ (وادیٔ سوات)۔لاہور۔ ظفر پبلی کیشنز، 2004ء۔

______سوات کوہستان۔لاہور: ظفر پبلی کیشنز، 2004ء۔

______کافرستان کے رسم ورواج۔لاہور: مکتبۂ جمال، 2004ء۔

محمد خواص خان۔روئیداد مجاہدین ہند۔لاہور: مکتبۂ رشیدیہ لمیٹڈ، 1983ء۔

محمد شفیع صابر۔تاریخ صوبہ سرحد۔پشاور: یونیورسٹی بک ایجنسی، 1986ء۔

______تذکرہ سرفروشانِ سرحد۔پشاور: یونیورسٹی بک ایجنسی، تاریخ ندارد۔

______شخصیات سرحد۔پشاور: یونیورسٹی بک ایجنسی، تاریخ ندارد۔

محمد عزیز الدین۔تاریخ چترال۔لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، 1991ء۔

محمد علی قصوری۔مشاہدات کابل ویاغستان۔کراچی: انجمن ترقی اردو (پاکستان)، تاریخ ندارد۔

محمد یوسف حضروی۔سیرِ صوات: حصہ اوّل۔کلکتہ: منیجر اکسیرات ہندو دواخانہ، (1944ء)۔

محمود دانشور۔کافرستان اور چترال۔دیر۔سوات کی سیاحت۔ترجمہ خلیل احمد۔فروری 1953ء، دوسرا نظر ثانی شدہ ایڈیشن۔لاہور: ویسٹ پاک پبلشنگ کمپنی لمیٹڈ، اکتوبر 1953ء۔

مختار مسعود۔سفر نصیب۔نواں ایڈیشن، لاہور: نقوش، 1999ء۔

مرزا محمد غفران اور مرزا غلام مرتضٰی۔نئی تاریخ چترال۔ترجمہ: وزیر علی شاہ۔طباعت: پبلک آرٹ پریس، پشاور، 1962ء۔

مستنصر حسین تارڑ۔سوات و خنجراب: سفر شمال کے۔لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، 1997ء۔

مولوی عبدالمالک۔شاہانِ گوجر۔لاہور، 1986ء۔

میر احمد خان صوفی۔غازی پیر: سید محمد امین الحسنات مانکی شریف۔بمبئی: صوفی میڈیکل ہال، 1987ء۔

ہیرالڈ لیمب۔بابر۔ترجمہ ہاشمی فرید آبادی۔لاہور: فکشن ہاؤس، 1998ء۔

ہیون سانگ۔ ہیون سانگ کا سفر نامہ ہند۔ ترجمہ یاسر جواد۔ لاہور: تخلیقات، 2001ء۔
اردو دائرہ معارف اسلامیہ۔ جلد دوم۔ لاہور: یونیورسٹی آف دی پنجاب، 1975ء۔
انسائیکلوپیڈیا پاکستانیکا۔ کراچی: سید کاشف محمود، مارچ 1989ء۔

اردو اخبارات

ہدایت اختر۔ 'سوات میں کیا ہو رہا ہے'۔ نوائے وقت۔ 2 فروری 1970ء۔
'سرحدی ریاستیں بلا تاخیر ختم کی جائیں'۔ (اداریہ) نوائے وقت۔ 26 اپریل 1967ء۔
بانگِ حرم۔ 14 اگست 1967۔ 3، 6، 7، 8، 11، 12، 13 فروری 1969ء۔

پشتو کتابیں

، درویزہ۔ مخزن۔ (پشتو، فارسی)۔ 'مقدمہ' محمد تقویم الحق کاکاخیل۔ دوسرا ایڈیشن، پشاور: پختو اکیڈمی، 1987/196؟ء۔
خان خٹک۔ تاریخ مرصع۔ تقابل، تصحیح، حاشیہ از دوست محمد خان کامل مومند۔ پشاور: یونیورسٹی بک ایجنسی، تاریخ ندارد۔
البرایس احمد۔ میلینیم او کرزما د سوات پہ پختو کے۔ ترجمہ اور نظر ثانی سید محمد تقویم الحق کاکاخیل اور حبیب الرحمٰن قلندر مومند۔ پشاور: پختو اکیڈمی، 1978ء۔
پیر معظم شاہ۔ تواریخ حافظ رحمت خانی۔ (پشتو، فارسی) مع 'دیباچہ' محمد نواز طائر۔ دوسرا ایڈیشن۔ پشاور: پختو اکیڈمی، 1987/1971ء۔
تاج محمد خان زیب سر۔ عروج افغان (شعر)۔ دو جلدوں میں۔ جلد اول: مقامِ اشاعت ندارد، 1360 ہجری۔ جلد دوم: ریاستِ سوات، 1361 ہجری۔
جینز انولڈن۔ سپوگمیہ کرنگ وھہ راخیژہ: (پشتو ضرب الامثال اور ٹپوں کا مجموعہ مع انگریزی ترجمہ)۔ دوبارہ اشاعت، پشاور: انٹرلیٹ فاؤنڈیشن، یونیورسٹی ٹاؤن، 2004ء۔
خوشحال خان خٹک۔ کلیات خوشحال خان خٹک سرہ د مقدمے او حاشیے د دوست محمد خان کامل۔ پشاور: ادارہ اشاعتِ سرحد، 1960ء۔

______ سوات نامہ خوشحال خان خٹک ۔مع مقدمہ تحقیق او سمون، ہمیش خلیل ۔اکوڑہ خٹک: مرکزی خوشحال ادبی و ثقافتی جرگہ (رجسٹرڈ)، 1986ء۔

______ بستارنامہ ۔مع پیژندگلو پردل خان خٹک ۔پشاور: پختو اکیڈمی، 1901ء۔

______ کلیات خوشحال خان خٹک ۔جلد اول غزلیات ۔مرتبہ شیر شاہ ترخوی ۔جلد دوم قصائد، رباعیات، قطعات او متفرقات ۔پشاور: عظیم پبلشنگ ہاؤس، تاریخ ندارد۔

سرن زیب سواتی ۔تاریخ ریاست سوات ۔پشاور: عظیم پبلشنگ ہاؤس، 1984ء۔

سید بہادر شاہ ظفر کاکاخیل ۔پختانہ د تاریخ پہ رنڑا کے ۔پشاور: یونیورسٹی بک ایجنسی، تاریخ ندارد۔

سید عبدالغفور قاسمی ۔تاریخ ریاست سوات ۔پشاور: طباعت، حمیدیہ پریس، 1939ء۔

سید علی شاہ ۔شریعت کاروان: منزل بہ منزل ۔لاہور: مختار احمد سواتی، 1995ء۔

صفی اللہ ۔د شریعت داستان (ملاکنڈ ڈویژن) 1995-1996ء ۔مقام اشاعت و تاریخ ندارد۔

عبدالحلیم اثر ۔روحانی رابطہ او روحانی تڑون ۔دوسرا ایڈیشن، باجوڑ، این ڈبلیو ایف پی: دارالاشاعت، 1967/1966ء۔

______ سوات د تاریخ پہ رنڑا کے ۔باجوڑ، این ڈبلیو ایف پی: دارالاشاعت، تاریخ ندارد۔

عبدالحئی ۔افغانستان او سرحد: یوہ تاریخی جائزہ ۔پشاور: حاجی فقیر محمد اینڈ سنز، 1988ء۔

عبدالرحمٰن شباب ۔ذکر یون: د مولانا عبدالقادر د مضمونو مجموعہ ۔دوسرا ایڈیشن، پشاور: یونیورسٹی بک ایجنسی، 1997ء۔

عبدالرؤف نوشہروی ۔قلم سفر ۔حصہ دوم ۔پشاور: اکیڈمی سائنس، 1988ء۔

عبدالغفار ۔زما ژوند او جدوجہد ۔کابل: دولتی مطبع، 1983ء۔

عبدالولی خان ۔رختیا رختیا دی ۔کابل: د قومونو او قبائیلو وزارت، دنشراتو ریاست، 1987ء۔

عنایت اللہ ۔د ریاست سوات تاریخی او ترقیاتی جائزہ ۔مقام اشاعت ندارد: د سوات دوخ زلمولہ خوا، تاریخ ندارد۔

فضل محمود روخان ۔"سحر یوسفزے خو یو سحر دے" اوب سہ رے؟: تنقیدی مقالے ۔از سحر یوسف زے، 1967ء۔ تیسرا ایڈیشن، مینگورہ، سوات: شعیب سنز پبلشرز اینڈ بک سیلرز، 1996ء۔

محمد آصف خان ۔تاریخ ریاست سوات و سوانح حیات بانی ریاست سوات حضرت میانگل گل شہزادہ عبدالودود خان بادشاہ صاحب ۔مع دیباچہ، حصہ اول، چہارم و پنجم از محمد آصف خان ۔مقام اشاعت ندارد، (1958ء)۔

محمد پردیش شاہین ۔د سوات گلونہ ۔مینگورہ، سوات: شعیب سنز پبلشرز اینڈ بک سیلرز، 1988ء۔

____ گل ورنے سوکے۔ مینگورہ،سوات: شعیب سنز پبلشرز اینڈ بک سیلرز،1989ء۔
_____ سوات: دسرورو وطن۔ مینگورہ،سوات: شعیب سنز پبلشرز اینڈ بک سیلرز،1993ء۔
محمد نواز طائر۔درر دیال: تالیف لے سوات۔ پشاور: منظور عام کتب خانہ،1967ء۔
میاں عبدالرشید۔تذکرہ علماء کبار و مشائخ عظام صوبہ سرحد پاکستان۔مدین،سوات: مکتبہ غوثیہ، تاریخ ندارد۔
نصراللہ خان نصر۔اخون صاحب سوات۔1950ء،دوسرا ایڈیشن،پشاور: دارالتصنیف،1964ء
_____ سوات۔پشاور: عظیم پبلشنگ ہاؤس،1963ء۔
نور محمد شاہ غوبہ جان۔منظوم تاریخ سوات۔(شعر میں)طباعت: احمد پرنٹنگ پریس،مینگورہ،تاریخ ندارد۔
فتاویٰ ورودیہ۔دو جلدوں میں۔مرتبہ مولوی محمد ابراہیم۔جلد اول،مینگورہ،سوات: اسلام بک اسٹور،تاریخ ندارد۔
جلد دوم،پشاور: اسلامی کتب خانہ،تاریخ ندارد۔

نخو جرائد

اشاہ رحیم۔'ملاکنڈ د تاریخ پہ رنڑا کے۔' پختو (پشاور)۔جلد20(مئی1988)،صفحہ28تا43۔
__ 'سوات پہ تلونو کے۔' پختو (پشاور)۔جلد20(جولائی1988ء)،صفحات10تا19۔
سلطان روم۔'دسیدو بابا جی نہ تر والئی سوات پورے :یوہ تنقیدی جائزہ۔' پختو (پشاور)۔جلد 29 (نومبر۔دسمبر 1997ء)،صفحات12تا23۔
_____ 'دسوات غرونہ او کہ دازادئ د تاریخ بابونہ: یوہ تجزیہ۔' پختو (پشاور)۔جلد30(نومبر۔ دسمبر 1998ء)، صفحات44تا57۔
عبدالحق نسیم۔'دسوات سیندنہ۔' پختو (پشاور)۔جلد19۔20(نومبر۔فروری 87۔1988) صفحات23تا 25۔
عبدالروف نوشہروی۔'میاں گل جہان زیب والئی سوات۔' پختو (پشاور)۔جلد21 (اکتوبر۔ دسمبر 1989)، صفحات48تا52۔
فضل زمان شلمان۔'د پاکستان د جوڑیدو پہ زدوس کلنہ او دقبائلو دغزا گانو سل کلنہ۔' پختو (پشاور)۔جلد30 (ستمبر۔ اکتوبر1998ء)،صفحات41تا51۔
محمد اسلام انجمی۔'سیدو بابا جی نہ تر والی سوات پورے۔' پختو (پشاور)۔ جلد 29 (جولائی۔ اگست

1997ء)،صفحات 171تا 175۔

محمد پرویش شاہین۔'جونوسر' پختو (پشاور)۔جلد 21(جولائی۔ستمبر 1989)،صفحات 46تا 60،64۔

_____ 'دسوات غرونہ اوکہ دازادئ دتاریخ بابونہ۔' پختو (پشاور)۔جلد 29(جولائی۔اگست 1997ء)،صفحات 284تا 289۔

محمد نواز طائر۔'حضرت شیخ ملی بابا' پختو (پشاور)۔جلد 16۔18(85-1987)،صفحات 32تا 38۔

پختو،دسوات باباجی نمبر(پشاور)۔جلد 13(فروری۔مارچ 1982ء)،صفحات 6تا 178۔

فارسی کتب

اخون درویزہ۔تذکرۃ الابرار والاشرار۔پشاور:اسلامی کتب خانہ،تاریخ ندارد۔

Unpublished Dissertation and Theses

Ahmad, Aftab. *Government Jahanzeb College: History and Achievements* MA thesis, Department of Pakistan Studies, Government Post Graduate College Mansehra, Session 1992-94

Ahmad, Mahmood. *Socio-Economic Conditions of the People of a Rural Village Naway-Kalay in District Swat*. MA thesis, Department of Sociology, University of Karachi, 1979.

Aslam, Muhammad. *The Rulers of Amb State*. MA thesis, Department of Pakistan Studies, Government Post Graduate College, Mansehra, Session 1992-94.

Begum, Haizal. *The Akhund of Swat: Abdul Ghafoor (A Biographical Sketch)*. MA thesis, Pakistan Study Centre, University of Peshawar, 1992.

Dirvi, Abdul Halim. *The Life and Achievements of Ghazi Umra Khan*. MA thesis, Pakistan Study Centre, University of Peshawar, 1989.

Hassan, Noor. *Dir-Swat Relations*. MA thesis, Pakistan Study Centre, University of Peshawar, 1991.

Hussain, Hazrat. *Tourism in District Swat*. MA thesis, Pakistan Study Centre, University of Peshawar, Session 1993-95.

Hussain, Naheed. *Swat State Through the Ages*. MA thesis, Pakistan Study Centre, University of Peshawar, Session 2000-2002.

Islam, Fakhrul. *Swat under Jehanzeb*. MA thesis, Pakistan Study Centre, University of Peshawar, n.d.

Khan, Abdul Wahid. *Administrative System of Swat State*. MA thesis, Department of Political Science, Government College Lahore, 1959; retyped by Abdul Wahab Khan, 1986.

Khan, Buner. *Growth of Modem Education in Swat State*. M.Ed. thesis, Institute of Education & Research, University of the Punjab, 1963

Khan, Shakeel Ahmad. *Swat Nama of Khushal Khan Khattak (Edited & Translated into English)*. M.Phil. Thesis, Area Study Centre (Central Asia), University of Peshawar, 1981.

Mabood, Abdul. *(The) Causes of Migration of Swat Residents to Karachi*. MA thesis, Department of Sociology, University of Karachi, 1981.

Naz, Muhammad Saleem. Education in Ex- State of Swat. M.Ed. thesis, Faculty of Education, University of Peshawar, 1996.

Rehmat, Robina. *Tahrik Nifaz-i-Shariat-i-Muhammadi (TNSM)*. MA thesis, Pakistan Study Centre, University of Peshawar, Session 1994-1996.

Shahabuddin. *Miangul Abdul Wadood (Badshah Sahib): The Founder of Swat State* MA thesis, Pakistan Study Centre, University of Peshawar, n.d.
Shah, Feroz. *Attitude of the People of Rural Area towards Female Education in a Village of Swat*. MA thesis, Department of Sociology, University of Karachi, 1978
Shah, Rahat. *Education in Private Sector (A Case Study of District Swat)*. MA thesis, Pakistan Study Centre, University of Peshawar, Session 1997-98
Swati, Muhammad Farooq. *Gandhara Art in the Swat Valley, Pakistan: A Study Based on Peshawar University Collection*. Vol. 1, *(Text)*. Ph.D. Dissertation, Faculty of Oriental Studies, University of Cambridge, 1996
Yousafzai, Rafiullah. *Journalism in Swat*. MA thesis, Department of Journalism, University of Peshawar, Session 2002-2003.
Zada, Rahim. *The Battle of Ambela [1863] Against the British in NWFP*. MA thesis, Pakistan Study Centre, University of Peshawar, 1995.
Zubair, Muhammad. *Causes-Effects of Migration and the Problems of Ruralities Settlement in Urban Area: (A case Study of Mingora Swat)*. MA thesis, Department of Sociology/Anthropology, University of Peshawar, 1996

Unpublished Papers

Personal Collection of Abdul Wahab Khan, Ronryal, Swat.
Personal Collection of the author (Sultan-i-Rome), Hazara, Swat,

OFFICIAL WORKS

Confidential Reports of the British Indian Government

Administration Reports of the North-West Frontier Province.
Punjab Frontier Administration Reports.
Reports on the Administration of the Border of the North-West Frontier Province.
Reports on the Administration of the Punjab and its Dependencies.
Summary of Events in North-West Frontier Tribal Territory, 1 January 1930 to 31 December 1930. Simla, 1931.

Confidential Gazetteers and Who's who

(Confidential), Central Asia. Part I. A Contribution towards the Better Knowledge of the Topography, Ethnography, Statistics, & History of the North-West Frontier of British India. Vol. 3. Compiled for Military and Political Reference by C.M. MacGregor. Calcutta: Office of the Superintendent of Government Printing, 1873.
Confidential, Gazetteer of the North-West Frontier: From Bajaur and the Indus

Kohistan on the North to the Man Hills on the South. Vols. 1 & 4. Compiled for Political and Military Reference in the Intelligence Branch of the Quarter Master General's Department in India. Completed and edited by A. L'e. Holmes. Simla: Printed at the Government Central Branch Press, 1887

Confidential, Who's Who of the Dir, Swat and Chitral Agency Corrected up to 1 July 1950. Peshawar, 1950

Census Reports

Census of India, 1941. Vol. 10-Appendix. *Trans-Border Areas: Report and Tables*. By I.D. Scott. Delhi: Manager of Publications, 1942

Census of Pakistan, 1951. Vol. 4. *North-West Frontier Province, Reports & Tables*. Karachi: Manager of Publications, Government of Pakistan, n.d.

Population Census of Pakistan 1961: Census Report of Tribal Agencies. Part 1 & 3. *General Descriptions, Population Tables and Village Statistics*. Karachi: Manager of Publications, Government of Pakistan, n.d.

Population Census of Pakistan 1972: District Census Report Swat. Karachi: Manager of Publications, Government of Pakistan, 1975.

Other Official and Semi Official Works

Hay, W.R. *Notes by Captain W.R. Hay, I.A., Assistant Commissioner, Mardan on his visit to Mahaban, Nagrai and Chamla in September 1929*. n.p., n.d.

______. *Monograph on Swat State*. Simla: Government of India Press, 1934

______. *Monograph on Utman-Khel*. Simla: Government of India Press, n.d.

Keen, W.J. *The North-West Frontier Province and the War*. Peshawar, 1928.

Khan, Gul Wali. *Manual of Land Reforms*. Peshawar: NWFP Land Commission, 1979.

Khan, Khan Malik Allah Yar. *Report on the Swat Valley Kohistan Forests*. Peshawar: North-West Frontier Province Govt. Printing and Stationary Office, 1926

McMahan, A.H., and A.D.G. Ramsay. *Report on the Tribes of the Malakand Political Agency (Exlusive of Chitral)*. Revised by R.L. Kennion. Peshawar: Government Press, North-West Frontier Province, 1916.

Mohammad, Nazir and Shamsul Wahab under the guidance of Beat Stucki, Ali Akbar Khan, and Christoph Duerr. *Working Plan for Kalam Forests of Upper Swat Forest Division (1987-88 to 2001-02)*. Peshawar: NWFP Forest Department; NWFP Forestry Pre-Investment Centre; and Pak-Swiss Kalam Integrated Development Project, n.d.

Plowden, T.J.C. *Report on the Leading Persons and State of Factions in Swat* Simla: Government of India Press, 1932.

Stein, Aurel. *An Archaeological tour in Upper Swat and Adjacent Hill Tracts*. Calcutta: Government of India, Central Publication Branch, 1930.

Constitution of the Islamic Republic of Pakistan: Being a Commentary on the

Constitution of Pakistan, 1973. 2 Vols. By Justice Muhammad Munir, ed. by Mian Bashir Ahmad Lahore: P.L.D. Publishers, 1996.
Extract from Civil and Mily Gaz dated 6 March 1898, 'The Rising in Swat State [sic].' *Civil & Military Gazette*, 1898
Frontier and Overseas Expeditions from India. Vol. 1. *Tribes North of the Kabul River*. 1910; reprint, Quetta: Nisa Traders, 1979.
Gazetteer of the Peshawar District 1897-98. Reprint, Lahore: Sang-e-Meel Publications, 1989.
Imperial Gazetteer of India, Provincial Series, North-West Frontier Province. Reprint, Lahore: Sang-e-Meel Publications, 1991.
List of Members of the Constituent Assembly of Pakistan. n.p., n.d.
List of Members of the Constituent Assembly of Pakistan (Showing Permanent Addresses). n.p., 8 December, 1955.
Malakand 1958-68: A Decade of Progress. Foreword by Muhammad Humayun Khan, Political Agent Malakand. n.p., n.d.
Memorandum on Federated States of Pakistan. By Abdul Hamid, Joint Secretary, Constituent Assembly of Pakistan. Karachi: Printed by the Manager, Govt. of Pakistan Press, n.d.
Military Report and Gazetteer on Buner and Adjacent Independent Territory. General Staff India, 1926. 2nd edn. Delhi: Government of India Press, 1926.
Military Report and Gazetteer on Dir, Swat and Bajaur. Part II, *Military Report*. General Staff India, 1928. 2nd edn. Calcutta: Government of India Press, 1928.
Military Report and Gazetteer of Indus Kohistan, Black Mountain and Adjacent Territories. 1940, General Staff India. 2nd edn. Simla: Government of India Press, 1941
Mutiny Reports from Punjab & NWFP. Vol. 2. 1911; reprint, Lahore: Al-Biruni, n.d
Pakistan Information 1956-57. Reference Series No. 2. Karachi: Press Information Department, Government of Pakistan, n.d.
Report of Dir-Swat Land Disputes Enquiry Commission. Part II. *Swat*. Vol. 2. Peshawar: Government of North-West Frontier Province, Home, Tribal Affairs and Local Government Department, 1973.
Riwaj Nama-e-Swat. Compiled by Ghulam Habib Khan, Superintendent, Deputy Commissioner Office, Swat. n.p., n.d.
(i)Supplementay Instrument of Accession. (ii) Agreement with the Wali of Swat Regarding the Privy Purse, Private Property and Rights and Privileges. (iii) Government of Swat (Interim Constitution) Act, 1954. n.p., n.d.
Supplementary Report of Dir-Swat Land Disputes Enquiry Commission. Part II. *(Swat)*. Vol. 3. Peshawar: Government of North-West Frontier Province, Home, Tribal Affairs and Local Government Department, n.d.
The All Pakistan Legal Decisions (PLD).
The Indian Independence Act, 1947 and Orders Isssued thereunder. n.p., n.d.

Year Book of the North-West Frontier Province 1954. Peshawar: Secretary to Government, NWFP, Information Department, n.d.

OFFICIALLY ENDORSED WORKS

Da Isqat Murawija Mutaliq Fatwa, 11 June 1965 (The Fatwa bears names and signatures of six Ulama from the Darul Ulum Islamia, Saidu Sharif, and of four Qazis of the Mehkama Qaza, Saidu Sharif, and has been counter signed by Hukamran Riyasat-e-Swat)

Da Qurbanai Masail, 30 May 1968 (Signed by five Qazis of Mehkama Qaza, Saidu Sharif and seven Ulama of Darul Ulum Islamia, Saidu Sharif, and counter signed by His Highness Hukamran Swat)

ORGANISATIONS' WORKS

All India Mulsim League, Central Board Policy and Programme. n.p., n.d.

Constitution & Rules of the Pakistan Muslim League. Karachi: Qazi Mohammad Isa, Honorary General Secretary, Pakistan Muslim League, n.d.

Constitution & Rules of the Pakistan Muslim League. Karachi: Mohammad Yusuf Khattak, General Secretary, Pakistan Muslim League, n.d.

Manshoor, Swat Employees Association. District Swat, 1974,

Resolutions of the All India Muslim League: From December 1938 to March 1940. (Nawabzada) Liaqat Ali Khan, Honorary Secretary: All India Muslim League, n.d

The Constitution and Rules of the All India Muslim League. Nawabzada Liaqat Ali Khan, Honorary Secretary, All India Muslim League, n.d.

The Constitution and Rules of the All India Muslim League (as amended upto the end of 1919). Syed Zahur Ahmad, Honorary Secretary, 1920

The Constitution and Rules of the All-India Muslim League: Passed at the session at Lucknow on the 18 October 1937. n.p., n.d

The Constitution and Rules of the All-India Muslim League (as amended upto date). n.p., n.d

The Constitution and Rules of the Frontier Muslim League (Provincial Muslim League NWFP). Muhammad Ismail Khan Ghaznavi: Honorary Secretary, n.d

BOOKS

Books in English

Adamec, Ludwig W. *Afghanistan, 1900-1923: A Diplomatic History*. Berkeley University of California Press, 1967.

Adamson, Hilary, and Isobel Shaw. *A Traveler's Guide to Pakistan*. Islamabad The Asian Study Group, 1981

Afzal, M. Rafique, collector & ed. *Speeches and Statements of Quaid-i-Millat Liaqat Ali Khan [1941-51]*. Lahore: Research Society of Pakistan, 1967.

Ahmad, Khwajah Nizamuddin. *The Tabaqat-i-Akbari: (A History of India from the Early Musalman Invasions to the Thirty-Eighth Year of the Reign of Akbar)*. Vol. 2. Translated and Annotated by Brajendranath De; and Revised, Edited, and Completed with Preface and Index by Baini Prashad. 1st edn. 1936; Reproduced, Delhi: Low Price Publications, 1992.

Ahmad, Makhdum Tasadduq. *Social Organization of Yusufzai Swat: A Study in Social Change*. Lahore: Panjab University Press, 1962

Ahmad, Qeyamuddin. *The Wahabi Movement in India*. Calcutta: Firma K.L. Makhopadhyay, 1966; reprint, Islamabad: National Book Foundation, n.d.

Ahmad, Ziauddin, ed. *Quaid-i-Millat Liaqat Ali Khan: Leader and Statesman* Karachi: The Oriental Academy, 1970.

Ahmed, Akbar S. *Millennium and Charisma among Pathans: A Critical Essay in Social Anthropology*. London: Routledge and Kegan Paul, 1976

______. *Social and Economic Changes in the Tribal Areas, 1972-1976*. With a Foreword by Nasirullah Khan Babur. Karachi: Oxford University Press, 1977.

______. *Pukhtun Economy and Society: Traditional Structure and Economic Development in a Tribal Society*. London: Routledge & Kegan Paul, 1980.

______. *Religion and Politics in Muslim Society: Order and Conflict in Pakistan*. Cambridge: The Press Syndicate of the University of Cambridge, 1983; 1st Pakistani edn. Karachi: Royal Book Company, 1987.

Ali, Ishfaq. *Laws Extended to the Tribal Areas with Jirga Laws*. Peshawar: Printed by New Fine Printers, n.d.

Ali, Muhammad. *Guide to Afghanistan*. With Maps and Illustrations. Kabul, 1938.

Allami, Abu'l-Fazl. *The A'in-i Akbari*. Translated by H.S. Jarrett. Second edition corrected and further annotated by Sir Jadunath Sarkar. Vol. 2. *A Gazetteer and Administrative Manual of Akbar's Empire and Past History of India*. 3rd edn. reprinted from 2nd edn. of 1949. New Delhi: Oriental Books Reprint Corporation, 1978.

Antonini, C. Silvi, and Giorgio Stacul. *The Proto-Historic Graveyards of Swat (Pakistan)*. Part 1. *Description of Graves and Finds: Plates*. Rome: Istituto Italiano per il Medio ed Estremo Oriente, 1972.

Ashraf, Khalid. *Some Land Problems in Tribal Areas of West Pakistan: A Study of the Selected Farms in Kurram, North Waziristan, Malakand, Kalam and Swat*. Tribal Areas Studies-2. Peshawar: The Board of Economic Enquiry, North-West Frontier, Peshawar University, 1963.

Ashton, S.R. *British Policy Towards the Indian States, 1905-1939*. London: Curzon Press Limited, 1982

Babur, Zahiruddin. *Babur-Nama: (Memoirs of Babur)*. Translated from the

Original Turki Text by Annette S. Beveridge. 1st Pakistani edn. Lahore: Sang-e-Meel Publications, 1975
Baha, Lal. *N.-W.F.P. Administration Under British Rule, 1901-1919*. Islamabad: National Commission on Historical and Cultural Research, 1978
Balala, Abdul Qayyum. *The Charming Swat*. Lahore: Maqsood Publishers, [2000].
Balneaves, Elizabeth. *The Waterless Moon*. 1955; 2nd Impression. London: Lutterworth Press, 1956.
Barger, Evert, and Philip Wright. *Excavations in Swat and Explorations in the Oxus Territories of Afghanistan*. Calcutta, 1941; reprint, Delhi: Sri Satguru Publications, 1985.
Barone, Nessim, and Usma Hachima. 'Creativity within Confinement: The Role of Art in the Lives of Pukhtun Women of Pakistan'. *Creativity, Femmes et Development*. Berne: Commission nationale suisse pour l'UNESCO; Berne: DDC, Direction du developpement et de la corporation Department federal des affairs etrangeres; Geneva: Institute University D'etudes du Development, 1997.
Barth, Fredrik. *Indus and Swat Kohistan: An Ethnographic Survey*. Oslo: Forenede Trykkerier, 1956.
______. *Political Leadership among Swat Pathans*. London: The Athlone Press, 1959.
______. *Features of Person and Society in Swat: Collected Essays on Pathans, Selected Essays of Fredrik Barth*. Vol. 2. Edited by Adam Kup London: Routledge & Kegan Paul Ltd., 1981.
______. *The Last Wali of Swat: An Autobiography as told to Fredrik Barth*. London, 1985; reprint, Bangkok: White Orchid Press, 1995
Barton, William. *The Princes of India with a Chapter on Nepal*. Reprint, New Delhi: Cosmos Publications, 1983.
Barua, Beni Madhab. *Asoka and His Inscriptions*. 1946; 2nd edn. Calcutta: New Age Publishers Ltd., 1955.
Bellew, H.W. *A General Report on the Yusufzais*. 1864; 3rd edn. Lahore: Sang-e-Meel Publications, 1994.
______. *An Inquiry into the Ethnography of Afghanistan*. London, 1891; reprint, Karachi: Indus Publications, 1977.
______. *The Races of Afghanistan: Being a Brief Account of the Principal Nations Inhabiting that Country*. Reprint, Lahore: Sh. Mubarak Ali, n.d.
Biddulph, John. *Tribes of the Hindoo Koosh*. Preface to the 1971 edition by Karl Gratzl. Reprint, Lahore: Ali Kamran Publishers, 1986.
Bokhari, Syed Abid, ed. and compiler. *Through the Centuries: North-West Frontier Province*. Quetta: Mr Reprints, 1993.
Bridget and Raymond Allchin. *The Rise of Civilization in India and Pakistan* Cambridge: Cambridge University Press, 1982.
Bruce, Richard Isaac. *The Forward Policy and its Results or Thirty-Five Years*

work amongst the Tribes on Our North-Western Frontier [of India]. London Longmans, Green, and Co., 1900; 2nd edn. in Pakistan, Quetta: M/S Nisa Traders, 1979

Caroe, Olaf. *The Pathans, 550 BC-AD 1957*. London: Macmillan and Company Ltd., 1958; reprint, Karachi: Oxford University Press, 1976.

Chandra, Moti. *Trade and Trade Routes in Ancient India*. New Delhi: Abhinav Publications, 1977

Chauhan, Rana Ali Hasan. *A Short History of the Gujars (Past and Present)*. Gujranwala: Chauhan Publications, 1998.

Cheema, Shahbaz Ahmad. *The Land of Beauty: Valley Swat, Valley Chitral, Pakistan*. Mingawara, Swat: Shoaib Sons Publishers and Booksellers, 2003

Churchill, Winston S. *The Story of the Malakand Field Force: An Episode of Frontier War*. Longmans, Green & Co., 1898; London: Leo Cooper in Association with Octopus Publishing Group Ple, 1989.

[Cunningham, Alexander]. *Cunningham's Ancient Geography of India*. Edited with introduction and notes by Surendranath Majumdar Sastri. Calcutta: Chuckervertty, Chatterjee & Co. Ltd., 1924

Dani, Ahmad Hasan. *History of Northern Areas of Pakistan*. 1989; 2nd edn. Islamabad. National Institute of Historical and Cultural Research, 1991.

______. *Peshawar: Historic City of the Frontier*. [1969; 2nd edn.] Lahore: Sang-e-Meel Publication, 1995

______. *New Light on Central Asia*. Lahore: Sang-e-Meel Publications, 1996.

d'Auvergne, V. *Zindari: A Daughter of the Indian Frontier and other Thrilling Tales of the Indian Frontier*. Reprint, Karachi: Indus Publications, 1982.

Davies, C. Collin. *The Problem of the North-West Frontier, 1890-1908*. Cambridge University Press, 1932; 2nd edn. rev. and enlarged, London: Curzon Press Ltd., 1975.

Deambi, B.K. Koul. *History & Culture of Ancient Gandhara and Western Himalayas from Sarada Epigraphic Sources*. New Delhi: Ariana Publishing House, 1985.

Dichter, David. *The North-West Frontier of West Pakistan: A Study in Regional Geography*. London: Oxford University Press, 1967.

Dodwell, H.H., and R.R. Sethi, eds. *The Cambridge History of India*. Vol. 6. *The Indian Empire, 1858-1918, with Chapters on the Development of Administration 1818-1858 and the Last Phase 1919-1947*. Published in India, Delhi: S. Chand & Co., 1964.

Dupree, Louis. *Afghanistan*. Princeton: Princeton University Press, 1973.

Effendi, Aslam, and Mahmud Butt. *Swat: Dreamland of Tourists [Brochure]*. Karachi: Swat Tourist Agency Ltd., n.d.

Elliott, J.G. *The Frontier, 1839-1947: The Story of the North-West Frontier of India*. With a Preface by Olaf Caroe. London: Cassell & Company Ltd., 1968.

Embree, Ainslie T., ed. *Pakistan's Western Borderlands: The Transformation*

of a Political Order. 1977; reprint, New Delhi: Vikas Publishing House Pvt Ltd., 1985.
Erskine, William. *A History of India under the Two First Sovereigns of the House of Taimur: Baber and Humayun*. Vol. 1. London, 1854; 2nd edn Shannan: Irish University Press, 1972.
______. *A History of India under Baber*. London, 1854. With an Introduction by P. Hardy. Reprint, Karachi: Oxford University Press, 1974
Faccenna, Domenico. *A Guide to the Excavations in Swat (Pakistan) 1956-1962*. Rome: Department of Archaeology of Pakistan, and Istituto Italiano per il Medio ed Estremo Oriente, 1964
______. *Butkara I (Swat, Pakistan) 1956-1962*. Part 2. *Text*. Rome: Istituto Italiano per il Medio ed Estremo Oriente, 1980
______. *Butkara I (Swat, Pakistan) 1956-1962*. Part 5.1. *Plates*. Rome. Istituto Italiano per il Medio ed Estremo Oriente, 1981.
______. *Butkara I (Swat, Pakistan) 1956-1962*. Part 5.2. *General Plans*. Rome: Istituto Italiano per il Medio ed Estremo Oriente, 1981.
Faccenna, Domenico and Giorgio Gullini. *Reports on the Campaigns 1956-1958 in Swat (Pakistan); Mingora: Site of Butkara I; Udegram*. Rome Istituto Poligrafico Dello Stato, 1962
[Fa-Hein]. *The Pilgrimage of Fa Hian: From the French edition of the Foe K Ki of M.M. Remuset, Klaproth, and Landresse with Additional Notes an Illustrations*. Translated and ed. by Anonymous. Calcutta, 1848; Calcut Bangabasi Office, 1912.
______. *A Record of Buddhistic Kingdoms*. Translated and annotated with Corean Recension of the Chinese Text, by James Legge. Oxford: Clarenden Press, 1986; reprint, New Delhi: Munshiram Manoharlal, Publishers Pvt. Ltd., 1991.
Faiz, Ashraf. *The Parachgan*. Lahore: The Frontier Post Publications, 1994.
Faroosh, Syed Mian Gul. *The Wali of Swat: Mian Gul Shahzada Mohammad Abdul Haq Jehanzeb*. n.p., n.d.
Feldman, Herbert. *The Land and People of Pakistan*. London: Adam and Charles Black, 1958.
Ferishta, Mahomed Kasim [Muhammad Qasim]. *History of the Rise of the Mahomedan Power in India, till the year AD 1612*. Translated by John Brigge. Vol. 2., reprint, Lahore: Sang-e-Meel Publications, 1977.
Fisher, Robert E. *Buddhist Art and Architecture*. Reprint, London: Thames and Hudson Limited, 1996.
Foucher, A. *Notes on the Ancient Geography of Gandhara: (A Commentary on a Chapter of Hiuan Tsang)*. Translated by H. Hargreaves. Calcutta: Superintendent Government Printing Press, India, 1915.
Getley, George. *Swat: Switzerland of the East*. n.p., n.d.
Grima, Benedicte. *The Performance of Emotion among Paxtun Women* Austin: University of Texas Press. 1992; Karachi: Oxford University Press, 1993.

Habib, Mohammad. *Sultan Mahmud of Ghaznin: A Study*. 1st Pakistani edn. Lahore: Universal Books, 1978
Hamilton, Angus. *Afghanistan*. With a Map and numerous Illustrations London William Heinemann, 1906
Haq, Syed Moinul *The Great Revolution of 1857*. Karachi: Pakistan Historical Society, 1968
Haque, Mian Manzoorul. *Around Khyber. A Brochure on the Physical, Economic, Agricultural, Industrial, Social and Cultural aspects of the North-West Frontier Province, the Frontier States & the Tribal Areas*. n.p., A Pie Publication, n.d.
Harvi, Niamatullah. *History of the Afghans: Translated from the Persian of Neametulllah*. Translated by Bernhard Dorn. 3rd edn. Karachi: Indus Publications, 2001.
Hisam, Zeenat (ed.], and Alain Viaro. *Mingora: The Unplanned City, Dynamics of Development and Public Participation*. Karachi: City Press, 2002.
Hodson, H.V. *The Great Divide: Britain-India-Pakistan*. Karachi: Oxford University Press, 1969.
Holdich, T. Hungerford. *The Indian Borderland, 1880-1900*. 1st reprint in India, Delhi: Gian Publishing House, 1987.
Hunter, W.W. *The Indian Musalmans*. 2nd edn. London: Trubner and Company, 1872.
Ibbetson, Denzil. *Punjab Castes*. 1916; reproduced, Delhi: Low Price Publications, 1993.
______. *Punjab Castes*. 1882; reprint, Lahore: Sh. Mubarak Ali, 1974.
Inam-ur-Rahim and Alain Viaro. *Swat: An Afghan Society in Pakistan; Urbanisation and Change in a Tribal Environment*. Karachi: City Press, 2002.
Inayat-ur-Rahman. *Folk Tales of Swat*. Part 2. Peshawar: n.p., 1984.
Jairazbhoy, R.A. *Foreign Influences in Ancient India*. Bombay: Asia Publishing House, 1963.
Janjua, Ziaul Islam. *The Jirga Laws*. Lahore: Lahore Law Times Publications, n.d.
Jettmar, Karl. *Bolor & Dardistan*. Reprint, Islamabad: National Institute of Folk Heritage, 1980.
Kakar, M. Hasan. *Afghanistan: A Study in International Political Developments, 1880-1896*. Kabul, 1971.
Kalter, Johannes, ed. *The Arts and Crafts of the Swat Valley*. London: Thames and Hudson Ltd., 1991.
Keay, John. *The Gilgit Game: The Explorers of the Western Himalayas, 1865-95*. Jhon Murray (Publishers) Ltd., U.K., 1979; Karachi: Oxford University Press, 1993
Keepel, Arnold. *Gun-Running and the Indian North-West Frontier*. 1911; 1st edn. in Pakistan, Quetta: Gosha-e-Adab, 1979.
Khan, Abdul Wahab, Bakht Jehan, and M. Usman (eds.). *The River Swat:*

Expenences of River Swat Conservation Project Saidu Sharif, Swat Environmental Protection Society (EPS), 2003

Khan, Abdul Wali *Facts are Sacred.* Translated by Aziz Siddiqui. Peshawar Jaun Publishers, n.d.

Khan, Ahmad Nabi. *Buddhist Art and Architecture in Pakistan.* Islamabad: Ministry of Information and Broadcasting, Directorate of Research, Reference and Publication, Government of Pakistan, n.d

Khan, Ghani. *The Pathans: A Sketch.* 1947; reprint, Islamabad: Pushto Adabi Society, 1990

Khan, Makin. *Archaeological Museum Saidu Shanf, Swat: A Guide.* Saidu Sharif: By the author, Archaeological Museum, Saidu Sharif, 1997

Khan, Mohammad Afzal. *Chitral and Kafiristan.* 1975; Peshawar: Reprint at Printing Corporation of Frontier Ltd., 1980

Khan, M. Ashraf. *Gandhara Sculptures in the Swat Museum.* Saidu Sharif, Swat: By the author, Archaeological Museum, Saidu Sharif, 1993.

______. *Buddhist Shrines in Swat.* Saidu Sharif, Swat: By the author, Archaeological Museum, Saidu Sharif, 1993.

Khan, M. Ashraf, Tahira Tanweer, and Abdul Nasir. *The Ethnological Galleries in the Swat Museum.* Swat: By the authors, Archaeological Museum, Saidu Sharif, 1994

Khan, Mohammad Said. *The Voice of the Pukhtuns.* n.p, n.d.

Khan, Mohd. Ayub. *The Evolution of Judicial Systems and Law in the Sub Continent.* n.p., 1987.

Khan, Muhammad Asif. *The Story of Swat as told by the Founder Miangul Abdul Wadud Badshah Sahib to Muhammad Asif Khan.* With Preface, Introduction and Appendices by Muhammad Asif Khan. Trans. Preface and trans. by Ashruf Altaf Husain. 1962; Printed by: Ferozsons Ltd., Peshawar, 1963.

Khan, Muhammad Nawaz. *Pakistan: The Evolution of NWFP and the Tribal Area: In Historical, Constitutional, Judicial Retrospect; Also Containing Studies in the PATA (Nifaz-e-Nizam-e-Shariah) Regulation 1994 with Act IV 1995.* Mardan: Radiant Publishers, 1996

Khan, Sultan Mahomed, ed. *The Life of Abdur Rahman: Amir of Afghanistan.* With a new Introduction by M.E. Yapp. Vol. 2. London: John Murray, 1900; reprint in Pakistan, Karachi: Oxford University Press, 1980

Khattak, Khushal Khan. *Swat Nama of Khushal Khan Khattak.* Edited and trans. by Shakeel Ahmad. With Preface by Raj Wali Shah Khattak. Peshawar: Pashto Academy, n.d.

Khattak, Muhammad Habibullah Khan. *Buner: The Forgotten Part of Ancient Uddiyana.* Karachi: By the author, Department of Archaeology and Museums, 1997.

Khilji, Jalaluddin, ed. *Muslim Celebrities of Central Asia.* Peshawar: Area Study Centre (Central Asia), n.d.

Lamb, Harold. *Babur the Tiger.* Karachi: Pak Britain Publication, 1989

Linck, Orville F *A Passage Through Pakistan*. Detroit: Wayne State University Press, 1959
Lindholm, Charles. *Generosity and Jealousy: The Swat Pukhtun of Northern Pakistan* New York. Columbia University Press, 1982
______ *Frontier Perspectives: Essays in Comparative Anthropology*. Karachi: Oxford University Press, 1996
Lumby, E.W.R. *The Transfer of Power in India, 1945-7*. London: George Allen & Unwin Ltd., 1954
Macmunn, George. *The Romance of the Indian Frontiers*. 1st edn. in the second decade of the twentieth century, 1st Pakistani edn. Quetta: Nisa Traders, 1978
______. *Afghanistan: From Danus to Amanullah*. London: G. Bell & Sons Ltd., 1929.
______ *The Martial Races of India*. 1st edn. in the second decade of the twentieth century; 2nd Pakistani edn. Quetta: Nisa Traders, 1982.
______. *Vignettes from Indian Wars*. Reprint, Quetta: Nisa Traders, 1982
Mahmood, Safdar. *Constitutional Foundations of Pakistan*. Lahore: Publishers United Ltd., n.d.
Majumdar, R.C., H.C. Raychaudhuri, and Kalikinkar Datta. *An Advanced History of India*. 1946; last reprint in Pakistan, Lahore: Famous Books, 1992
Marsh, John. *The Young Winston Churchill*. London: World Distributors, 1962.
Marshall, John. *The Buddhist Art of Gandhara: The Story of the Early School, Its Birth, Growth and Decline*. Cambridge: The Syndics of the Cambridge University Press, for the Department of Archaeology in Pakistan, 1960
Marwat, Fazal-ur-Rahim and Sayed Wiqar Ali Shah Kakakhel, eds *Afghanistan and the Frontier*. Peshawar: Emjay Books International, 1993.
Mayne, Peter. *The Narrow Smile: A Journey Back to the North-West Frontier*. London: John Murray (Publishers) Ltd., 1955.
McMahon, A.H. and A.D.G. Ramsay. *Report on the Tribes of Dir, Swat and Bajour together with the Utman-Khel and Sam Ranizai*. Superintendent of Government Printing, India, 1901; reprinted with an Introduction and ed. by R.O. Christensen. Peshawar: Saeed Book Bank, 1981.
M'crindle, J.W. *The Invasion of India by Alexander the Great: As Described by Arrian, Q Curtius, Diodoros Plutarch and Justin*. With Introduction by J.W. M'crindle. 1896; reprint, Karachi: Indus Publication, 1992.
Miller, Charles. *Khyber: British India's North-West Frontier; The Story of an Imperial Migraine*. London: Macdonald and Jane's Publishers Limited, 1977.
Mills, H. Woosnam. *The Pathan Revolt in North-West India*. Lahore: The Civil and Military Gazette Press, 1897; reprint, Lahore: Sang-e-Meel Publications, 1996.
Mishra, Yogendra. *The Hindu Sahis of Afghanistan and the Punjab, AD 865-1026*. Patna: Sm. Sushila Devi. 1972

Mookerji, Radhakumud. *Asoka*. London, 1928; reprint, Delhi: Motilal Banarsidass, 1986.

Moon, Penderel, ed. *Wavell: The Viceroy's Journal*. 1973; reprint, Karachi Oxford University Press, 1997.

Morgenstierne, Georg. *Report on a Linguistic Mission to North-Western India* Norway, 1932; reprint, Karachi: Indus Publications, n.d.

Narain, A.K. *The IndoGreeks*. 1957; reprint, London: Oxford University Press. 1962.

Nazim, Muhammad. *The Life and Times of Sultan Mahmud of Ghazna*. With Foreword by Thomas Arnold. Cambridge, 1931; reprint, Lahore: Khalil & Co., 1973.

Nevill, H.L. *Campaigns on the North-West Frontier*. London: John Murray, 1912; reprint, Lahore: Sang-e-Meel Publications, 1977.

Nichols, Robert. *Settling the Frontier: Land, Law, and Society in the Peshawar Valley, 1500-1900*. Karachi: Oxford University Press, 2001.

Obhrai, Diwan Chand. *The Evolution of North-West Frontier Province*. Reprint, Peshawar: Saeed Book Bank, 1983.

Oliver, Edward E. *Across the Border or Pathan and Biloch*. London: Chapma and Hall Ltd., 1890; Lahore: Sang-e-Meel Publications, 2000.

Pennell, T.L. *Among the Wild Tribes of the Afghan Frontier: A Record of Sixteen years close Intercourse with the Natives of the Indian Marches* With an Introduction by Earl Roberts. London: George Bell & Sons, 19(

Popowski, Joseph. *The Rival Powers in Central Asia*. Translated by Arthu Baring Brant. Edited with Introduction by Charles E.D. Black. Westmin: Archibald Constable and Company, 1893; 1st edn. in Pakistan, Quetta: Gosha-e-Adab, 1977.

Powell-Price, J.C. *A History of India*. London: Thomas Nelson and Sons Ltd., 1955.

Qasmi, Muhammad Abdul Ghafoor. *The History of Swat*. Peshawar: Printed by D.C. Anand & Sons, 1940.

Quddus, Syed Abdul. *The Pathans*. Lahore: Ferozsons (Pvt.) Ltd., 1987.

______. *The Cultural Patterns of Pakistan*. Lahore: Ferozsons (Pvt.) Ltd., 1989.

______. *The North-West Frontier of Pakistan*. Karachi: Royal Book Company, 1990.

______. *Pakistan from Khyber to Karachi*. Lahore: Islamic Book Centre, n d

Qureshi, Ishtiaq Husain. *Ulema in Politics*. 2nd edn. Karachi: Ma'aref Limited, n.d.

______, ed. *A Short History of Pakistan*. 2nd edn. Karachi: University of Karachi, 1961/1984.

Qureshi, Mohammed Ibrahim. *The First Punjabis: History of the First Punjab Regiment, 1759-1956*. Aldershot: Gale & Poden Ltd. 1958.

Rapson, E.J., ed. *The Cambridge History of India*. Vol. 1. *Ancient India* 1st Indian reprint, Delhi: S. Chand & Co., 1955.

Rashid, Abdur. *Civil Service on the Frontier.* n.p., n.d.
Rehman, Abdur. *The Last Two Dynasties of the Sahis: (An analysis of their history, archaeology, coinage and palaeography).* Islamabad: Director, Centre for the Study of the Civilizations of Central Asia, 1979.
Reventlow, Count Ernst Zu. *India: Its Importance for Great Britain, Germany and the future of the World.* Berlin, 1917. Translated into English in Central Intelligence Office, Simla, 1918.
Raverty, Henry George. *Notes on Afghanistan and Baluchistan.* 2 Vols. 2nd edn. in Pakistan. Quetta: Nisa Traders, 1982.
Rhys-Davids, T.W. *BuddhistIndia.* 1903; 3rd Indian edn. Calcutta: Susil Gupta (India) Ltd., 1957.
Richards, D.S. *The Savage Frontier: A History of the Anglo-Afghan Wars.* London: Macmillan London Limited, 1990.
Roberts. Lord. *Forty-One Years in India: From Subaltern to Commander-in-Chief.* New edition in one volume, London: Macmillan and Co. Limited, 1898.
Roberts, P.E. *History of British India: Under the Company and the Crown.* 1921; 3rd edn. London: Oxford University Press, 1952.
Robertson, George S. *Chitral: The Story of a Minor Siege.* 2nd edn. London: Methuen & Co., 1899.
Rose, H.A., comp. *A Glossary of the Tribes and Castes of the Punjab and North-West Frontier Province.* Based on the Census Report for the Punjab, 1883, by Denzil Ibbetson; and the Census Report for the Punjab, 1892, by E.D. MacLagan. Vol. 3. 1911; 1st Pakistani edn. Lahore: Aziz Publishers, 1978.
Sarkar, Jadunath. *History of Aurangzeb.* Vol. 3. *Northern India, 1658-1681.* 1928; newedn. reprinted, Karachi: South Asian Publications, 1981.
Savill, Agnes. *Alexander the Great and His Time.* 1951; 3rd edn. London: Barrie and Rockliff (Barrie Books Ltd.), 1959.
Scott, George B. *Afghanistan and Pathan: A Sketch.* London: The Mitre Press, 1929
Shaw, Isobel. *Pakistan: Handbook.* Hong Kong: The Guidebook Company Limited, 1989.
[Shui-ching-chu]. *Northern India According to the Shui-ching-chu.* Translated by. L. Petech. Oriental Series 2. Rome: Istituto Italiano per il Medio ed Estremo Oriente, 1950.
Singer, Andre. *Lords of the Khyber: The Story of the North-West Frontier.* London: Faber and Faber Ltd., 1984
Singer, Andre, et.al. *Guardians of the North-West Frontier?: The Pathans.* Reprint, Karachi: Liberty Books (Private) Limited, 1991.
Skeen, Andrew. *Passing it on: Short Talks on Tribal Fighting on the North-West Frontier of India.* 1932; 1st Pakistani edn. Lahore: Aziz Publishers, 1978.
Smith, Vincent A. *Asoka: The Buddhist Emperor of India.* 2nd edn. revised and

enlarged. 1st Indian reprint, Delhi: S. Chand & Co., 1957.

______. *The Early History of India: From 600 BC to the Muhammadan Conquest, Including the Invasion of Alexander the Great*. 1924; 4th edn revised by S.M. Edwardes. London: Oxford University Press, 1957.

______. *Akbar: The Great Mogul, 1542-1605*. 2nd edn. revised. Indian reprint, Delhi: S. Chand & Co., 1958.

Spain, James W. *The Way of the Pathans*. Great Britain, 1962; 7th Impression, Karachi: Oxford University Press, 1994.

______. *The People of the Khyber: The Pathans of Pakistan*. 1962; New York: Frederick A. Praeger, Inc., 1963.

______. *The Pathan Borderland*. 1963; reprint, Karachi: Indus Publications, 1985.

______. *Pathans of the Latter Day*. Karachi: Oxford University Press, 1995.

Stacul, Giorio. *Prehistoric and Protohistoric Swat, Pakistan (c.3000-1400 BC)*. With Foreword by Karl Jettmar; and contributions by Bruno Compagnoni and Lorenzo Costantini. Rome: Is MEO, 1987.

Stacul, Giorgio, and Sebastiano Tusa. *Report on the Excavations at Aligrama (Swat, Pakistan), 1974*. Rome: Is MEO, n.d.

Stein, Aurel. *On Alexander's Track to the Indus: Personal Narrative of Explorations on the North-West Frontier of India*. 1928; reprint, Karachi: Indus Publication, 1995.

Stephens, Ian. *Horned Moon: An Account of a Journey through Pakistan, Kashmir, and Afghanistan*. Bloomington: Indiana University Press, 1955.

Sultan-i-Rome. 'Merger of Swat State with Pakistan: Causes and Effects.' *MARC Occasional Papers No. 14 - April 1999*. Edited by Alain Viaro and Arlette Ziegler. Geneva: Modern Asia Research Centre; Graduate Institute of International Studies; Graduate Institute of Development Studies; The University of Geneva, 1999.

______. 'Role of Jirga in the Formulation of Laws in Swat State.' *Proceedings of the International Workshop on Urban and Environmental Management: Local Dynamics in Intermediary Cities in the situation of Centralised Governments*. Edited by Alain Viaro, and Arlette Ziegler. Geneva: Graduate Institute of Development Studies, June 2000.

______. 'Land Ownership in Swat: Historical and Contemporary Perspective.' *Land Tenure and Resource Ownership in Pakistan*. editors Zabta Khan Shinwari and Ashiq Ahmad Khan. Peshawar: By the Editors, WWF-Pakistan, 2002.

______. *Forestry in the Princely State of Swat and Kalam (North-West Pakistan): A Historical Perspective on Norms and Practices*. IP6, Working Paper 6. Zurich Swiss National Centre of Competence in Research (NCCR), North-South, 2005.

______. 'Miangul Abdul Wadud.' *Celebrities of NWFP*. Vol. 1 & 2. Peshawar: Pakistan Study Centre, University of Peshawar, 2005.

______. 'Governance of Forests in Swat since sixteenth Century.' *Troubled*

Times: Sustainable Development and Governance in the Age of Extremes Sama Editorial and Publishing Services, Karachi, and Sustainable Development Policy Institute (SDPI), Islamabad, 2006

Swati, Muhammad Farooq. 'Recent Discovery of Buddhist Sites in the Swat Valley.' *Athariyyat*. Vol. 1. A Research Bulletin of National Heritage Foundation. Peshawar, September 1997

Swinson, Arthur. *North-West Frontier: People and Events, 1839-1947*. London: Hutchinson & Co. (Publishers) Ltd., 1967.

Tarn, W.W. *The Greeks in Bactria & India*. 1938; reprint, Cambridge: The Syndics of the Cambridge University Press, 1966

Taylor, Meadows. *A Students Manual of the History of India*. London: Langmans, Green, and Co , 1895

Thomson, H.C. *The Chitral Campaign*. Reprint, Lahore: Sang-e-Meel Publications, 1981.

Trotter, Lionel J. *The Life of John Nicholson, Soldier and Administrator: Based n Private and Hitherto Unpublished Documents*. London: John Murray, 1905; 1st edn. in Pakistan, Karachi: Karimsons, 1978

[Tsiang, Hiuen]. *Chinese Accounts of India: Translated from the Chinese of Hiuen Thsiang*. Vols. 1 & 2. Translated & annotated by Samuel Beal. New edn. Calcutta: Susil Gupta (India), Limited, 1957.

Tucci, G. *Travels of Tibetan Pilgrims in the Swat Valley*. Calcutta: The Greater Indian Society. Also in G. Tucci. On Swat: Historical and Archaeological Notes. Rome, 1997.

Verma, H.C. *Medieval Routes to India, Baghdad to Delhi: A Study of Trade and Military Routes*. Lahore: Book Traders, n.d

Warburton, Robert. *Eighteen Years in the Khyber, 1879-1898*. 1900; reprint, Karachi: Oxford University Press, 1975

Wheeler, J. Talboys. *A Short History of India and of the Frontier States of Afghanistan, Nipal, and Burma. With Maps and Tables*. London: Macmillan and Co., 1884.

Wilcox, Wayne Ayres. *Pakistan: The Consolidation of a Nation*. New York: Columbia University Press, 1963.

Williams, L.F. Rushbrook. *The State of Pakistan*. London: Faber and Faber, 1962.

Woodcock, George. *The Greeks in India*. London: Faber and Faber Ltd., 1966.

Wylly, H.C. *The Borderland: The Country of The Pathans*. [First published under the title From the Black Mountains to Waziristan, 1912]. Reprint, Karachi: Indus Publications, 1998.

Yosufzai, M. Saeedullah Khan. *Attractions of Swat*. n.p., 1996.

Younghusband, G.J. and Francis Younghusband. *The Relief of Chitral*. October 1895; reprint, Rawalpindi: English Book House, 1976.

Yunus, Mohammad. *Frontier Speaks*. With Foreword by Jawahar Lal Nehru. Preface by Khan Abdul Ghaffar Khan. Lahore: Minerva Book Shop, n.d.

Yusufi, Allah Bukhsh. *The Frontier Tragedy*. All India Khilafat Committee,

1930, 2nd edn. Karachi: Mohammad Ali Educational Society, 1986

A Glossary of the Tribes and Castes of the Punjab and NorthWest Frontier Province. Vol. 1. Reprint, Lahore: Aziz Publishers, 1978.

Durand Line. n.p., n.d.

Guide to Pakistan. Karachi: Ferozsons Limited, n.d.

Italian Archaeological Mission, (IsMEO) Pakistan, Swat, 1956-1981: Documentary Exhibition. Rome: Istituto Italiano per il Medio ed Estremo Oriente, 1982

Jinnah: Speeches and Statements 1947-1948. With Introduction by S.M Burke. The Millennium Series. Karachi: Oxford University Press, 2000

Pakistan Miscellany. Vol. 2. Karachi: Pakistan Publications, 1958.

Struggle for Independence, 1857-1947: A Pictorial Record. Karachi: Pakistan Publications, 1958.

The Risings on the North-West Frontier. Compiled from the Special Correspondence of the Pioneer. Allahabad: The Pioneer Press, 1898.

JOURNALS

Journals in English

Agrawala, R.C. 'An Interesting Relief from the Swat Valley (I).' *East and We*. (Rome). Vol. 16 (March-June 1966), pp. 82-83

Ali, Usman and Mohammad Aslam Khan. 'Origin and Diffusion of Settleme in Swat Valley.' *Pakistan Journal of Geography* (Peshawar). Vol. 1 (June-December 1991), pp. 97-115.

Ansari, Arif A. 'The North-West Frontier Policy of the Mughuls under Akbar.' *Journal of the Pakistan Historical Society* (Karachi). Vol. 4 (January 1956), pp. 36-63.

Antonini, Chiara Silvi. 'Swat and Central Asia.' *East and West* (Rome). Vol. 19 (March-June 1969), pp. 100-115.

Asad, Talal. 'Market Model, Class Structure and Consent: A Reconsideration of Swat Political Organization.' *Man* (London). Vol. 7 (March 1972), pp 74-94.

Barth, Fredrik. 'Ecologic Relationships of Ethnic Groups in Swat, North Pakistan.' *American Anthropologist*. Vol. 58 (December 1956), pp. 1079-89

______. 'Segmentary Opposition and the Theory of Games: A Study of Pathan Organization.' *The Journal of the Royal Anthropological Institute of Great Britain and Ireland* (London). Vol. 89 (1959), pp. 5-21

Burton-Page, John. 'Muslim Graves of the Lesser Tradition: Gilgit, Punial, Swat, Yusufzai.' *Journal of the Royal Asiatic Society of Great Britain & Ireland* (London). [Vol. not given] (1986), pp. 249-54.

Dupree, Louis. 'On Two Views of the Swat Pushtun.' *Current Anthropology* Vol. 18 (September 1977), pp. 514-18.

Fahim, Mohammad. 'Afghanistan and World War-I'. *Journal of the Pakistan*

Historical Society (Karachi). Vol 24 (April 1978), pp. 107-15

Gullini, Giorgio. 'Marginal Note on the Excavations at the Castle of Udegram: Restoration Problems.' *East and West* (Rome). Vol. 9 (December 1958), pp 329-48

Hassan, Syed Minhajul. 'The Impact of Mountbatten-Nehru Relationship on the Partition of India.' *Journal of the Pakistan Historical Society* (Karachi). Vol 44 (July 1996), pp. 229-42.

Hay, W.R. 'The Yusufzai State of Swat.' *The Geographical Journal* (London) Vol. 84 (September 1934), pp. 236-46.

Jaffar, Ghulam Muhammad. 'The Ambella Campaign and the Followers of Sayyid Ahmad.' *Journal of the Pakistan Historical Society* (Karachi). Vol. 40 (July 1992), pp. 289-97

Khan, Aftab Ahmad. 'Field Research in Swat.' *Journal of the Pakistan Historical Society* (Karachi). Vol. 35 (October 1987), pp. 285-96.

Khan, Javed Ali. 'Two Historical Works on Punjab: Gulshan-e-Punjab and Makhzan-e-Punjab.' *Journal of the Pakistan Historical Society* (Karachi). Vol. 44 (October 1996), pp. 309-34

Khan, Munawwar. 'Swat in History.' *Peshawar University Review* (Peshawar). Vol. 1 (1973), pp. 51-63.

______. 'Swat.' *Peshawar University Review* (Peshawar). Vol. 1 (1974-75), pp. 57-77.

Khurshid. 'Sandakai Mullah: Career and Role in the Formation of Swat State, Pakistan'. *Journal of the Pakistan Historical Society* (Karachi). Vol. 47 (April-June 1999), pp. 77-81.

Lindholm, Charles. 'Contemporary Politics in a Tribal Society: Swat District, NWFP, Pakistan.' *Asian Survey*. Vol. 19 (May 1979), pp. 485-505.

______. 'The Structure of Violence Among the Swat Pukhtun.' *Ethnology* (Pittsburgh). Vol. 20 (April 1981), pp. 147-56.

______. 'Leatherworkers and Love Potions'. *American Ethnologist* (Washington D.C.). Vol. 8 (August 1981), pp. 512-25.

Meeker, Michael E. 'The Twilight of a South Asian Heroic Age: A Rereading of Barth's Study of Swat.' *Man* (London). Vol. 15 (December 1980), pp. 682-701.

Menon, M.M. 'Swat: Some Aspects of its Geography.' *Pakistan Geographical Review* (Lahore). Vol. 12 (1957), pp. 58-64.

Muncherji, D.H. 'Swat: The Garden of Asoka.' *Pakistan Quarterly* (Karachi). Vol. 9 (3, 1959), pp. 40-45.

Niazi, Shaheer. 'The Origin of the Pathans.' *Journal of the Pakistan Historical Society* (Karachi). Vol. 18 (January 1970), pp. 23-38.

Oman, Giovanni. 'On Eight Coins of Akbar Found in a Rock-Shelter near Ghaligai, Swat.' *East and West* (Rome). Vol. 20 (March-June 1970), pp. 105-107.

Paine, Robert. 'The Stamp of Swat: A brief Ethnography of Some of the Writings of Fredrik Barth.' *Man* (London). Vol. 17 (June 1982), pp. 328-39.

Pardini, Edoardo 'The Human Remains from Aligrama Settlement (Swat, Pakistan).' *East and West* (Rome). Vol. 27 (December 1977), pp. 207-26

Ptech, Luciano. 'A Kharosthi Inscription from Butkara I (Swat).' *East and West* (Rome). Vol. 16 (March-June 1966), pp. 80-81.

Raverty, H.G. 'An account of Upper and Lower Suwat, and the Kohistan, to the source of the Suwat River; with an account of the tribes inhabiting those valleys.' *Journal of the Asiatic Society* (Calcutta). Vol 31 (1862), pp 227-81.

Rehman, Abdur. 'The Zalamkot Bilingual Inscription.' Lahore Museum Bulletin (Lahore). Vols. 10 & 11 (1997-1998), pp. 35-40

______. 'Ethnicity of the Hindu Shahis.' *Journal of the Pakistan Historical Society* (Karachi). Vol. 51 (July-September 2003), pp. 3-10.

Srinivasan, Doris Meth. 'The Tenacity of Tradition: Art From the Vale of Swat.' *Aramco World* (Houston). Vol. 48 (January/February 1997), pp. 2-15

Stacul, Giorgio. 'Preliminary Report on the Pre-Buddhist Necropolis in Swat (W. Pakistan).' *East and West* (Rome). Vol. 16 (March-June 1966), pp. 37-79.

______ 'Notes on the Discovery of a Necropolis near Kherai in the Ghorband Valley (Swat-West Pakistan). *East and West* (Rome). Vol. 16 September-December 1966), pp. 261-74.

______. 'Excavations in a Rock Shelter near Ghaligai (Swat, W. Pakistan): Preliminary Report.' *East and West* (Rome). Vol. 17 (September-Decem 1967), pp. 185-219.

______. 'Discovery of Four Pre-Buddhist Cemeteries near Pacha in Buner (Swat W. Pakistan).' *East and West* (Rome). Vol. 17 (September-December 1967), pp. 220-32.

______. 'Excavation near Ghaligai (1968) and Chronological Sequence of Protohistorical Cultures in the Swat Valley (W. Pakistan).' *East and West* (Rome). Vol. 19 (March-June 1969), pp. 44-91.

______. 'An Archaeological Survey near Kalam (Swat Kohistan).' *East and West* (Rome). Vol. 20 (March-June 1970), pp. 87-91.

______. 'The Gray Pottery in the Swat Valley and the Indo-Iranian Connections (c.1500-300 BC).' *East and West* (Rome). Vol. 20 (March-June 1970), pp. 92-102.

______. 'Dwelling and Storage-Pits at Leobanr III (Swat, Pakistan) 1976 Excavation Report.' *East and West* (Rome). Vol. 27 (December 1977), pp. 227-53.

Stacul, Giorgio and Sebastiano Tusa. 'Report on the Excavations at Aligrama (Swat, Pakistan) 1974.' *East and West* (Rome). Vol. 27 (December 1977), pp. 151-205.

Stein, Aurel. 'From Swat to the Gorges of the Indus.' *The Geographical Journal* (London). Vol. 100 (August 1942), pp. 49-56.

Sultan-i-Rome. 'Abdul Ghaffur (Akhund), Saidu Baba of Swat: Life, Career and Role.' *Journal of the Pakistan Historical Society* (Karachi). Vol. 40 (July

1992), pp. 299-308.

______. 'The Sartor Faqir: Life and Struggle against British Imperialism.' *Journal of the Pakistan Historical Society* (Karachi). Vol. 42 (January 1994) pp. 93-105.

______. 'The Malakand Jihad (1897): An Unsuccessful Attempt to oust the British from Malakand and Chakdarah.' *Journal of the Pakistan Historical Society* (Karachi). Vol. 43 (April 1995), pp. 171-86

______. 'Bayazid Ansari and his Khairul Bayan.' *Hamdard Islamicus* (Karachi) Vol. 20 (July-September 1997), pp. 87-95.

______. 'Jirga: Its Role in the Formulation of Laws in Swat State.' *Udyana Today* (Saidu Sharif, Swat). Vol. 6 (April-June 1999), pp. 2-4

______. 'Merger of Swat State with Pakistan: Causes and Effects.' *Journal of the Pakistan Historical Society* (Karachi). Vol. 47 (July-September 1999), pp. 53-64.

______. 'Judicial System, Judiciary and Justice in Swat: The Swat State Era and the Post-State Scenario.' *Journal of the Pakistan Historical Society* (Karachi). Vol. 49 (October-December 2001), pp. 89-100.

______. 'Mughals and Swat.' *Journal of the Pakistan Historical Society* (Karachi). Vol. 50 (October-December 2002), pp. 39-50.

______. 'The Durand Line Agreement (1893): Its Pros and Cons.' *Journal of the Research Society of Pakistan* (Lahore). Vol. 41 (July 2004), pp. 1-25.

______. 'The Role of the North-West Frontier Province in the Khilafat and Hijrat Movements.' *Islamic Studies* (Islamabad). Vol. 43 (Spring, No. 1), pp. 51-78.

______. 'Swat State's Relations with the British: An Apprisal of Miangul Abdul Wadud's Reign.' *Journal of the Pakistan Historical Society* (Karachi). Vol. 53 (April-June 2005), pp. 65-85

______. 'Geography of North-West Frontier Province in Historical Perspective.' *Pakistan Perspectives* (Karachi). Vol. 11 (January-June 2006), pp. 113-32.

______. 'Origin of Pukhtuns: The Bani Israelite Theory.' *Journal of the Pakistan Historical Society* (Karachi). Vol. 54 (October-December 2006), pp. 73-104.

______. 'Administrative System of the Princely State of Swat.' *Journal of the Research Society of Pakistan* (Lahore). Vol. 43 (December 2006), pp. 181-99.

______. 'Pukhtu: The Pukhtun Code of Life.' Pakistan Vision (Lahore). Vol. 7 (December 2006), pp. 1-30.

______. 'Education in the Princely State of Swat.' *Hamdard Islamicus* (Karachi). Vol. 30 (July-September 2007).

Taddei, Maurizio. 'An Interesting Relief from the Swat Valley (II).' *East and West* (Rome). Vol. 16 (March-June 1966), pp. 84-88.

______. 'A Problematical Toilet-tray from Udegram.' *East and West* (Rome). Vol. 16 (March-June 1966), pp. 89-93.

Tucci, Giuseppe. 'Preliminary Report on an Archaeological Survey in Swat.'

East and West (Rome). Vol 9 (December 1958), pp 279-328

______. 'Oriental Notes V: Preliminary Account of an Inscription from North-West Pakistan.' *East and West* (Rome). Vol. 20 (March-June 1970), pp. 103-104

______. 'On Swat: The Dards and Connected Problems.' *East and West* (Rome). Vol. 27 (December 1977), pp. 9-103.

MAGAZINES

Khan, Zaigham. 'The Lost World.' *Herald* (Karachi). Vol. 28 (December 1997), pp. 116-18.

______. 'The Beginning of the End.' *Herald* (Karachi). Vol. 28 (December 1997), pp. 121-22.

Sufi, Sultan-i-Rome. 'Shaikh Mali Baba.' *Amn* (Weekly [Pukhtu]). Peshawar, 7 March 1992.

Swat Adabi Series [Urdu]. Mingawara, Swat, February-March 1987.

Rah-e-Wafa [Urdu]. Vol. 4, No. 13. Karachi, July 2004.

NEWSPAPERS

Newspapers in English

Jillani, Anees. 'Forgotten Tribal Areas'. *The News International*. Islamabad, August 1998

Khan, Amir Zaman. 'Law that Governs the People of Malakand Division'. *Th Frontier Post, Weekend Post*. Peshawar, 15 July 1988.

Khan, Munawwar. 'Chitral Expedition & the 1897 Uprising-I.' *The Frontier Post*. Peshawar, 15 March 1995.

Kiani, Khaleeq. 'Mallam Jabba Hill Resort: Glaring Example of Negligence.' *The News International*. Islamabad, 4 August 1998.

Mahiyuddin, Umar. 'Saidu Baba of Swat.' *The Frontier Post, Weekend Post*. Peshawar, 19 February 1988.

Sultan-i-Rome. 'Saidu Baba and the Spread of Islam.' *The Frontier Post, Weekend Post*. Peshawar, 15 July 1988.

'Politics of the Tribal Kind' (Excerpts from Frontier Perspectives: Essays in Comparative Anthropology by Charles Lindholm). *Dawn*. Karachi, 2 March 1996

Dawn. Karachi, 2 January 1996.

Khyber Mail. Peshawar, 11, 12 June 1963; 21 October 1974; 18 March 1976; 12 February 1979

Pakistan Times. Rawalpindi, 6, 15 December 1962; 22 October 1969

☆......☆......☆



مصنف کے بارے میں:

ڈاکٹر سلطان روم سوات کے علاقہ نیک پی خیل (تحصیل کبل) کے گاؤں ہزارہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ پرائمری اور سیکنڈری تعلیم ہزارہ اور کبل میں سرکاری سکولوں سے حاصل کی۔ چار سال تک گورنمنٹ جہان زیب کالج سیدوشریف، سوات میں زیرِتعلیم رہے۔ ایم اے شعبۂ تاریخ عمومی، یونی ورسٹی آف کراچی اور پی ایچ ڈی، شعبۂ تاریخ یونی ورسٹی آف پشاور سے کی۔ آج کل گورنمنٹ جہان زیب کالج سیدوشریف، سوات میں اسسٹنٹ پروفیسر آف ہسٹری کی حیثیت سے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

ڈاکٹر سلطان روم پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کے تاحیات رکن ہونے کے علاوہ اس کے ایگزیکٹیو کمیٹی کے موجودہ رکن بھی ہیں۔ آپ کئی دوسرے اداروں کے بھی رکن ہیں۔ آپ کے میدانِ ذوق میں اس علاقے کا سیاسی، سماجی اور معاشی تاریخ اور ثقافت وقدرتی وسائل شامل ہیں۔

ڈاکٹر سلطان روم کے بہت سے تحقیقی مضامین علمی جرائد اور کتابوں وغیرہ میں شائع ہوئے ہیں۔ آپ نے متعدد قومی اور بین الاقوامی سیمناروں اور کانفرنسوں میں شرکت کی ہے جن میں اپنے مقالے بھی پیش کیے ہیں۔ آپ کی دوسری کتابوں میں ''دی نارتھ ویسٹ فرنٹیئر (خیبر پختون خوا): ایسیز آن ہسٹری''، ''لینڈ اینڈ فارسٹ گورننس: ٹرانزیشن فرام ٹرائبل سسٹم ٹو سوات سٹیٹ ٹو پاکستان'' اور پشتو ضرب الامثال کی ایک کتاب ''متلونہ'' شامل ہیں۔

☆......☆......☆



مترجم کے بارے میں:

احمد فواد کا اصل نام فرید احمد ہے۔ آپ 1954ء میں شگئی ضلع سوات (اب ضلع شانگلہ) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم شاہ ولی اللہ اورینٹل کالج منصورہ (سندھ) سے حاصل کی۔ حیدر آباد بورڈ سے میٹرک کیا، بی اے آنرز، تاریخ اور انگلش ادب میں ایم اے کراچی یونی ورسٹی سے کیا۔

پشتو ان کی مادری زبان ہے جب کہ اُردو، عربی، فارسی اور انگریزی زبانوں پر بھی انھیں دسترس حاصل ہے۔ احمد فواد اردو اور پشتو کے بہت اچھے شاعر ہیں۔ اپنی منفرد شاعری کی بناء پر انھیں ادبی حلقوں میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ زمانۂ طالب علمی میں آپ کراچی سے نکلنے والے اخبارات روزنامہ ''جسارت''، ''نوائے وقت'' اور پندرہ روزہ ''وقت'' سے منسلک رہے۔ جب روزنامہ ''جسارت'' سے وابستہ تھے تو کچھ عرصہ کے لیے اس کے ادبی صفحہ کے انچارج بھی رہے جس کے دوران انھوں نے بڑی بڑی ادبی شخصیات کے خاکے لکھے اور بعض کے انٹرویو کیے۔ ان کے خاکے اور انٹرویوز اپنے انوکھے انداز کی وجہ سے بہت پسند کیے گئے۔ احمد فواد کراچی کے کثیر الاشاعت اخبار روزنامہ ''اُمت'' میں ایک عرصہ تک کالم لکھتے رہے۔ انھوں نے ایک ناول بھی لکھا ہے۔

احمد فواد کی تین کتابیں ''یہ کوئی کتاب نہیں''، ''دل ورق ورق تیرا'' اور ''ایک جانب چاندنی'' اُردو میں جب کہ ایک شعری مجموعہ ''کہ تہ راغلے زہ بہ گل شم'' پشتو زبان میں زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکا ہے۔ سوات میں جب شورش برپا تھی تو ان حالات سے متاثر ہو کر انھوں نے ایک طویل نظم ''سوات زخموں سے نڈھال'' لکھی جسے قومی اور عالمی سطح پر خاصی پذیرائی حاصل ہوئی۔ آپ جہان زیب کالج سیدوشریف کے انگلش ڈیپارٹمنٹ میں بہ طور چیئرمین خدمات انجام دیتے رہے ہیں۔ اس وقت آپ گورنمنٹ کالج مٹہ (سوات) میں انگریزی پڑھاتے ہیں۔

☆......☆......☆